ترتیب : اجمل کمال

منوج داس ضمیرالدین احمد نیّر مسعود
اکرام اللہ خالدہ حسین نکانور پارا
افتخار جالب اوسپ ماندلستام
افضال احمد سید عذرا عباس بیری پین
ذی شان ساحل گریگور فان ریزوری

آج کی کتاب

Scanned with CamScanner

آج
ستمبر ۱۹۹۱

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ناؤن شپ کراچی ۳۶

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابی حسن پرنٹنگ پریس
باکی اسٹیڈیم کراچی

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائداعظم لاہور

ترتیب

۷
منوج داس
جنگل میں

۱۴
ضمیرالدین احمد
گنگا سے گنگا تک

۳۹
نیّر مسعود
جانوس

۴۹
اکرام اللہ
کتنا پانی

rekhta

Scanned with CamScanner

خالدہ حسین

پاسپورٹ

۱۰۳

نکانور پارا

قاری کو انتباہ
یاترا
بچپن کی یادیں آخری جام صحت
افراط زر راز و نیاز
ایمرجنسی کی نفلسی
آدمی
نظم نظم نظم نظم
صلیب تجویزیں تالم
میں اپنے سب قول واپس لیتا ہوں

۱۲۳

افتخار جالب

تمہاری نگاہوں کے اوجھل میں
کچرے کے ڈھیر پر
ننگے خلاؤں کے اٹینوں کی وسعتوں میں
بصراد کے فوکس میں
بہت سجل ہیں، بیلیرینا ایسے
میرے کو رات نیند نہیں آئی

اوسپ ماندلستام

جسے گھوڑے کی نعل ملتی ہے
ماندلستام اسٹریٹ
نظم نظم نظم نظم

۱۳۹

افضال احمد سید

عظیم ناموں سے ابتدا
صرف غیراہم شاعر
مجھے ایک کہانی سناؤ
فوجی ورجل کی زمیں چھین لیتے ہیں

۱۴۴

عذرا عباس

چوہے کو کیسے مارا گیا
ایک نظم آتی ہے

۱۴۹

بیری پین

شجرالموت

Scanned with CamScanner

۱۷۳
ذی شان ساحل
قسطنطنیہ کا زوال

انتخاب

۱۹۱
گریگور فان ریزوری
اسکشنو

اس شمارے میں شامل اسکیچ بنگلادیش کے ممتاز مصور قمرالحسن کے بنائے ہوئے ہیں۔

منوج داس

انگریزی سے ترجمہ : اسد محمد خاں

جنگل میں

مسز متی نے سنا، دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ کتنی ہی دستکوں کے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ بہت نرمی سے، کتنی کتنی منت کا وقفہ دے کر دروازہ تھپ تھپایا جا رہا تھا۔

اصل میں یہ چوکی دار کی مجبوری تھی۔ وہ اس کے برخلاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے پتا تھا۔

مسز متی نے نظروں ہی نظروں میں ہال کا جائزہ لیا۔ اس کے پیروں میں راجا صاحب پڑا تھا، جیسے ڈھے جانے پر فحش مٹی کا ڈھیر۔ چھ آٹھ مکھیاں راجا کے سوجے ہوئے ہونٹوں کی دراڑ میں پک نک منا رہی تھیں۔ ایک طرف اکڑباز چکودی صاحب، جو عام حالات میں بڑا معزز بنتا تھا، یوں پڑا خراٹے لے رہا تھا جیسے سؤر خرخراتا ہے۔

متی صاحب اور چکودی کی بیوی ایک دوسرے کی طرف رخ کیے فرش پر پڑے تھے؛ شاید ایک دوسرے کے لیے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اتفاقیہ سو گئے ہوں گے۔

پھر ایک بار دستک ہوئی۔ مسز متی ایک درجہ اور بیدار ہو گئی۔ آواز نے یادداشت پر چھائی ہوئی کاہلی کے بےڈھنگے تودے سے ایک ٹکڑا اور کاٹ کے پھینک دیا۔ وہ سب لوگ اتنی گہری نیند میں کب جا پڑے تھے، ظاہر ہے اِس وقت اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ ویسے جو جو کچھ ہوتا رہا تھا ذرا سی کوشش سے سبھی یاد آتا جا رہا تھا۔ آگ کے گرد ان کا ناچنا، اور سؤر کے مردہ جسم سے (جسے انھوں نے آدھا زندہ ہی آگ پر ڈال دیا تھا) پارچے کاٹ کاٹ کر کھانا اسے یاد تھا۔

وہ لوگ چاہتے تھے کہ ایک رات عہدِ قدیم کے وحشیوں کی طرح گزاری جائے؛ بےطرح ٹھونستے، نگلتے، بلانوشی اور خرمستیاں کرتے لاکھوں برس پہلے کے آدمی کی طرح۔ شراب نوشی سے پہلے چکودی صاحب نے، جو خود کو اِن معاملات میں سند سمجھتا تھا، اپنے اس فلسفے پر لیکچر دیا تھا کہ عہدِ وحشت کو کبھی کبھی لوٹ کر آنے دیا جائے کیوں کہ گاہے گاہے جوش و ہیجان کا یہ اُبال آدمی کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس طولانی لیکچر کی کسی کو ضرورت نہیں تھی، مگر چکودی باز نہ آیا؛ اس نے بہرحال تقریر جھاڑ دی۔

ایک بار اور دستک ہوئی۔

جو کچھ ہو چکا تھا تیزی سے مسز متی کو سب یاد آ گیا۔

ایک دن پہلے، سہ پہر کے وقت، جنگل کے بیچوں بیچ ایک اُجاڑ بنگلے تک پہنچنے کے لیے ان کی جیپ میلوں تک جھاڑیوں اور بکھری ہوئی چٹانوں کے درمیان بہت مشکل سے رستا تلاش کر رہی تھی۔ ایک زخمی تتلی جیپ کے پہیوں کی لپیٹ میں آ گئی اور مسز متی نے چیخ ماری۔ دردمندی اس کے چہرے پر مکھی کی طرح چپڑی ہوئی تھی۔

"تم بڑی نرم دل ہو بے بی۔" چکودی صاحب ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر جھڑبیری کی طرح اگی ہوئی مونچھ مسز متی کے چہرے کے اس قدر قریب پہنچ گئی کہ لگتا تھا دردمندی کا سارا ہی مکھی چاٹ لے گی۔

چکودی کی بیوی نے یہ سب دیکھا اور ایسے ناک سکوڑی جیسے کسی بدبو سے بچنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، وہ سُوں سُوں کرنے لگی؛ پھر ایک ایک سلیبل پر جھٹکا دیتے ہوئے بولی، "ہاں نا! متی صاحب جیسے بھیڑیے کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ زیادہ ہی نرم ہے۔"

ہمیشہ کی طرح اس کی بات سننے میں بےضرر تھی، مگر ہمیشہ کی طرح جب وہ بات کہہ چکی تو یوں لگا جیسے چکودی کی بیوی گردوپیش میں کوئی بیماری چھوڑ کر بیٹی ہے۔

متی صاحب کا سگار گھوم کر اس کے دہانے کے گوشے میں پہنچ گیا اور دانتوں کی گرفت میں جھک گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ بےتکان بولنا شروع کرے گا۔ تقریر کے دوران وقفے وقفے سے وہ سامعین کو بےاعتباری سے دیکھتا بھی جائے گا کہ آب جو وہ دانش کے موتی رول رہا ہے تو کتنوں کی جھولی بھر سکی ہے، کتنوں کی خالی ہے۔

متی کہنے لگا، "سچ پوچھیے تو چکودی صاحب، عورت ایک ایسی مسٹری ہے جسے میں آج تک حل نہیں کر سکا۔۔۔ پَر ایک بات کہوں گا، کہ یہ جو مسز متی کہلاتی ہیں ان میں کوئی سمجھ نہ آنے والی بات ایسی ضرور ہے جو میں شادی کے اتنے برس بعد بھی الجھا ہوا ہوں۔ قسم سے، دشمن کی جان لینے سے زیادہ مزا ہے میری اس چاہت میں۔"

"اچھا چپ کرو! راکشس کہیں کے!" مسز متی چہرے پر رومال اور رومال پر چہرہ جھلتے ہوئے جیسے احتجاج کرنے لگی۔

اسی طرح اور کچھ دیر مسز متی نازک مزاجی دکھاتی رہی، اور چکودی کی بیوی کی جھلسن اور بیزاری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جیپ گھوم کر ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں بائیں ہاتھ پر ایک نصف دائرہ میدان سا تھا۔ تین طرف سے یہ میدان پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔

یہاں مسز متی نے اچانک شوفر کو حکم دیا، "روکو!" جیپ جھٹکے سے رک گئی۔ سب کود کر باہر آ گئے اور مسز متی کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھنے لگے۔ وہ تلوار کی طرح اپنا ہاتھ سونتے، پہاڑی کے دامن میں کھڑے ہوئے ایک اکیلے ہرن کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سب نے آنکھیں گڑا کر دیکھا۔ تاریک چمکیلی چٹانوں کے مقابل بجلی کے ٹھہرے ہوئے

لشکارے کی طرح یہ ہرن جیسے اس منظر میں جم کر رہ گیا تھا۔

لمحے بھر بعد وہ ہلا۔ جیپ کی وجہ سے اس کا جنگل میں گھسنے کا رستا بند تھا۔ اس لیے وہ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی پر چھلانگیں مارنے لگا۔

چکودی کی بیوی کے سوا سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ اور مسز چکودی کی آنکھیں! وہ اس وقت آنکھیں نہیں تھیں، بندوق کی نال سے نکلی ہوئی دو گولیاں تھیں جو ہوا میں آگ لگاتی چلی جا رہی تھیں۔

اچانک ہرن نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا۔ وہ ان لوگوں کے قریب سے زقندیں بھرتا، جنگل میں داخل ہو گیا۔ شوفر شیامل کی بندوق کی نال اس وقت جیسے ہرن کی چھاتی پر جا ٹکی تھی۔

"شُوٹ کرو!" مسز متی چیخی۔

شیامل نے گولی نہیں چلائی۔ اس نے بندوق کی نال زمین کی طرف جھکا دی، اور ہرن کو سنہری خنجر کی طرح گھنے سرسبز میں داخل ہو جانے دیا۔

آنکھوں کی پانچ جوڑیاں شیامل کے لیے اچانک زہر کی دس پچکاریاں بن گئیں۔

جواب میں شیامل بولا، "وہ گابھن تھی صاحب، بچہ تھا پیٹ میں۔"

مایوسی اور غصّے میں مسز متی کی آواز ایک دم گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل اتنا کہا، "بدتمیز! ایسی بےہودہ بات کہنے کی ہمّت کیسے کی تو نے؟" لگتا تھا مسز متی رو پڑے گی۔

چکودی نے تسلّی دی، "نا نا نا، طبیعت پر بار مت ڈالو میڈم! میں اب کے ایسا کچھ کر دوں گا کہ اگلا چانس تمہارا ہی ہو گا۔ بندوق گود میں رکھ کے بیٹھنا۔ ہاں؟"

مسز متی اب شوفر شیامل کے برابر آ بیٹھی۔ بدتمیز آدمی! صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کے جذبات کا اسے ذرّہ برابر بھی خیال نہیں ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ لفنگا اپنے مالک راجا صاحب کا سوتیلا بھائی تھا۔ شیامل شوفر، سورگیہ بڑے راجاجی کے بےشمار ناجائز بچّوں میں سے ایک تھا۔ اگرچہ مرتبے کے اعتبار سے بہت نچلے درجے کی ناجائز اولاد تھا، کیوں کہ اُس کی ماں ریگولرائز نہ ہو سکی تھی۔ اُسے کل وقتی کنیز کا درجہ ہی نہ مل سکا۔

شیامل، افسردہ سا آدمی، بعضوں کی نظر میں دل کش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ بڑا ماہر شکاری تھا۔ سورگیہ بڑے راجاجی کا شاہی ناک نقشہ اُسے ورثے میں ملا تھا۔ جب کہ راجا صاحب پیٹ بھر کے بدصورت تھے۔ رہی سہی کسر ان کی بےلگام عیّاشیوں نے پوری کر دی تھی؛ زندگی کا سارا رنگ، سبھی رس چوس لیا تھا۔ بقول کسے اب تو نصیب میں ٹھنڈی گرمیاں ہی رہ گئی تھیں۔ عورتوں کے گرد منڈلانے، انھیں سُونگھتے پھرنے، ان سے بھڑ کر اُٹھ بیٹھ لینے سے راجا صاحب کی تسلّی ہو جاتی تھی۔

بس اِتنے ہی کے لیے راجا صاحب نے یہ جنگل میں منگل ترتیب دیا تھا اور اپنا تقریباً متروک بنگلا کہیں سے جھاڑپونچھ کے نکالا تھا۔

باقی رستے شیامل خاموش بیٹھا رہا۔ راجا صاحب کی مسلسل بک بک کا ذرا بھی جو اس نے اثر لیا ہو۔

وہ لوگ — پہر میں دیر سے بنگلے پر پہنچے۔ ہلکے ناشتے اور بوتل سے شغل کے بعد انھوں نے شکار کے لیے نکلنے کی تیّاری کی، مگر شیامل نے جانے سے انکار کر دیا۔ راجا صاحب کچھ دیر تک دہاڑتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اور کیوں‌کہ اچھا بھلا ہرن کھو دینے پر مسز متی کی نازک مزاجی کو دھچکا پہنچا تھا، اس لیے ظاہر ہے اس نے کہا کہ وہ بھی شکار پر نہیں جائے گی۔

چکودی کی بیوی نے مسز متی کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا، مگر بلا سے دیکھا کرے۔ مسز متی جانتی تھی کہ اس عورت کو متی صاحب کے ساتھ لگ کر جانے کا بہترین موقع ملا ہے! وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔ اُس کا میاں آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا، مگر وہ پروا کب کرتی تھی۔ چکودی صاحب تو اس لائق بھی نہیں تھا کہ تالی بجا کر مرغے مرغی کو بِدکا دے۔

مسز متی اور شیامل کو بنگلے میں اکیلا چھوڑ کر بےبسی سے کندھے اُچکاتی ہوئی، باقی پارٹی اندر جنگل میں گھس گئی۔

باقی رہ جانے والا سنّاٹا، جسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد نامانوس آوازیں درہم برہم کر رہی تھیں، دشت کے جُھٹ پُٹے میں مسز متی کے لیے ایک آسیبی تجربہ بنتا جا رہا تھا۔ اس نے بَولا کر ایک اور گلاس بنایا اور چڑھا لیا، اکیلے ہی۔

اُس وقت جیسے ایک دم مسز متی کو محسوس ہوا کہ شیامل کی یہ ضدّی اداسی اور خاموشی خود اس کے لیے چیلنج ہے۔

اس نے پوچھا، "شیامل، یہ کیا آواز ہے؟"

"شیر کی دہاڑ ہے میڈم۔"

برآمدے میں بچھی کرسی سے چھلانگ لگا کر مسز متی ہال کی طرف دوڑی، اور بڑبڑاہٹ میں دروازے پر ہی گر گئی۔ اُس وقت تک اس نے اٹھنے کی کوشش نہ کی جب تک کہ شیامل اٹھانے نہ پہنچ گیا۔ اور جب وہ پہنچا تو بس اِتنا اٹھی کہ اُس کے بازوؤں میں ڈھیر ہو سکے۔

پھر اپنے اس مصنوعی حادثے کے بارے میں ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ خیرہ کُن مسکراہٹ کے ساتھ بولی، "بڑے ماہر شکاری ہو۔ کیسی آسانی سے شکار گرا لیتے ہو۔"

شیامل کا دل اُس بچے کی طرح کھیل میں لگ گیا جسے کوئی سینئر ہم جولی مزے مزے کے کھیل سکھا رہا ہو۔

باقی وقت اس نے فرماں‌برداروں کی طرح گزار دیا مگر آخر تک اپنے لفنگے چہرے سے ایک رازدارانہ سی طنزیہ مسکراہٹ نہ ہٹائی، اور اسی مسکراہٹ نے مسز متی کی جیت کی ساری خوشی مٹّی کر دی۔ جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی توہین ہوئی ہے۔ اُس کمینے کی طرف سے یہ دُہرا چیلنج تھا۔

راجا صاحب اور پارٹی واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ مسز متی تھک کر سوئی تھی، اور گھنٹے بھر بعد اب جب اٹھی تھی تو اسے بخار سا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ جیسے ہی اس کی نظر چکودی کی بیوی پر پڑی، وہ سمجھ گئی کہ یہ عورت بہت سی باتیں قیاس کر کے بیٹھی ہے، جبھی اس کی آنکھیں شیامل پر ٹِکی ہوئی ہیں۔ شیامل ہال کے ایک کونے میں پڑا گہری نیند سو رہا تھا، اور مسز چکودی آنکھیں گڑائے اسے برابر گھورے جا رہی تھی۔ اس کی بھیانک آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے ساتھ کی گئی اس دغابازی کو کس شدّت سے محسوس کر رہی ہے۔

متی صاحب آتے ہی کہنے لگا، "ڈارلنگ! مسز چکودی کو سارے وقت یہی فکر ستاتی رہی کہ تمھیں اکیلا چھوڑ آئے ہیں--- کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی--- ایں؟"

مسز متی ابھی تک چکرائی ہوئی تھی، مگر اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ چکودی کی عورت کا شبہ دور کرنا ضروری ہے! ساتھ ہی اس سوتے ہوئے منحوس شیامل کی طنزیہ مسکراہٹ بھی مٹانا ہے۔ ان بشلیپی کی حد تک احسان فراموش ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ صاف پڑھی جا رہی تھی۔

چناں‌چہ وہ پھٹ پڑی۔ مسٹر متی کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر وہ اسے کھینچتی ہوئی ہال میں لے آئی۔ "تمھیں خبر ہے؟ خبر ہے اِس--- اِس وحشی نے میرے--- مجھے--- میں نے بھی اسے وہ جوتے لگائے ہیں--- اچھی ٹھکائی کی ہے حرام زا---"

"کیا؟ کیا اس شیامل نے---؟"

"ہاں--- ہاں جی! ایسا بھنگر--- او ماں! کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا حرامی نکلے گا یہ۔"

کچھ دیر تک ایک بھاری بےڈھب سنّاٹا طاری رہا۔ راجا صاحب، جو ہمیشہ سے اپنے اس شوفر سے ایک نامعلوم سی کَد رکھتا تھا، سوتے ہوئے شیامل کی طرف طیش کے عالم میں پیر پٹکتا ہوا بڑھا؛ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ راجا صاحب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اتنی دیر میں پسینے میں تر ہو چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اندھیرے میں چکودی صاحب اور متی صاحب اکڑی ہوئی لاشوں کی طرح بےحرکت تھے۔ لگتا تھا دو لٹھے فرش میں گڑے ہوئے ہیں۔ یہ ساکت منظر ایک لمحے بعد اچانک مسز چکودی کی سسکیوں سے درہم برہم ہو گیا۔ وہ سِسکتی ہوئی جَھپٹی اور نہایت غصّے میں

اس نے شیامل کو ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔

شیامل پڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، مگر اس کی حیرت اور سراسیمگی عارضی تھی۔ مسز متی کے سوا، سب کے سب چکودی کی بیوی کی پیروی میں اس پر پل پڑے۔ اس پر اتنی وحشت سے لاتیں اور گھونسے برسائے گئے کہ وہ بےہوش ہو گیا۔ اس وقت تک مسز متی کی ہسٹیریائی ہنسی بتدریج بڑھتی ہوئی سب سے اونچے سُر پر پہنچ گئی تھی۔

وہ شیامل کو کھینچ کر اس چھوٹے سے کمرے میں پھینک آئے جہاں انہوں نے ابھی ابھی ایک نیم مُردہ سؤر ڈالا تھا۔

اس کے بعد وہ ہانپتے ہوئے، صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔

چوکی دار سے کہہ دیا گیا کہ اب جائے۔ اسے یہاں صبح سویرے آنا ہو گا۔ پھر دروازوں کی چٹخنیاں چڑھا دی گئیں۔ وہ سب کے سب اونچی دیواروں والے کچی کارڈی میں نکل آئے، جہاں انہوں نے الاؤ جلایا اور دائرے میں بیٹھ کر پینے پلانے لگے۔ بعد میں کسی وقت وہ اندر سے اپنا شکار کیا ہوا سؤر کھینچ لائے، اسے آگ پر ڈال دیا۔ پھر پارچے کاٹ کاٹ کر وہ لوگ آدھی کچی آدھی پکی بوٹیاں کھاتے، ناچتے اور گاتے رہے۔

رات میں دیر تک یہ جشن جاری رہا۔

ایک بار پھر دستک ہوئی۔ مسز متی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، ابھی اندھیرا تھا۔

اور تب، خبر نہیں کہاں سے، خوف و دہشت کی ٹھنڈک اس کے وجود میں اترتی چلی گئی، پسینے ہی کو اس کے روم روم سے خارج ہونے لگی۔

اس نے آوازیں دے دے کر سب کو اٹھا دیا۔ چوکی دار نے اس کی آواز سنی لی اور دستک دینی بند کر دی۔

سب سے پہلے بات کرنے والا راجا صاحب تھا۔ "ہیلو! سب لوگ کو گڈ مارننگ! کچھ چائے وائے کا بندوبست کیا جائے، آں؟... ذرا دیکھوں اس سالے شیامل کا کیا حال ہے۔"

راجا صاحب اس چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں شیامل کو پھینکا گیا تھا۔

"نہیں!... پلیز نہیں!" مسز متی چیخنے لگی۔ اس نے راجا صاحب کو کمرے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

راجا صاحب حیرت میں بکلانے لگا، "مم... مگر کیوں؟"

مسز متی کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ بولی، "فرض کرو اس کمرے میں تمہیں سؤر پڑا ہوا ملے، شیامل کی بجائے؟"

"مگر ہم نے سؤر تو بھون کے کھا لیا تھا پچھلی رات! کھا لیا تھا نا؟"

"فرض کرو تمہیں اندر سؤر ملے، شیامل کی بجائے؟"

"لیکن ہم نے تو... کیوں بھئی؟... سؤر تو کھا لیا تھا نا؟"

"فرض کرو سؤر ملے، شیامل کی بجائے؟"

وہ سب کافی دیر تک خاموش رہے۔

کسی نے کہا، "کچی کارڈی میں جا کے تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ سؤر کا کافی حصہ اُدھر پڑا ہونا چاہیے۔"

"فر گاڈز سیک! کچی کارڈی میں مت جانا،" مسز متی اور مسز چکودی ایک ساتھ چیخنے لگیں، " اگر وہاں سؤر کی ہڈیاں نہ پڑی ہوئیں... تو؟"

سناٹا اُدبدا کر لوٹ آیا۔ بنگلے کے عقب میں سیار بولنے لگے۔ ان پانچوں میں سے ہر ایک کسی دوسرے کو لرزتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد جب متی صاحب چیپ چلا رہا تھا اور باقی لوگ ریت بھرے تھیلوں کی طرح بےجان بیٹھے تھے، راجا صاحب کوشش کر کے ہنسا۔ کہنے لگا، "مسز متی، تمہاری کلپنا یا شاید خواب بھی کیسا فنتاسٹک تھا... بھئی جو بھی ہو ماننا پڑے گا... تم نے تو سبھی کا خوں خشک کر دیا تھا... اورجنل ہو آپ بھی؟"

مسز متی یا کسی اور کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو راجا صاحب پھر بولا۔ کہنے لگا، "ویسے تو میں نے چوکی دار کو سمجھا دیا ہے۔ پہلے بھی یہ آدمی میرے بہت سے مشکل کام کر چکا ہے۔ میں نے سمجھا دیا ہے، وہ سب بندوبست کر دے گا... مطلب ہے اگر واقعی پچھلی رات ہم لوگوں سے کوئی... کوئی کنفیوژن ہو گیا ہے تو وہ سنبھال... ویسے، ہا ہا... مسز متی بلاوجہ ہی ڈر رہی تھیں، جیسے لوگ بھوت پریت کو بلاوجہ ہی سپوز کر لیتے ہیں۔"

"کسے یقین نہیں تھا صاحب،" چکودی صاحب اور متی صاحب دونوں بولے، "رات تو سبھی کو پکا یقین تھا... یہ صفا حماقت تھی جو ہم نے کمرہ نہیں کھولا، یا کچی کارڈی میں نہیں گئے۔"

راجا صاحب کہنے لگا، "بھئی کہہ نہیں سکتے کہ بھوت وُوت صرف وہم ہوتا ہے یا کوئی اصلیت بھی ہوتی ہے... بنگلے کے لیے تو اَڑا رکھا ہے لوگوں نے کہ وہاں کوئی اثر وثر ہے... سنا ہے بھوت پریت شر قسم کی بدمعاشیاں کرتے ہیں۔ کیا لگے ہم سب کی کھوپڑی پھرا دی ہو، اُلو بنا دیا ہو، کچھ کا کچھ دکھا دیا ہو سب کو... ہا ہا۔" راجا صاحب کوشش کر کے پھر ہنسا۔

اچانک مسز متی سسکیاں بھرنے لگی اور چکودی کی عورت نے ہسٹیریا کی مریضہ کی طرح ہنسنا شروع کر دیا۔ باقی تینوں آدمی جیسے پھر ریت کی بوریاں ہی گئے۔

عورتوں کی سسکیاں اور قہقہے بےرحمی سے کچلتی ہوئی اور غراتی ہوئی ان کی جیپ چلتی رہی، جھاڑیوں اور بکھرے ہوئے پتھروں کے درمیان راستا بناتی ہوئی، چلتی رہی۔

Scanned with CamScanner

ضمیر الدین احمد

گنگا سے گنگا تک

(ایک نامکمل ناول کا پہلا باب)

"یہ جگہ دیکھ رہے ہو، ساجد میاں؟"

ساجد کی نظریں اُدھر مڑ گئیں جدھر ادّا میاں کے ہاتھ نے اشارہ کیا تھا۔ ایک کھلا میدان، جس کے دائیں بائیں فوجی بارکیں ترچھی قطاریں باندھے کھڑی تھیں اور جو کسی چوڑے، بھاری سینے، پتلی کمر اور چوڑے، بھاری کولھوں والی عورت کے جسم کی مانند ان بارکوں کے بیچ میں سے سمٹتا سکڑتا گزر کر پیچھے کی جانب پھر پھیل گیا تھا۔

"یہاں قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔"

"کون سے قیدی؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہو ساجد میاں!" وہ تانگے کے اگلے حصے میں شبراتی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو گھوڑے کو رہ رہ کر بلاوجہ تکتکا رہا تھا۔ انھوں نے پہلو بدل کر منہ ساجد کی طرف کیا۔ "وہی۔ تمھارے پاکستانی۔ کیا کہتے ہیں انھیں۔ پرزنروار قیدی۔ اور کون؟"

تانگے کا پہیا کسی پتھر پر یا کسی گڈھے میں آ گیا۔ ساجد اچھلا اور اس کا سر تانگے کی چھت سے ٹکرایا جس کا فریم لوہے کا تھا۔ اس کے منہ سے اضطراری طور پر "سی" نکل گئی۔

شبراتی نے گھوڑے کے چابک رسید کیا اور پھر ساجد سے اپنے انداز میں معذرت خواہ ہوا۔ "چوٹ تو نہیں آئی میاں؟"

"نہیں!" ساجد ابھی تک سر سہلا رہا تھا۔ "بات یہ ہے شبراتی کہ اب تانگے میں بیٹھنے کی عادت نہیں رہی۔ اس میں تو سواری کو ہر وقت چوکس رہنا چاہیے۔ رستا اوبڑکھابڑ ہو تو اور بھی۔"

"سو تو ہے میاں!" شبراتی نے ان سے نظریں ملائے بغیر ادّا میاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپن نے تو کہا تھا ٹیشن والے رستے چلو۔"

"ابے بند کرتا ہے اپنا بھونپو کہ لگاؤں ایک؟" اور ادّا میاں نے چپت رسید کرنے کے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ اٹھا بھی لیا۔ "ابے سڑک کوں سی خراب ہے؟ آ گیا ہو گا کسی پتھر وتھر پر پہیا۔"

خالی ہاتھ سے اپنے سر کی، جس پر ایک میلی چیکٹ ٹوپی منڈھی ہوئی تھی، ایسے اڑ کر کے جیسے ادّا میاں سچ مچ اس کے چپت لگایا چاہتے ہوں، شبراتی کھی کھی ہنسا۔

ادّا میاں نے مڑ کر شاہد کی طرف دیکھا جو پیچھے ساجد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اور آنکھ مار کر مسکرائے۔ شاہد نے ان کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا، گویا انھیں یقین دلا رہا ہو کہ اسے ان کا یہ بزرگانہ مسخراپن بھلا لگا ہے۔

اچانک ساجد کی سمجھ میں آیا کہ ادّا میاں نے اس راستے فرخ آباد جانے پر کیوں اصرار کیا تھا۔ مجھے یہ پھیلتا، سکڑتا اور پھر پھیلتا میدان دکھا کر میرا امتحان لینا چاہتے تھے۔

"آپ کے سر کی قسم ادا میاں! مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ پاکستان کے جنگی قیدی یہاں بھی رکھے گئے تھے۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ کوئی ایک لاکھ نے ہتھیار ڈالے تھے۔"

"سنا تُو نے شبراتی؟ ساجد میاں کہتے ہیں انھیں بالکل پتا نہیں تھا، اور قسم بھی کھائی تو میرے سر کی! دنیاجہان کی باتیں انھیں معلوم رہتی ہیں، پر یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے فوجی یہاں بھی مہمان رہے تھے۔ ان کے اپنے فتح گڑھ میں!" ادّا میاں کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں ساجد کی بات کو سچ ماننے میں دقت پیش آ رہی ہے۔

تانگا اُلار ہو رہا تھا۔ شبراتی کھسک کر بم پر آ گیا۔ "ہجاروں میل دور میاں کو ادھر کی ساری خبری تھوڑی ملتی ہوں گی۔ ہے نا میاں؟"

"ہاں!"

اسی وقت دو تصویریں منہ پونچھتی، بال جھٹکتی، کپڑے جھاڑتی اس کی یادوں کے تہ خانے سے نکلیں، اور ساجد کو گویا ادّا میاں کے شک اور طنز کا جواب مل گیا۔

"واقعی ادّا میاں! مجھے بالکل نہیں معلوم تھا۔ شاید اس لیے کہ اُن دنوں میں خبروں اور اخبار وغیرہ سے دور ہی رہتا تھا۔ بس کبھی کبھار ٹی وی پر خبریں سن لیتا تھا۔ اور یہ خبر میں نے ٹی وی پر ہرگز نہیں سنی۔"

ادّا میاں چپ رہے۔

"ایک دن دیکھا -- یہ ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد کی بات ہے -- کہ ایک سڑک کے دونوں طرف بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ جیسے لوگ باگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سے پاکستانی فوجی ریلے کی طرح گزر رہے ہیں، اور ایک ہندوستانی فوجی کسی چیز سے -- کپڑے کی کسی چیز سے -- شاید کسی فوجی ٹوپی سے ہر گزرتے ہوئے فوجی کو مار رہا ہے۔ اور ٹی وی پر یہ بھی دیکھا -- شاید اسی دن -- کہ ایک فوجی افسر، ہندوستان کا کوئی فوجی افسر، کسی ٹینک یا کسی فوجی گاڑی پر کھڑا چلا چلا کر پاکستانی فوجیوں کو گالی دے رہا ہے۔ یو باسٹرڈ پاکستانیز!"

شبراتی نے بےزبان جانور کی پیٹھ پر ایک چابک جڑ دیا۔ بلاوجہ۔

Scanned with CamScanner

"باسٹرڈ انگریزی میں۔۔۔"

اڈا میاں نے ساجد کی بات کاٹ دی۔ "اتنی انگریزی تو ہمیں بھی آتی ہے ساجد میاں! بُوباسٹر حرامی کو کہتے ہیں۔ نطفئے ناتحقیق کو۔"

انھوں نے کنکھیوں سے شاہد کو دیکھا۔ شاہد پھر مسکرایا۔ اڈا میاں خوش نظر آئے۔

"میں تو اُن دنوں اِدھر سے گزرنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ پر سنا ہے ایسی گالیاں تو یہاں اِن پر روز پڑا کرتی تھیں!"

دو ہفتے میں ایک آدھ پھیرا فرخ آباد کا اس رستے بھی ہوتی جاتا تھا،" شبراتی چتکبرے گھوڑے کی کلغی سے مخاطب ہوا۔ "سواریاں اچھی خاصی چپ چاپ بیٹھی ہیں، یا آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔ پر قیدیوں کا کیمپ آیا نہیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، چوکھٹے اِدھر کر، دو ایک گالیاں سنا ڈالیں۔ چاہے آواج وہاں تک پہنچتی بھی نہ ہو۔ اور گالیاں بھی کیسی!" اس نے مڑ کر ساجد کو دیکھا، مگر کوئی نمونہ پیش نہیں کیا۔ "بڑی گندی گالیاں دیتے تھے جی! اپی کے تو کان جلنے لگتے تھے۔ اور اِدھر سے آئے ہوئے تو اپنی جبان میں گالیاں بکتے تھے۔ ماں دی۔۔ بھین دی۔۔"

"اپنی گالی اپنی زبانی میں مزا دیتی ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ جسے دی جائے اس کی زبان بھی وہی ہو!" اڈا میاں شبراتی کو گالی دینے اور گالی کھانے کا یہ نکتہ سمجھانے کے بعد ساجد سے مخاطب ہوئے۔ "تمھاری انگریزی ویسے چاہے کتنی بڑھیا زبان ہو، پر گالیوں کی زبان ایک دم نہیں۔ بلاڈی فول۔ بُوباسٹر!" وہ رکے، مگر انھیں انگریزی کی کوئی اور گالی یا تو یاد نہیں آئی یا یاد نہیں تھی۔ "یہ بھی کوئی گالیاں ہوئیں! اس سے بڑی گالیاں تو مَیں پیار سے شبراتی کو اپنی اردو میں دیتا ہوں۔" انھوں نے شبراتی سے تصدیق چاہی۔ "کیوں بے؟ دیتا ہوں کہ نہیں؟"

شبراتی نے مسکرا کر فخریہ سر ہلایا۔ "ہووہو!"

"اُلو کا پٹھا۔ تخم حرام۔ حرامی مُوت۔ گدھے کا بچہ!" مثالیں پیش کرتے کرتے اڈا میاں کو کچھ یاد آ گیا۔ "کیوں بے شبراتی! تجھے وہ دن یاد ہے جب گالی بکنے پر خیراتی کو اندر کر دیا گیا تھا؟" اور اس سے پہلے کہ شبراتی جواب دے، انھوں نے کہا، "نہیں تجھے کہاں یاد ہو گا۔ تُو تو بہت چھوٹا رہا ہوگا اس وقت!"

مگر شبراتی نے بڑے اعتماد سے کہا، "مجھے اچھی طریوں یاد ہے۔"

"اچھی طریوں یاد ہے تو بتا۔۔۔" اڈا میاں کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"چھوٹا تھا۔ پر اتّا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ دس سے اوپر کا تھا۔ مجھے اچھی طریوں یاد ہے۔ اماں کا رو رو کے بُرا حال ہو گیا تھا۔" شبراتی کو سب کچھ یاد تھا۔ اسے یاد تھا کہ اُس دن سارے قصبے میں اس کے ابا کی بات ہو رہی تھی۔ اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب اس کے ابا حوالات سے چھُٹے تھے تو دیوان جی نے انھیں دو ایک موٹی موٹی گالیاں دے کر -- "اور ان

کے چوتڑوں پر اپنا موٹا ڈنڈا برسا کر" -- کہا تھا، "شکر کر کہ دروغہ جی اتنے رحمدل ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو غداری کے جرم میں دھروا دیتا۔"

"لیکن ہوا کیا تھا؟"

اور اس سے پہلے کہ شبراتی یا اڈا میاں منھ کھولیں، ساجد نے شاہد کے سوال کا جواب دیا۔ "لڑائی کا زمانہ تھا۔ خیراتی -- شبراتی کے والد -- ترنگ میں رہے ہوں گے۔ کوئی سواری لے کر کچہری جا رہے تھے۔ گھوڑا مَریَل تھا۔ تانگا رینگ رینگ کے چل رہا تھا۔ عین کوتوالی کے سامنے انھیں غصہ آ گیا۔ بولے، ابے سالے! یہ کیا انگریزوں کی چال چل رہا ہے۔ ہٹلر کی چال چل! بس، دھر لیے گئے۔"

"کمال ہے!" شبراتی نے سچ مچ حیران ہو کر کہا۔ "ساجد میاں کو بھی یاد ہے!"

ساجد نے کہا۔ "اچھی طریوں!"

ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر درخت، باغ، کھیت، کچے گھروندے، پکے مکان، تار، کھمبے۔ ٹمٹماتی روشنیاں رقص کرتی ہوئی پاس آ رہی تھیں، دور جا رہی تھیں۔ دھندلے شیشے میں سے ٹھٹھری ہوئی چاندنی اور ٹھٹھری نظر آ رہی تھی۔ فراق حسن جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن۔ وہ ٹرین کو کچھ دیر آنسوؤں کے کفن، کی گت پر چلانے کی کوشش کرتا رہا، مگر پہیوں نے اس کا کہنا نہ مانا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ تمھارے سکڑ دادا کی قبر ہے۔"

کالی پکی سڑک کے اُس طرف حویلی کی چاردیواری اور اس کا بلند چوبی دروازہ، اور اِس طرف قبرستان، جس کے بیچوں بیچ املی کا ایک بوڑھا درخت، جس کی شاخیں کئی قبروں پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اور ان میں سے سب سے نمایاں اور اونچی ایک پکی قبر جس کے گچ پر کائی جمی ہوئی تھی اور جس کا تعویذ زمین سے کم از کم تین فٹ بلند تھا۔

"سکڑ دادا کتنے نمبر پہلے آتے ہیں؟"

ساجد نے جلدی سے حساب لگایا۔ "تمھارے دادا کے دادا۔ ان سے شروع کریں تو تم چھٹے نمبر پر آتے ہو۔"

"سب سے پرانی معلوم ہوتی ہے!" شاہد نے قبر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، جس کا گچ دو ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور اندر سے ککیّا اینٹیں جھانک رہی تھیں۔

"ہاں! یہ ہمارے اس خاندانی قبرستان کی سب سے پہلی قبر ہے۔" ساجد نے احتراماً قبر کے ایک حصّے پر سے اِملی کی سوکھی پتّیاں ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے جدامجد کا ذکر شاہد سے کئی بار بڑے فخر سے کر چکا تھا، اور اسے بتا چکا تھا کہ "غدر" کے زمانے میں اس "انگریز دشمن" فخرِ خاندان کو پھانسی پر چڑھایا گیا تھا۔ مگر اس نے شاید یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ

Scanned with CamScanner

پھانسی کہاں گڑی تھی جس پر اس "سورما" کو چڑھایا گیا تھا۔

"ہاشم علی خاں کو یہیں پھانسی دی گئی تھی۔"

"یہاں؟ قبرستان میں؟"

"ہاں! تمہارے دادا جان بتاتے تھے کہ پہلے یہ جگہ قبرستان نہیں تھی۔ بس ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ انگریزوں نے غدر کے زمانے میں یہیں پھانسیاں گاڑیں۔ ہاشم علی خاں یہیں دفن ہوئے اور اس طرح یہ ہمارا خاندانی قبرستان ہی گیا۔" ساجد چند لمحے چپ رہا۔ پھر اس نے کہا،

"ہمارا سلسلۂ نسب ایران تُوران سے نہیں، اس قبر سے شروع ہوتا ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر ساجد نے شاہد کا بازو پکڑ کر کہا، "آؤ"، اور دونوں ایک قبر کی جانب بڑھے جو ہاشم علی خاں کی قبر سے سات آٹھ گز کے فاصلے پر تھی اور جس کا کتبہ ساجد نے قبرستان میں داخل ہوتے ہی پڑھ لیا تھا۔ "یہ تمہارے دادا کی قبر ہے۔"

قبر اچھی حالت میں تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ کل پرسوں ہی اس کی صفائی کی گئی ہے۔ ساجد نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور کھول کر سر پر ڈال لیا۔ شاہد نے اس کی تقلید کی۔

"سورۂ فاتحہ یاد ہے؟"

جواب میں شاہد نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"الحمدللہ!"

"ہاں!" شاہد نے جلدی سے کہا۔ "وہ تو یاد ہے!"

دونوں نے ہاتھ اٹھائے اور ساجد نے سوچا، نہ جانے اسے یاد بھی ہے یا یوں ہی، مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ دیا۔ اس نے بےچینی سی محسوس کی۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور بےصدا آیات فاتحہ اتنی باصدا ہو گئیں کہ صاف سنائی دینے لگیں۔ فاتحہ پڑھنے کے دوران میں ساجد کی نظریں کئی بار قبرستان کے اُس پار تکیے کی طرف اٹھیں جس کے ایک کچّے گھر کے سامنے پڑے ہوئے چھپّر کے نیچے ایک عورت ایک جھلنگے پر بیٹھی پہلے کچھ سی رہی تھی اور اب ہاتھ روکے بڑے انہماک سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ فاتحہ پڑھ چکنے اور منہ پر ہاتھ پھیرنے اور رومال کو سر سے اتار کر دوبارہ تہہ کر کے پتلون کی جیب میں رکھنے کے بعد ساجد مڑا تو اس نے اسی عورت کو لال چھینٹ کے پیوند لگے سیدھے پاجامے اور لال نول کی قمیص میں اپنے پاس کھڑا پایا۔ اس کے پاس ایک مرد کالی تہمد اور گاڑھے کے میلے سپید کرتے پر کالی بنڈی پہنے کھڑا تھا۔ اس کا سر سپید تھا اور اس کی آنکھوں میں لال ڈورے تھے۔ دونوں نے اسے ایک ساتھ سلام کیا۔

"پہچانا ساجد میاں؟" مرد نے پوچھا۔

"بھئی معاف کرنا، یاد نہیں آ رہا!" حالاں‌کہ ساجد دیکھتے ہی دونوں کو پہچان گیا تھا۔

"میں بادشا ہوں، ساجد میاں۔ بادشا!"

تب ساجد نے "ارے بادشاہ!" کہہ کر اسے کھینچا اور گلے لگا لیا۔ "تو پھر یہ بتُولی ہوں گی!" اس نے جس تیزی سے بادشاہ کو کھینچ کر گلے لگایا تھا اسی تیزی سے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ بادشاہ کے کپڑوں سے چرس کی بُو آ رہی تھی۔

بتولی ساجد کے منہ سے اپنا نام سن کر اس عمر میں بھی شرمائی، لجائی، اور پھر ہنس دی۔

"سلام کر میاں کو!" بادشاہ نے اسے حکم دیا

بتُولی نے ساجد کو پھر سلام کیا۔

"اور یہ چھوٹے بھیّا ہوں گے!" بادشاہ نے کہا۔

"ہاں!" ساجد نے کہا۔ "ان کا نام شاہد ہے۔"

"بالکل میاں کی شکل ہے!" بتولی بولی۔

شاہد نے دونوں کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ دونوں نے اسے بہت ساری دعائیں دے ڈالیں۔

"شہنشاہ کیسے ہیں؟" ساجد نے پوچھا۔

بادشاہ فوراً آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ "ان کو گزرے تو، دس اوپر دو، بارہ برس ہو گئے!" اس نے ساجد کے والد کی قبر کی طرف دیکھا۔ "میاں کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد چل بسے!" جیسے ساجد کے والد کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو شاید اس کا باپ بھی نہ مرا ہوتا۔

بتولی آنکھوں میں آنسو لانے میں ناکام رہی۔ اس نے اپنی خشک ناک سُڑکنے پر اکتفا کیا۔

"بہت افسوس ہوا سُن کے!" ساجد نے کہا، اور اس سے اسے یاد آیا کہ باپ بیٹے میں کبھی نہیں بنی۔ اٹھتے بیٹھتے لڑائی جھگڑا، تُوتُو میں‌میں۔

"ہاں میاں!" بادشاہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت کو دونوں آنکھوں پر پھیر کر کہا۔ "اب تو اپنی باری ہے!"

"نہیں، بادشاہ!" ساجد نے اخلاقاً اس سے اختلاف ضروری سمجھا۔ "تم ابھی اور بہت دن جیو گے!"

اب بادشاہ کی باری تھی۔ اس نے مصلحتاً ساجد سے اختلاف ضروری سمجھا۔ "نہیں، ساجد میاں! اس سالی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں! اب اپنے میاں ہی کو دیکھ لو۔ چٹ پٹ ہو گئے!"

تکیے کے گنے چنے گھروندوں کے دروازوں میں جوان اور بوڑھی عورتوں کے سر نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے اور کئی بچے بچیاں -- کسی کی آنکھوں میں کیچڑ، کسی کی ناک

Scanned with CamScanner

بہتی ہوئی، کسی کے گلے میں تعویذ، کوئی نیچے سے ننگا، سب کے سر میلے چیکٹ، سب ننگے پیر -- کھسکتے کھسکتے قبرستان کے قریب آ گئے تھے۔

ساجد نے محسوس کیا کہ حملہ ہونے والا ہے۔ اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کے ایک نوٹ کو اندر ہی اندر تہہ کر کے اس صفائی سے نکالا کہ بادشاہ کو بھی نظر نہ آیا۔ حالاں‌کہ اس کی آنکھیں اسی لمحے سے لگاتار ساجد کے ہاتھ کا تعاقب کر رہی تھیں جب یہ جیکٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھا تھا۔ ساجد نے بادشاہ اور بتولی کی طرف پیٹھ کر کے تہہ کیا ہوا نوٹ شاہد کو دیا اور اس سے انگریزی میں کہا کہ یہ عورت کو دے دو۔ شاہد نے آگے بڑھ کر تہہ کیا ہوا نوٹ بتولی کو دے دیا۔ بتولی نے نوٹ آدھا کھول کر دیکھا، پھر پورا کھول کر اسے اپنی آنکھوں کے پاس لے گئی۔ اس کی چیاں سی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے نوٹ کو پھر تہہ کر کے مٹھی زور سے بند کر لی اور جہاں کھڑی تھی وہیں سے، ایک قدم بھی آگے بڑھے بغیر، ایک کھلے اور ایک بند ہاتھ سے، شاہد کی کنپٹیوں کو چھوئے بنا، اس کی بلائیں لے ڈالیں، اور ایک بار پھر شاہد پر دعاؤں کی بارش ہوئی۔ جگ جگ اور ہزار برس جینے کی دعا، دودھوں نہانے پوتوں پھلنے کی دعا، چاند سی بنو بیاہ کر لانے کی دعا، بری "نجر" سے بچنے کی دعا، "دروجے" پر ہاتھی جھومنے کی دعا، اور اونچے "پدے" کی دعا۔ اعلا عہدے پر پہنچنے کی یہ آخری دعا بادشاہ نے دی تھی جو اس بار، دعاؤں کے میدان میں، بتولی سے قدم ملا کر نہ چل سکا تھا اور جس کی نظریں بار بار بتولی کی بند مٹھی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"اب چلیں میاں!" اس نے ساجد سے اجازت مانگی۔

"ہاں۔"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے؟" اس نے مڑنے سے پہلے ساجد کے والد کی قبر کی جانب ایک مبہم سا اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہاں۔"

دونوں نے دونوں کو سلام کیا۔ بادشاہ چلنے کے لیے مڑا، مگر بتولی ہچکچائی۔ شاید وہ مزید اظہارِ تشکر کرنا چاہتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کرے۔

"اب چلتی ہے کہ...؟" بادشاہ نے اسے غضبناک نگاہوں سے دیکھا۔

بتولی نے جلدی سے ساجد اور شاہد کو پھر سلام کیا اور بادشاہ کے پیچھے ہو لی، جو ان بچوں کو ڈانٹ کر بھگا رہا تھا جو قبرستان کے کنارے جمع ہو گئے تھے۔

"اب دونوں میں لڑائی ہو گی۔" ساجد نے، ہاشم علی کی قبر کی جانب بڑھتے ہوئے، موسم کی پیشین گوئی کے انداز میں کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیوں؟"

"بادشاہ کہے گا نوٹ مجھے دے۔ بتولی کہے گی ہرگز نہیں، نشے پانی میں ڈبو دے گا! یہ

ہاتھ اٹھائے گا۔ دیتی ہے کہ کروں دُھنائی؟ وہ کہے گی چاہے ہڈی پسلی ایک کر دے، پر تجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گی۔" ساجد قبر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور شاہد بھی۔ "گالم گلوچ ہو گی۔ شاید جُوتم پیزار بھی۔ سارا تکیہ جمع ہو جائے گا۔ پھر بیچ بچاؤ ہو گا اور میرے خیال میں فیصلہ آدھے آدھے پر ہو گا۔ فیصلہ چاہے جو بھی ہو۔ آج بادشاہ دم لگانے کے بعد بالائی کا دونا ضرور چاٹے گا۔ فتح گڑھ کی بالائی بہت اچھی ہوا کرتی تھی!"

"نشہ کرتا ہے؟" شاہد نے انگریزی میں پوچھا۔

"ایسا ویسا! اس وقت بھی کپڑوں سے چرس کی بو آ رہی تھی۔ ان لوگوں میں..." ساجد نے تکیے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا، "یہ عادت خاصی عام ہے۔"

"کوئی قانونی پابندی نہیں؟" شاہد نے پھر انگریزی میں پوچھا۔

ساجد مسکرایا۔ "گانجے، چرس، بھنگ، افیم کا اِدھر، خاص کر ایسے لوگوں میں، ہزارہا برس سے رواج ہے۔ کوئی ٹوٹس نہیں لیتا۔ کوئی پابندی نہیں۔ نہ قانونی نہ سوشل!"

شاہد نے تکیے کی طرف دیکھا۔ کچھ نظریں ابھی تک اس کی اور ساجد کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے قبرستان پر ایک نظر ڈالی جس میں کوئی قبر نئی نہیں تھی۔

"قبریں کھود کر ان کا کام چل جاتا ہے؟"

"خالی قبریں تھوڑی کھودتے ہیں۔ بھیک بھی مانگتے ہیں۔ اور اب پتا نہیں پہلے تو شادی بیاہ میں بینڈ باجا بھی بجاتے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی یا اُلٹکی، ایک آدھ سائز بڑی یا ایک آدھ سائز چھوٹی، گنجلی ہوئی لال پیلی وردیاں اور بھنوؤں تک آتی ہوئی انگریزی ٹوپیاں پہن کر۔ نہ تال ٹھیک، نہ گت، نہ سُر۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کو جی چاہتا تھا۔ شادی بیاہ کا کھانا مل جاتا تھا پیٹ بھر کے کھانے کو، اور کچھ نقدی بھی۔ یہ الگ بات کہ بےچاروں کو بہت انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جب سب کھا پی چکتے تھے تب ان کی باری آتی تھی۔"

"اور یہ بادشاہ؟ یہ کیا ان کا ہیڈ ہے؟"

"آفیشل نہیں تو اَن آفیشل۔ اس کا خاندان سالہاسال سے اس قبرستان کی رکھوالی کرتا آ رہا ہے، اور بدلے میں اس خاندان کو ہم لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ پہلے ان کا ماہانہ بندھا ہوا تھا۔ جمعرات، عید بقرعید، شادی بیاہ الگ۔ ادّا میاں بھی ہر مہینے کچھ نہ کچھ تو دیتے ہی ہوں گے! اور کچھ نہیں تو حویلی کی روایت قائم رکھنے کے لیے۔ تم کیا سمجھے، مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا؟"

"لگا تو ایسا ہی تھا۔"

ساجد ہنسا۔ "بہت بدمعاش ہے۔ اچھا خاصا ایکٹر! ادّا میاں نے بتا دیا ہو گا۔ ورنہ قبریں کہیں اتنی صاف ملتیں؟ معلوم ہوتا ہے سارے قبرستان میں جھاڑو لگائی گئی ہے۔ تم نے ایک بات نوٹ کی؟"

شاہد چپ رہا۔

Scanned with CamScanner

"اس نے تمھاری مَم کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی بیوی نے بھی نہیں۔ ورنہ چھوٹتے ہی پوچھتی، بیگم صاحب بھی آئی ہیں؟ راجی خوشی ہیں؟ بلکہ پہلے ہی حویلی پہنچ چکی ہوتی بیگم صاحب کو سلام کرنے۔ اور دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمھاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"تبھی کہہ رہی تھی چاند سی بنّو بیاہ کے لاؤ۔ بنّو کسے کہتے ہیں؟"

"بیوی کو۔ لیکن یہاں معنی دلھن کے ہیں۔ بلکہ نئی دلھن کے۔"

یکایک ساجد کا حافظہ اسے بہت دور لے گیا۔

"اس کا باپ اس سے بھی بڑا ایکٹر تھا۔ ایک دن یہیں، اسی تکیے کے سامنے، کسی سے لڑ جھگڑ رہا تھا۔ بلکہ باقاعدہ مار رہا تھا اسے۔ جوتے سے۔ کہہ رہا تھا دو مہینے ہو گئے، اس نے مجھ سے ایک روپیا ادھار لیا تھا۔ بیسیوں بار تقاضا کر چکا ہوں پر واپس دینے کا نام نہیں لیتا۔ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ پھر اسے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ اسی سڑک پر۔ اس وقت یہ کنکر کی ہوتی تھی، جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی۔ کہہ رہا تھا اٹھا کر نالے میں پھینک دوں گا۔" ساجد لمحے بھر کے لیے رکا۔ اسے وہ گالی یاد آئی جو بادشاہ کے باپ نے اس شخص کو نالے میں پھینک دینے کی دھمکی دیتے وقت دی تھی۔ گالی اس کی زبان تک آتے آتے رک گئی۔ "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میں پاس ہی کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور مجھے سخت غصہ آ رہا تھا کہ یہ شخص محض ایک روپلی کی خاطر ایک آدمی کو ایسے مار رہا ہے۔ جوتے سے۔ اسے بےعزت کر رہا ہے۔ میں اس وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو برس کا رہا ہوں گا۔ جب شہنشاہ اس آدمی کو گھسیٹتا ہوا بالکل نالے کے کنارے لے گیا اور میں سمجھا کہ وہ اسے اب پھینکنے ہی والا ہے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ایک ڈھیلا اٹھا کر اس کے دے مارا۔ اتفاق کی بات کہ ڈھیلا یا پتھر یا اینٹ کا ٹکڑا، جو کچھ بھی تھا، جا کر سیدھا اس کے سر پر لگا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس آدمی کو چھوڑ چھاڑ اور کرتے کے دامن کو یہاں وہاں خون سے رنگ کر ہائے ہائے کرتا، سر پکڑے حویلی پہنچ گیا۔ میاں نے سر پھاڑ ڈالا، میاں نے سر پھاڑ ڈالا کی رٹ لگاتا ہوا۔ ابّا جان اس وقت گھر پر نہیں تھے، لہٰذا معاملہ امّی جان کی عدالت میں پیش ہوا۔ کسی ملازم سے کہا گیا کہ باہر جا کر دیکھو کیسی چوٹ ہے۔ اس نے رپورٹ پیش کی کہ واقعی سر پھٹا ہے، مگر چوٹ گہری نہیں۔ امی جان نے اسے پانچ روپے بھجوائے اور ملازم کو ساتھ کر دیا کہ لے جا کر ڈاکٹر پرشوتم داس سے، جو اس زمانے میں فتح گڑھ کے واحد ڈاکٹر تھے، مرہم پٹی کروا دو۔ لیکن وہ بدمعاش کہیں اتنی آسانی سے ٹلنے والا تھا؟ پانچ تو بہت تھوڑے ہیں، بیگم صاحب۔ بہت خون بہہ گیا ہے۔ مہینے بھر روز آدھ سیر دودھ ملے تب کہیں جا کر اتنا پھر بن پائے گا۔ غرض جب تک اس نے امی جان سے پانچ روپے اور نہیں اینٹھ لیے تب تک نہیں ٹلا۔"

"آپ پر ڈانٹ پڑی ہو گی؟"

ساجد مسکرایا۔ نہ جانے کیوں بچّوں کو یہ جان کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ کبھی ان کے والدین پر بھی ڈانٹ پڑا کرتی تھی۔ خاص کر قبلہ و کعبہ ابّا جان پر۔۔۔

"ڈانٹ ہی سمجھو، لیکن ذرا مختلف قسم کی۔ میں اوپر برساتی میں تھا۔ تمھاری پھوپھی صاحبہ آئیں۔ تلیے بھائی دان، آپ کو امی دان بلا رہی ہیں۔ ساجدہ اس زمانے میں تُتلایا کرتی تھی۔ تو جناب ہم امی جان کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ تشریف رکھیے۔ ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ کیونکہ امی جان ہمارے ساتھ آپ جناب سے صرف اُس وقت پیش آتی تھیں جب ناراض ہوتی تھیں۔ ورنہ ہمیشہ تم۔ ابّا جان کا معاملہ اس کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ جب ناراض ہوتے تھے تب تم کہتے تھے۔ ورنہ ہمیشہ آپ۔ تو جناب، ہمیں بتایا گیا کہ وہ فقیر شہنشاہ شکایت لے کر آیا تھا کہ میاں نے اس کا سر پھوڑ دیا۔ ہم نے فوراً اقبال جرم کیا، مگر لگے ہاتھوں انھیں یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ ہم نے اسے ایک بہت بری حرکت سے باز رکھنے کے لیے ایسا کیا۔ لیکن ہماری کوئی سُنوائی نہیں ہوئی اور فیصلہ ہمارے خلاف صادر ہوا۔ آپ کو دوسروں کے قضیّوں میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ آپ اپنے کام سے کام رکھیے۔ دوسروں کے پھٹے میں پیر نہ اَڑائیے۔ پھر کبھی ہم اس قسم کی کوئی شکایت نہ سنیں، ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا، ہاں۔ اور عدالت برخاست۔"

ساجد تھوڑی دیر خاموش رہا۔

"واقعی بہت بڑا ایکٹر تھا بادشاہ کا باپ! بہت عرصے بعد ایک دن مَیں نے اسے یاد دلایا کہ میری وجہ سے تمھیں دس روپے ملے، تو معلوم ہے کیا بولا؟ دس کیوں میاں، پورے گیارہ! میں کیا اپنا روپیا چھوڑنے والا تھا؟ میں نے وصول کر کے چھوڑا۔ اُس زمانے میں دس روپے بہت ہوتے تھے، اور وہ بھی کسی فقیر، بھک منگے کے لیے۔ لوگ بھیک میں عموماً ایک پیسا دیتے تھے اور کسی نے اِکنّی دے دی تو مانو حاتم کی قبر پر لات مار دی۔ اکنّی چار پیسوں کی ہوتی تھی۔ نئے نہیں، پرانے چار پیسے۔ روپے میں چونسٹھ۔ باپ بیٹے کی کبھی نہیں بنی۔ جب دیکھو آپس میں بک بک جھک جھک۔" وہ رکا۔ کہے کہ نہ کہے؟ جوان ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ خاصی دنیا دیکھے ہوئے ہے۔ اور پھر جوان بیٹا تو دوست برابر ہوتا ہے۔ فیصلہ کہہ دینے کے حق میں ہوا۔ "معلوم نہیں کہاں تک سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ مگر لوگ کہتے تھے کہ شہنشاہ نے ایک رات اپنی بہو پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اسی بتولی پر۔ شاید نشے میں رہا ہو۔ اور کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ اس کے بتولی کے ساتھ تعلقات تھے۔ اور اسی لیے باپ بیٹے میں اَن بن رہتی تھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ویسے نیچ ذات کے لوگوں میں اس قسم کی باتیں عام تو تھیں۔"

"میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں صرف مغرب میں ہوتی ہیں،" شاہد نے انگریزی میں کہا۔

"نہیں۔ مگر گورے اس معاملے میں بھی اور لوگوں سے بہت آگے ہیں۔" ساجد کو ٹی وی کا ایک پروگرام یاد آ گیا۔ "صرف برطانیہ میں ایسے کئی ہزار کیس ہر سال عدالتوں میں

Scanned with CamScanner

پیش ہوتے ہیں۔ اور ماہرین کی رائے ہے کہ جو واقعات عدالتوں تک نہیں پہنچتے ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ادھر تو بیس پچیس برس میں ایک آدھ بات ایسی سننے میں آتی تھی۔ اور وہ بھی کون جانے کہ سچ یا جھوٹ!"

"امیریکا کا بھی یہی حال ہے۔"

ایک بات اور۔" ساجد نے کہا۔ "یہاں کی، سچ جھوٹ، جو بھی سنی سنائی بات ہوتی ہے وہ زیادہ تر سسر بہو کی۔ مگر اُدھر تو باپ، بھائی، دادا، نانا، انکل، اور پانچ پانچ چھ چھ برس تک کی بچیوں کے ساتھ۔ ایک کیس مجھے یاد ہے۔ تین بہنیں تھیں، اور سگے باپ نے باری باری تینوں کو خراب کیا۔ لگاتار، برسوں تک۔"

ساجد جھرجھری لے کر چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تین چار اور قبروں کا تعارف کرایا، جن میں سے ایک اس کی بڑی بہن نفیسہ آپا کی تھی، جو عمر میں اس سے دو ڈھائی سال بڑی تھیں اور جن کا کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جب وہ حویلی واپس جا رہے تھے تو ساجد نے ہاشم علی خاں کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے انگریزی میں کہا،

"میں ان کے پائنتی دفن ہوں تو کتنا اچھا ہو!"

"پریاگ راج" کی رفتار بڑی تیزی سے کم ہونی شروع ہوئی اور گاڑی بالآخر پہیوں کے شدید احتجاج کے باوجود رک گئی۔ سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اب اس کی پیٹھ گاڑی ساجد کی طرف تھی، جس پر سے سپید چادر کھسک گئی تھی۔ عورت نے اپنے ابھرے ہوئے کولھے پر ہاتھ پھیرا، اور چت ہو کر بدن کو چادر سے گردن تک ڈھانک لیا۔

ساجد کی نظریں عورت کے ڈھکے بدن پر سے ہٹ کر کھڑکی کے دھندلے شیشے کے اُس پار چلی گئیں۔ سارا منظر ٹھنڈی چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ریل کی اڑی ترچھی، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی پٹریاں۔ ان کے پیچھے ریلوے کے کوارٹر جیسی دو عمارتیں۔ عمارتوں کے پیچھے دور تک پھیلے ہوئے کھیت۔ کھیتوں کے بیچ میں رام لیلا کے راون جیسا ایک پائلون۔ کھیتوں کے اُس پار کچھ کچّے مکان۔ دائیں ہاتھ آموں کا ایک باغ۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا خشک تالاب۔ جدھر نگاہ اٹھی سیرِ شبستاں ہے۔ اس کا جی چاہا کہ گاڑی سے اتر کر کھیتوں میں چلا جائے۔ ننگے پیر۔ مگر گاڑی کسی اسٹیشن پر نہیں رکی تھی، بلکہ سگنل کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر بھی اس نے ٹانگیں برتھ سے نیچے لٹکائیں۔ اور اگر چھوٹ گئی تو؟ وہ اپنے ارادے کی لغویت پر اندر ہی اندر ہنسا اور اس نے ٹانگیں پھر اوپر کر لیں۔ مسافروں کو سواری چھوٹ جانے کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔ فلائٹ نہ مس ہو جائے۔ ٹرین نہ چل دے۔ بس نہ چھوٹ جائے۔ ہمیشہ خدشہ۔ ہمیشہ دھڑکا۔ کہیں چُھٹ نہ جائیں۔ پیچھے نہ رہ جائیں۔ حالانکہ ٹھنڈے دل سے سوچو تو چھٹ جانے، پیچھے رہ جانے سے زیادہ خطرہ سفر میں ہے۔ لیکن منزل اشارے کرتی رہتی ہے، اپنے پاس بلاتی رہتی ہے۔ اور لوگ منزل کو پا لینے کے

والہانہ شوق میں رواں دواں رہتے ہیں۔ اور منزل پا لیتے ہیں۔ لیکن جب شدّتِ خواہش سے لرزاں ہاتھوں سے پیکرِ مراد کا کتانی ملبوس اتارتے ہیں تو جو گولائیاں دور سے دعوتِ نظارہ و لمس و ذائقہ دیتی نظر آ رہی تھیں، درحقیقت تپکتے پھوڑے نکلتی ہیں۔ وہ شگاف جو مسکراتے نظر آ رہے تھے، دراصل زخم، جن سے خون اور پیپ رس رہا ہے۔ اور متبسّم آنکھیں جو ٹھنڈی روشنی کی جھیلیں نظر آ رہی تھیں، اصل میں دہکتے الاؤ، جن کے رقصاں شعلے انہیں جلا کر راکھ کر دینے کے لیے بے چین۔

گاڑی جب تال سے بے تال ہوئی تو شاہد کی نیند اچٹی۔ اور بالکل رک گئی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ گاڑی نہیں چلی۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ساجد برتھ پر پیر پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔

"آپ سوئے نہیں، ابّو؟"

"نیند نہیں آئی۔"

شاہد نیچے آ گیا۔ ساجد نے پیر سکیڑ لیے۔ شاہد اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

"کون سا اسٹیشن ہے؟"

"ابھی اسٹیشن نہیں آیا۔ سگنل پر رکی کھڑی ہے۔"

"فتح پور۔" سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کہا۔ "اب فتحپور آئے گا۔" اور یہ اطمینان کر کے کہ چادر اس کے بدن کو ٹھیک سے ڈھانکے ہوئے ہے، عورت نے کروٹ بدل کر بلادھڑک پُشت ان کی طرف کر دی۔

"اردو لٹریچر میں۔" ساجد نے کہا، "فتحپور کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ تقسیم سے پہلے یہاں سے ایک مشہور ادبی رسالہ نکلا کرتا تھا۔ نہیں، نکلتا تو لکھنؤ سے تھا، اور اس سے پہلے شاید بھوپال سے۔ مگر اس کے ایڈیٹر یہاں کے رہنے والے تھے۔ نیاز فتحپوری۔"

"کیا نام تھا؟"

"نگار۔ بہت اچھا پرچا تھا!"

"بند ہو گیا؟"

"ہاں۔ ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا تھا۔ مگر وہاں چلا نہیں۔"

"کیوں؟"

ساجد چند لمحے خاموش رہا۔ "معلوم نہیں۔"

"یہاں سے نہ جاتا تو؟"

ساجد کے ذہن میں ایک مصرعہ کوندا۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "پتا نہیں۔ شاید تب بھی بند ہو جاتا۔ کچھ دیر اور سو لو۔"

"آپ بھی تھوڑا سو لیجیے۔" شاہد نے اپنی برتھ پر واپس جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" لیکن ساجد نے آنکھیں بند کرنے کی بجائے سگریٹ سلگا لی۔ ٹرین حرکت میں

Scanned with CamScanner

آئی۔ اور جب فتحپور پیچھے رہ گیا تو ساجد نے سنا کہ کرّن اس مصرعے کی گت پر جو ابھی اس کے ذہن میں کوندا تھا سرپٹ بھاگی جا رہی ہے۔ غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر آنکھیں بند کر لیں۔

ساجد شاہد کو اردو ادب کی تاریخ میں فرخ آباد کے مقام سے روشناس کرا چکا تھا۔ سودا اور ناسخ نے دلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے یہاں قیام کیا تھا۔ اور غالب کلکتے جاتے ہوئے یہاں رکے تھے۔ اور شاید میر بھی لکھنؤ جاتے ہوئے یہاں سے گزرے ہوں۔ اور چونکہ انشا کے والد اسی شہر میں کہیں دفن ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ وہ بھی فرخ آباد سے واقف رہے ہوں۔ اور جان صاحب تو پیدا یہیں ہوئے تھے۔ مگر ساتھ ساتھ اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ اردو کے متعدد شعرا دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں کیوں جا بسے تھے، اور غالب نے کلکتے کا سفر کیوں کیا تھا، اور ریختی اردو کا پرانا نام نہیں بلکہ اردو شاعری کی ایک صنف ہے۔ اور ہاں، اردو کے مشہور ناول "امراؤ جان ادا" میں بھی فرخ آباد کا ذکر آیا ہے۔ اور مہادیوی ورما، جو ہندی کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں، وہ بھی فرخ آباد کی ہیں۔ شاید ابھی زندہ ہیں۔

اور اب باپ بیٹے سدواڑے کی ایک غیرمعمولی طور پر صاف ستھری گلی میں سے گزر رہے تھے۔ گلی کے دونوں طرف اونچی کرسیوں پر بنے ہوئے بڑے بڑے گھروں پر نظر ڈالتے ہوئے جن کے بلند، چوبی دروازوں پر جگ جگ پیتل کی چم چم کرتی پتریں چڑھی ہوئی تھیں اور پیتل ہی کی بڑے متھوں والی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور ساجد شاہد کو بتا رہا تھا کہ اس محلے کو سدواڑا اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں ساد رہتے ہیں۔ ساد ہندوؤں کی ایک تجارت پیشہ ذات کا نام ہے۔ اور ساد فرخ آباد کے علاوہ ہندوستان میں شاید کہیں اور نہیں ملتے۔ چھپے ہوئے لحافوں، فردوں، رضائیوں اور پردوں وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں۔ تھوڑے سے ہیں مگر بہت مالدار۔ سدواڑے کے لوگوں کی مجموعی مالی حیثیت اربوں روپے کی ہو گی۔ "فرخ آباد چھپائی کے لیے مشہور تھا۔ اب پتا نہیں۔ لیکن پہلے تو سارے کے سارے کاریگر مسلمان ہوتے تھے۔ اور یہاں کے چھپے ہوئے لحافوں کا تو دور دور تک شہرہ تھا۔ بیرونِ ملک بھی۔"

وہ واپس کھمتا بازار جا رہے تھے جہاں انھوں نے تانگے کے اڈے پر تانگا چھوڑا تھا۔ اور جب وہ ایک حلوائی کی دکان کے سامنے سے گزرے تو ساجد کو فرخ آباد کی ایک اور مشہور چیز یاد آئی۔ "یہاں گرمیوں میں ایک لڈو ملا کرتا تھا۔ اولے کا لڈو۔ گلاس بھر پانی میں ایک لڈو ڈالا اور ذرا سی دیر میں ٹھنڈا شربت تیار۔ برف ورف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور دیکھنے میں لگتا بھی تھا بڑا سا اولا۔"

اڈے پر شبراتی گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا۔ "آغا میاں کو کوئی جروری کام یاد آ گیا تھا۔ قلے تلے گئے ہیں۔ اور کہ گئے ہیں میرا انتجار نہ کریو۔ ساجد میاں جب بھی فارغ ہو جائیں انھیں واپس لے جیو۔"

اور جب وہ مغلوں کے زمانے کے صدردروازے کے راستے شہر سے باہر آئے تو شبراتی نے تانگے کو سیمنٹ کی اس تین میل لمبی سڑک پر ڈال دیا جو سیدھی فتح گڑھ کو جاتی ہے۔ لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ساجد نے کہا، "اسی راستے واپس چلو جس راستے آئے تھے۔" شبراتی نے تانگا موڑا اور اس سڑک پر آ گیا جو آگے جا کر چھاؤنی میں سے گزرتی ہے۔ اور ساجد نے شاہد کو بتانا شروع کیا کہ فتح گڑھ کی چھاؤنی خاصی بڑی ہے۔ رقبے میں قصبے سے چھوٹی ہو گی تو بس تھوڑی سی۔ پہلے یہاں صرف ایک ریجیمنٹ رہتی تھی۔ ساتویں راجپوت۔ جنرل کری آپا، جو بعد میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر اِن چیف یا چیف آف اسٹاف بنے، لڑائی کے زمانے میں یہاں تعینات تھے۔ اب یہاں ایک اور ریجیمنٹ بھی ہے۔ سولھویں سکھ۔ ساتویں راجپوت میں جہلم وغیرہ کی طرف کے مسلمان سپاہیوں کی اچھی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی۔ اور انھی کی وجہ سے ساجد ہیر سے متعارف ہوا تھا۔

"رات کے سناٹے میں ان سپاہیوں میں سے کسی کی پاٹ دار آواز اچانک چھاؤنی سے بلند ہو کر سارے قصبے پر چھا جایا کرتی تھی۔ ہمیشہ وہی لے، جیسے کوئی فریاد کر رہا ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں نے پہلی مرتبہ یہ لے سنی تھی تو مجھے ایک نامعلوم سی بےچینی کا احساس ہوا تھا۔ اور جب میں نے اباجان سے پوچھا تھا کہ یہ کون گا رہا تھا، کیا گا رہا تھا، تو میرا وارث شاہ سے تعارف ہوا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ پنجاب کے فوجیوں کو جب گھر کی یاد ستاتی ہے تو ہیر گاتے ہیں۔

تانگا چھاؤنی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا، اور ساجد کو وہ بارکیں اور وہ میدان نظر آنا شروع ہو گیا تھا جہاں پاکستانی فوجی قیدی بنا کر رکھے گئے تھے۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی گت پر ایک خیال نے اس کے ذہن میں ڈلکی چلنی شروع کی۔ ان علاقوں کے لوگ کمپنی بہادر کے زمانے سے فوج میں ملازمت کرتے آ رہے ہیں۔ نسلاً بعد نسلاً۔ باپ کے بعد بیٹا۔ غدر، سرحد، پہلی عالمی جنگ، دوسری عالمی جنگ۔ جزیرہ نمائے عرب، فلسطین، عراق، شمالی افریقہ، اٹلی، فرانس، برما، سنگاپور، ملایا، اور نہ جانے کہاں کہاں۔ جنگی قیدیوں میں کچھ تو ضرور ایسے بھی رہے ہوں گے جن کے باپ، دادا، یا کوئی اور عزیز رشتےدار کبھی اس چھاؤنی میں تعینات رہے ہوں گے۔ بھرتی ہونے، مشرقی پاکستان بھیجے جانے، ہتھیار ڈالنے، قیدی بنائے جانے سے پہلے انھوں نے اپنے ان رشتےداروں سے کیا اس قصبے، اس چھاؤنی کا ذکر نہیں سنا ہو گا؟ اور جب چھوٹ کر واپس گئے ہوں گے تو انھوں نے اپنے گھر والوں، اپنے رشتےداروں کو بتایا ہو گا۔ کیا بتایا ہوگا؟ لو جی! تم جس چھاؤنی کا ذکر کیا کرتے تھے، سنا کرتے تھے، ہم بھی وہاں رہ آئے! گھوڑے کی ٹاپوں کی گت پر ایک منظر ساجد کے ذہن میں در آیا۔ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن۔ چاروں طرف دور دور تک گیہوں کے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ ایک ٹرین آ کر رکتی ہے۔ اس میں سے تین چار شخص، فوجی وردی میں ملبوس، اترتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر کئی مرد، پگڑیاں اور صافے باندھے، اور کچھ لڑکیاں اور عورتیں، رنگ

Scanned with CamScanner

برنگی چُنیاں اور دوپٹے اوڑھے، اور ہاتھوں میں ہار لیے کھڑی ہیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہیں اور ہار منزل پر پہنچے ہوئے مسافروں کے گلے میں پڑ جاتے ہیں۔ ساجد کے تصور نے آنکھیں میچ لیں۔ اور جب کھولیں تو ایک اور منظر ان کے سامنے تھا۔ وہی اسٹیشن۔ وہی ٹرین۔ فوجی وردی میں ملبوس ایک شخص، جس پر گرد جمی ہوئی ہے، ٹرین سے اترتا ہے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہے۔ پلیٹ فارم سنسان ہے۔ وہ اسٹیشن سے باہر آ کر ایک پگڈنڈی پر ہو لیتا ہے جو کھیتوں کے بیچ میں سے بل کھاتی گزر رہی ہے۔ دونوں طرف عورتیں اور لڑکیاں اور مرد کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ لمحے دو لمحے ہاتھ روک کر وہ اس تھکے ہارے، گردآلود مسافر کو دیکھتے ہیں جو گردن جھکائے چلا جا رہا ہے۔ اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔

"کیوں جی، شبراتی! ان لوگوں کو ہیر گانے کی اجازت تھی؟"

شبراتی نے مڑ کر ساجد کو دیکھا۔ "کسے میاں؟"

"پاکستانی قیدیوں کو۔"

"پتا نئیں میاں!" پھر اس نے پوچھا۔ "ہیر کیا ہوتا ہے؟"

"ہیر؟" ساجد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شبراتی کو تھوڑے سے الفاظ میں ہیر اور پاکستانی قیدیوں کے باہمی رشتے کی معنویت کیسے بتائے۔ "ایک نظم کا نام ہے۔ ایک پنجابی نظم کا!"

تانگا اب ان بارکوں اور اُس میدان کے پاس سے گزر رہا تھا۔

"پتا ہے میاں! بہت سے بھاگ گئے تھے۔"

"کون؟ قیدی؟"

"ہاں میاں! کوئی چالیس پچاس۔"

ساجد نے سوچا، پکڑے گئے ہوں گے۔ "پکڑے گئے ہوں گے!"

"یئی تو کمال ہوا میاں! ایک بھی نئیں پکڑا گیا۔ جتّے بھاگے تھے، سنا ہے سب کے سب صحی سلامت پاکستان پہنچ گئے۔"

ساجد کو شبراتی کے الفاظ ہنستے ہوئے سنائی دیے۔ "واقعی؟"

"ہاں میاں! سنا ہے اندر ہی اندر سرنگ کھود کر گنگاپار نکلے۔ اُس پار سواری کا پہلے سے انتجام تھا۔ اس میں بیٹھ، یے جا وو جا!"

"یہ تو واقعی کمال ہوا!" شاہد نے ساجد سے انگریزی میں کہا۔ "جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے برطانوی، امریکی اور دیگر اتحادی فوجیوں کے فرار کے جتنے فلم اور ٹی وی سیریل میں نے دیکھے ہیں، ان میں زیادہ تر بھاگنے والوں کو جلد یا بدیر واپس کیمپوں میں دکھایا گیا ہے۔"

"مگر یہاں کی بات دوسری ہے۔" ساجد نے بھی انگریزی کا سہارا لیا۔ "بھانت بھانت کی بولیاں، طرح طرح کے لباس، قسم قسم کے ناک نقشے۔ نہ زبان کا مسئلہ، نہ پوشاک کا۔

پہچانے جاتے تو کیسے؟ یہ نہیں کہ قومی زبان بولے اور پہچانے گئے۔ پاجامہ پہنا نہیں کہ پہچانے گئے۔"

پھر ساجد نے شبراتی کو مخاطب کیا۔ "سواری کا انتظام کس نے کیا تھا؟"

"مالوم نئیں میاں!"

تانگا اب چھاؤنی کے اُس علاقے میں سے گزر رہا تھا جہاں افسروں کے کشادہ بنگلے ہیں۔ ان میں سے ایک کے گیٹ پر ایک سکھ سپاہی، پوری وردی میں، ایک مونڈھے یا اسٹول پر بیٹھا ہوا، بڑے غور سے تانگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میاں، آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا!"

"کیا؟"

"چھاؤنی میں پاکستان سے آنے والوں کا جانا منا ہے!" شبراتی نے سکھ سپاہی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"تمھیں پہلے بتانا چاہیے تھا!" ساجد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"معاف کرنا میاں! ابھی یاد آیا۔"

"بُرے پھنسے!" ساجد نے سکھ سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو غیریقینی انداز میں کھڑا ہو رہا تھا۔ "اب یہ تمھیں تانگا روکنے کا آرڈر دے گا۔"

"موڑ لوں؟"

"اب موڑنے سے کیا ہو گا؟" ساجد نے ہوچہ باد باد کے انداز میں کہا۔ تانگا بنگلے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ شبراتی کی نظریں ناک کی سیدھ میں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ سکھ سپاہی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اٹینشن ہو کر سلیوٹ مارا۔ ساجد نے اس کے سلیوٹ کا جواب سلیوٹ سے دیا۔ شبراتی نے مڑ کر ساجد کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ساجد مسکرایا۔ شاہد بڑی مشکل سے ہنسی روک سکا۔

"بال بال بچے!" ساجد نے کہا۔

"ہاں میاں!" شبراتی نے کہا۔ مگر وہ بدستور ساجد کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اب ساجد سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ ہنسا۔ اس کے ساتھ شاہد بھی۔ ہنسی ان کے منھ سے ایسے نکلی جیسے پنجرہ کھلنے پر اس میں سے پنچھی پر پھڑپھڑاتے نکلتے ہیں۔

"کوئی ہماری پیشانی پر لکھا ہے کہ ہم پاکستانی ہیں؟" ساجد نے ہنسی پر قابو پا کر کہا۔

"نئیں۔ پر وہ جو اس نے سلوٹ مارا، وہ کاہے کو؟" شبراتی کی حیرانی ابھی برقرار تھی۔

"احتیاطاً!" ساجد نے کہا۔ اور شبراتی کو تفصیلاً سمجھایا۔

تب شاہد نے شبراتی کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ "ہمارے پاس پاکستانی نہیں، انگریزی پاسپورٹ ہیں۔"

"میاں نے بلاوجہ ہی پل دو پل خون خشک کروا دیا؟"

"اتنا مت ڈرا کرو۔" ساجد نے کہا۔

"ڈرتا کون ہے میاں؟" شبراتی نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔ "شبراتی کسی سے نہیں ڈرتا، سوائے اوپر والے کے۔"

ساجد مسکرایا۔

ایک شعر کئی منٹ سے ساجد کے ذہن کے تہہ خانے سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کبھی ایک ٹکڑا سر نکالتا، کبھی دوسرا۔ لیکن باہم مربوط ہو کر نہیں۔ بالآخر ایک ٹکڑا ابھرنے اور ڈوبنے کی کشاکش سے چھوٹ کر سطح پر ایسا آیا کہ پھر اس نے روپوش ہونے کا نام نہیں لیا۔ آنکھ بھر آئی۔ لیکن باقی ٹکڑے ابھی تک تہہ خانے میں بند تھے۔ اس نے قافیوں کی تلاش شروع کی۔ گھر آئی۔ کر آئی۔ پر آئی۔ سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اب اس کی پیٹھ ساجد کی جانب تھی اور سپید چادر بدن پر سے اتنی ہٹ گئی تھی کہ ساری میں لپٹے ہوئے گداز کولھوں اور چولی میں پھنسی ہوئی پیٹھ کے درمیان کا حصہ ساجد کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ نظر آئی۔ کمر آئی۔ گزر آئی۔ اس کا ذہن "نظر آئی" کی جانب واپس گیا۔ وہ پو پھٹی۔۔۔ ساجد نے دیکھا کہ باہر چاندنی اب پھیکی پڑ چلی ہے۔ وہ پو پھٹی۔۔۔ وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی۔ یہ اس شعر کا مصرعہ نہیں تھا جس کے ٹکڑے جوڑنے کی وہ اتنی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مصرعے کو تھوڑی دیر اپنے ذہن میں گھومنے دیا۔ لیکن دوسرا مصرعہ پھر بھی یاد نہیں آیا۔ نئی زندگی۔ مائی فٹ! اس نے اپنی جھلاہٹ کی خاموش گونج سنی۔ اس کی نظریں عورت کی موٹی مگر ننگی کمر پر جم گئیں۔ عورت جھپاک سے کروٹ بدل کر چت ہو گئی۔ گویا اسے اپنی عریاں کمر پر ساجد کی نظروں کے لمس کا احساس ہو گیا ہو۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ساجد کی آنکھیں بند تھیں۔ عورت نے پھر چادر سے اپنے جسم کو گردن تک ڈھک لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ عورت پیر پھیلائے، بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور چادر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں دھنسی ہوئی تھی۔ کسی چھوٹے سے اسٹیشن کی مدھم روشنیاں تیزی سے گزریں۔

جہاں ساجد اور شاہد کھڑے ہوئے تھے وہ جگہ دریا کی سطح سے کوئی پچیس تیس فٹ بلند تھی۔ بائیں جانب پست قد درختوں کی ایک باڑھ کے اس طرف، ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر، کچھ سپاہی والی بال کھیل رہے تھے۔ دائیں جانب اور پیچھے کی طرف، بیس پچیس گز کے فاصلے پر، فوجی افسروں کے تین چار بنگلے تھے۔ سامنے، نیچے، گنگا بہہ رہی تھی۔ خاموش، تھکی تھکی سی، نرم رو۔ شام کا وقت تھا۔ سورج ڈوبا چاہتا تھا۔ اس کی پیلی کرنیں گنگا کے پانی میں لچک رہی تھیں۔

"یہ جگہ۔" ساجد نے اس بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی جانب اس کی پشت تھی، "پہلے خالی ہوا کرتی تھی۔ یہ بنگلے بعد کے ہیں۔ کتنی آئیڈیل جگہ ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے گنگا کا نظارہ کرو! آؤ، نیچے چلیں۔"

لال اینٹ کی بیس پچیس سیڑھیاں اتر کر وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ پانی جو اوپر سے ٹھہرا ٹھہرا نظر آرہا تھا اب باقاعدہ بہتا نظر آیا۔ دریاپار حد نظر تک ایک میدان سا پھیلا ہوا تھا جو سورج کی ماند پڑتی روشنی میں سنہرا نظر آرہا تھا۔

"اس وقت تو پیدل پار کر سکتے ہیں۔" ساجد نے کہا۔ وہ دونوں گنگاکنارے گیلی ریت پر ٹہل رہے تھے۔ "لیکن برسات میں گنگا کا پاٹ میلوں تک نظر نہیں آتا۔"

"کتنی پیس فل جگہ ہے؟"

"ہاں؟" ساجد رک گیا۔ اس کی نگاہیں اس بلندی پر اگے ہوئے درختوں کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے وہ چند منٹ پہلے اترے تھے۔ "یہاں میں بہت آیا کرتا تھا۔ کوئی کتاب اٹھائی اور ادھر آ نکلے۔ اور ان پیڑوں میں سے کسی کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں پڑھتے رہے۔ سکون کے معنی شاید اسی جگہ نے مجھے پہلی بار سمجھائے۔"

وہ مڑے تو شاہد کو وہ مندر نظر آیا جو سیڑھیوں کے اس طرف ایک چبوترے پر رکھا ہوا ایک بڑا سا گڑیاگھر لگ رہا تھا، اور اس کے اندر رکھی ہوئی مورتی اور مورتی کے قدموں میں بکھرے ہوئے عقیدت کے پھول شام کے دھندلکے میں بھی صاف نظر آ رہے تھے۔

"ابو، یہی تو ہے وہ گھاٹ!" شاہد کے لہجے میں دریافت کی خوشی کھنک رہی تھی۔

"کون سا گھاٹ؟"

"وہی جہاں وہ پجاری اپنا انسٹرومنٹ بجایا کرتا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے؟"

"اکتارا؟"

"ہاں۔ ایک تارا!"

"تمھیں کیسے معلوم؟"

"مم بتایا کرتی تھیں۔ دادی جان نے اپنے کسی خط میں لکھا تھا۔"

۔۔۔بغیر کسی کو بتائے، چپکے سے واپس آ گئے۔ اور یہاں سے یہ نہایت اہم اطلاع بھیجی کہ وہ پجاری جو رانی گھاٹ کے مندر کے چبوترے پر بیٹھ کر شام کو اکتارا بجایا کرتا تھا وہ مر گیا۔ "ہاں؟" ساجد نے کہا۔ اس کا چہرہ مندر کی طرف نہیں، ڈوبتے ہوئے سورج کی جانب تھا۔

وہ واپس جانے کے لیے مڑے تو ایک شخص نے، جو مندر سے کچھ قدم آگے، ریت کے ایک ٹیلے کی آڑ میں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا، اور جس کا گھٹا سر اور چوڑی، لمبی چٹیا ٹیلے کے اوپر سے جھانک رہی تھی، کھڑے ہو کر اپنے کان میں لپٹا ہوا دھاگا اتارا۔

"یہ اس نے اپنے کان میں کیا لپیٹ رکھا تھا؟" شاہد نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے

Scanned with CamScanner

پوچھا۔

"جینیو! برہمن پہنتے ہیں۔ اور ایسے موقعوں پر کان میں لپیٹ لیتے ہیں۔" ساجد نے سوچا۔ یہ پوچھے گا، کیوں؟ لیکن شاید چپ رہا۔ "طہارت کی خاطر۔ عقیدے کی بات ہے! پرانے ایران کے فائر ورشپرز، آگ کی پوجا کرنے والے بھی ایسا ہی دھاگا پہنا کرتے تھے۔ اسے زُنّار کہتے تھے۔ سویرے سورج کی پوجا کرتے تھے تو زنّار کو دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے کر، دونوں انگوٹھوں کے بیچ میں لے کر، جیسے ہندو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں۔ ان کی اس پوجا کو نماشت کہتے تھے۔ جب بعد میں ایران میں اسلام پھیلا تو یہی نماشت بگڑ کر لفظ "نماز" بن گیا۔ نماز، جائے نماز، روزہ نماز، یہ سب فارسی کے لفظ ہیں، عربی کے نہیں۔" اب وہ آخری سیڑھی پر تھے۔ ساجد نے کہا، "اور خدا بھی! یہ بھی ایک قدیم ایرانی لفظ کی موجودہ شکل ہے۔"

ساجد کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا نیند آ رہی ہے۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے؟ زیادہ سے زیادہ گھنٹا سوا گھنٹا اور۔ اس نے کوشش کر کے آنکھیں کھولیں مگر پپوٹے پھر بھاری ہونے لگے۔ وہ نیند کے غلبے اور نہ سونے کے ارادے کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا۔

"اس محلے کا نام کازی خانہ ہے۔" ساجد نے کہا۔ "اور اس گھر میں..." اس نے دائیں ہاتھ ایک مکان کی جانب اشارہ کیا، "کسی زمانے میں میرا بہت آنا جانا تھا۔" بڑا سا برآمدہ، لوہے کے کھمبے، ہرے رنگے ہوئے۔ دو دروازے۔ ایک بڑا، ایک چھوٹا۔ وہ بھی ہرے۔ برآمدے میں دھول کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ مکان کے سامنے نالی بہہ رہی تھی۔ مکان سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ سپید پُتی ہوئی۔ "پتا نہیں اب کون رہتا ہے۔ اس زمانے میں ایک زمیندار صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کی بیوی اور امی جان کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ میں انھیں خالہ کہتا تھا۔ خالہ بی! ان کی ایک بیٹی تھی۔ انجم۔ علی گڑھ میں پڑھتی تھی۔ میں اسے آپا کہتا تھا۔ بےچاری کا انتقال ہو گیا۔"

"انجم کا؟"

"نہیں۔ زمیندار صاحب کی بیوی کا۔ اور انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی آپا سے زیادہ سے زیادہ چھ سات سال بڑی تھیں۔ آپا تب سے بُجھی بُجھی سی رہنے لگی تھیں۔ پھر ان کی شادی ہو گئی۔ لکھنؤ میں۔ کسی رشتے دار سے۔"

آپا گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھیں اور میرا زمیندار صاحب کے ہاں پھر آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ اور اس دن میں ان کی چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا کہ نیچے سے آپا کی آواز آئی۔ ساجد۔ جی آپا۔ زرا یہاں آنا۔ اور میں جلدی سے پتنگ اتار کر اور ڈور کو ہچکی پر

چڑھائے بغیر نیچے آیا۔ آپا صحن میں نہیں تھیں۔ بُوا نصیبن باورچی خانے میں مٹی کے کونڈے میں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ انھوں نے سَنے ہوئے ہاتھ سے آپا کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اور میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ڈھیلے پاجامے میں ازاربند ڈال رہی ہیں اور ایک چُنا ہوا دوپٹا کنڈلی مارے پلنگ پر پڑا ہوا ہے اور پاس ہی دھلا ہوا کلف لگا کرتا اور ایک تولیہ رکھی ہوئی ہے جس کی تہہ میں سے ایک گلابی فیتہ جھانک رہا ہے۔ جی آپا؟ میں جاکر آپا کے بالکل پاس کھڑا ہو گیا۔ ان کے بدن سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ مجھے ان کے پسینے کی بو بہت اچھی لگتی تھی۔ میرا ایک کام کر دو گے میرے اچھے بھیا؟ بس حکم کی دیر ہے۔ وہ ہنسی تھیں۔ شریر کہیں کا! اور انھوں نے مجھے اپنے بدن سے لگا لیا تھا۔ ارے اتنا لمبا ہو گیا ہے میرا بھیا۔ میرا سر ان کے سینے کو چھو رہا تھا۔ اور آپا نے میز پر پڑا ہوا بٹوا اٹھایا تھا اور اس میں ایک چونّی نکال کر مجھے دی تھی، اور جلدی سے ایک نظر کھلے دروازے پر ڈال کر جس میں سے صحن نظر آ رہا تھا، آہستہ سے کہا تھا، مجھے ایک بلیڈ لا دو دوڑ کے۔ اور میں اچھا کہہ کر دروازے کی طرف لپکا تھا مگر فوراً پلٹ کر میں نے چونّی میز پر رکھ دی تھی۔ میرے پاس ہیں پیسے۔ واہ! بہنیں کہیں چھوٹے بھائیوں کے پیسے خرچ کرواتی ہیں؟ تو پھر جائیے ہم نہیں لاتے۔ اور انھوں نے کہا تھا، بری بات! ضد نہیں کرتے۔ اور میں نے کہا تھا، اوں ہنہ۔ اور انھوں نے کہا تھا، اچھا بابا۔ مگر جلدی آنا۔ اور دیکھو، ان کا منھ میرے کان کے بالکل پاس آ گیا تھا۔ کسی کو بتانا نہیں۔ میں کتنا خوش تھا کہ آپا نے مجھے اپنا رازدار بنایا۔ اور میں دوڑتا ہوا گیا تھا اور دوڑتا ہوا واپس آیا تھا۔ اور میں نے آپا کو بلیڈ ایسے چھپا کے دیا تھا کہ رازداری کا حق ادا ہو گیا تھا۔ اور جب آپا کرتا پاجامہ اور تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلی گئی تھیں تب مجھے خیال آیا تھا کہ آپا بلیڈ کا کیا کریں گی۔

"کیا یہ لوگ بھی پاکستان چلے گئے تھے؟"

"نہیں۔ سنا تھا کہ گھر بیچ کر بیٹے کے پاس اٹاوے چلے گئے ہیں۔" ساجد نے مڑ کر مکان پر ایک آخری نظر ڈالی۔ "پکّے مسلم لیگی تھے۔"

جاڑوں کے دن۔ سہ پہر کا وقت۔ میں شاید نویں کلاس میں تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا حالاں کہ عموماً کھلا ہوتا تھا۔ کھٹکھٹایا۔ زمیندار صاحب کی دوسری بیوی نے کھولا تھا۔ آج کیسے راستا بھول گئے؟ امی جان نے کہا تھا پوچھتے آنا، آپا کب آ رہی ہیں۔ وہ نہیں آ رہیں۔ خط آیا ہے۔ لکھا ہے فائنل کی تیاری کرنا ہے۔ ان چھٹیوں میں نہیں آ سکوں گی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ خالو کہاں ہیں؟ اٹاوے گئے ہیں۔ اور انھوں نے خود ہی بتایا تھا کہ سلام بابا کو ساتھ لے گئے ہیں اور نصیبن بوا باتن سے ملنے ہاتھی خانے گئی ہیں اور کہہ گئی ہیں چراغ

جلے سے پہلے نہیں لوٹوں گی۔ چنے کی دال کا حلوہ بنا ہے۔ کھاؤ گے؟ اور میں نے جی کہا تھا تو انھوں نے کہا تھا، نہا لوں۔ پھر دوں گی گرم کر کے۔ اور انھوں نے گرم پانی سے بھری بالٹی اٹھائی تھی تو میں نے جھپٹ کر بالٹی ان کے ہاتھ سے لے لی تھی، اور لے جا کر غسل خانے میں رکھ دی تھی۔ اور وہ میرے پیچھے پیچھے غسل خانے میں آئی تھیں۔ تنگ پاجامہ کرتا پہنے۔ دوپٹا غائب۔ اور میں غسل خانے سے باہر آ رہا تھا تو ان سے رگڑ کھا گیا تھا۔ اور انھوں نے کہا تھا، دیکھ کے چلو میاں۔ میں شرما گیا تھا اور وہ مسکرائی تھیں۔ اور میں نے اپنے کمرے میں جا کر کوٹ کی جیب سے بازاری حسینہ نکالی تھی جس پر اخباری کاغذ چڑھا ہوا تھا اور ان کے بستر پر لیٹ کر مڑے ہوئے صفحے سے پڑھنے لگا تھا۔ اور پھر کھلے ہوئے دروازے میں سے چھل چھل کی آواز آنی شروع ہوئی تھی جسے میں کچھ دیر کان لگا کر سنتا رہا تھا۔ اور پھر میں نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا تھا اور مسہری کے پاس پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ کر بستر پر اوندھے منھ پڑی بازاری حسینہ پھر اٹھا لی تھی۔ مگر چند سطریں پڑھنے کے بعد میں نے بازاری حسینہ کو پھر بستر پر اوندھا لٹا دیا تھا اور بھڑے ہوئے دروازے کو تکنے لگا تھا۔ اور پھر میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا اور کھلے دروازے میں کھڑا کچھ دیر غسل خانے کے کواڑ کو دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر چوروں کی طرح دبے قدموں کواڑ کی طرف بڑھا تھا اور جھک کر کواڑ کی ایک درز میں سے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔ اور دیکھا تھا کہ زمیندار صاحب کی دوسری بیوی لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کا دایاں ہاتھ اٹھا ہوا ہے اور اٹھے ہوئے ہاتھ میں تانبے کا ایک قلعی کیا ہوا لوٹا ہے اور لوٹے کی ٹونٹی میں سے پانی ان کے بالوں پر گر رہا ہے اور ان کے ملگجے اندھیرے میں چمکتے ہوئے اعضا پر سے پھسلتا ہوا نیچے آ رہا ہے اور ان کی آنکھیں بند ہیں اور ان کا منھ تھوڑا سا اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے اور تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔ اور پھر لوٹے کا پانی ختم ہو گیا اور انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور میں سیدھا ہو کر تیزی سے لوٹا۔ اور پیچھے سے آواز آئی، کون ہے؟ مگر میں واپس اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا اور جلدی سے، مگر آہستہ سے، دروازہ بھیڑ کر کرسی پر بیٹھ کر بازاری حسینہ اٹھا کر اس سے اپنا چہرہ چھپا چکا تھا۔ اور میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میں سہما ہوا تھا۔ مگر میرا جی چاہ رہا تھا کہ پھر غسل خانے میں جھانک کر دیکھوں۔ پھر دروازے کے اُدھر سے آواز آئی تھی، ساجد! اور میری جی کے جواب میں دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر آئی تھیں۔ اور میں نے کتاب کے اوپر سے ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا تھا کہ وہ کندھوں سے گھٹنوں کے نیچے تک ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھیں جو جگہ جگہ سے بھیگی ہوئی تھی۔ اور جہاں جہاں بھیگی ہوئی تھی وہاں ان کے بھرے بھرے بدن سے چپکی ہوئی تھی اور ان کی سڈول پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور سارا کمرہ ایک مہک سے بھر گیا تھا جو شاید ان کے بدن سے آ رہی تھی۔ اور انھوں نے کہا تھا، کپڑے پہن لوں، پھر دیتی ہوں۔ اور اچھا کہہ کر اور کتاب بند کر کے

میں جگہ جگہ سے بھیگی چادر کو صحن پار کر کے دالان میں داخل ہوتے اور پھر دالان کے پیچھے جو کمرہ تھا اس میں غائب ہوتے دیکھتا رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب باورچی خانے میں سے کھٹر پٹر کی آواز آنی شروع ہوئی تھی تو میں نے بازاری حسینہ کو بند کر کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا اور چپکے سے باہر جانے کے ارادے سے اٹھا تھا۔ لیکن عین اس وقت زمیندار صاحب کی دوسری بیوی نے مجھے آواز دے کر بلایا تھا کہ آؤ ساجد میاں، حلوہ گرم ہو گیا۔ اور قدم باورچی خانے کی طرف مڑ گئے تھے حالانکہ حلوہ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ انھوں نے کہا تھا بیٹھو اور میں ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور انھوں نے ایک سینی میں رکھ کر حلوے کی طشتری میری طرف بڑھائی تھی اور میں نے ایک چمچا بھر کر منہ میں ڈال لیا تھا۔ حلوہ بہت گرم تھا۔ میں جلدی سے نگل گیا تھا۔ اور انھوں نے کہا تھا جلدی کاہے کی ہے، ٹھنڈا کر کے کھاؤ۔ اور وہ منھ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تھیں اور پھر انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا گال آہستہ سے تھپتھپایا تھا۔ اور دوسرا چمچا میں نے دو تین بار پھونک مار کر کھایا تھا۔ اور وہ ابھی آئی کہہ کر یکایک صحن پار کر کے باہر کی ڈیوڑھی کی طرف چلی گئی تھیں۔ اور واپس آئی تھیں تو میں پیڑھی چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اور انھوں نے طشتری میں پڑے ہوئے حلوے پر ایک نظر ڈال کر پوچھا تھا، کیوں؟ اچھا نہیں بنا کیا؟ اور میرے منھ میں جو آیا تھا میں نے وہ کہہ دیا تھا۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ پھر کھا لوں گا کسی دن۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اور پھر میری کلائی پکڑ کر کہا تھا، آؤ میرے پاس سردرد کی ایک بہت اچھی دوا ہے۔ اور میں اپنی مرضی سے اور اپنی مرضی کے خلاف زمیندار صاحب کی دوسری بیوی کے ساتھ صحن پار کر کے دالان میں سے ہوتا ہوا اس اندھیرے میں داخل ہو گیا تھا جس میں دس پندرہ منٹ پہلے میں نے جگہ جگہ سے بھیگی چادر کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اور انھوں نے میری کلائی چھوڑ کر سامنے کی دیوار میں بنی ایک چھوٹی سی الماری کھول کر اس میں سے اوری اینٹل بام کی ایک شیشی نکالی تھی اور مجھ سے کہا تھا، لیٹ جاؤ۔ اور میں بستر پر لیٹ گیا تھا جس کے سرہانے رکھے ہوئے تکیے کے غلاف پر ہری بیل کے بیچ میں لال گلاب کڑھا ہوا تھا اور جس کے پینتیانے چھپا ہوا ریشمی لحاف تہہ کیا رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ جی میرا یہ چاہ رہا تھا کہ بھاگوں اور جاکر سڑک پر دم لوں۔ وہ آہستہ سے ہنسی تھیں۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے ساجد میاں؟ کوٹ تو اتارو۔ اور میں نے کوٹ اتار دیا تھا اور وہ بستر پر سرہانے کی طرف میرے سر کے پاس بیٹھ کر اور مجھ پر تھوڑا سا جھک کر میرے ماتھے پر بام ملنے لگی تھیں۔ کیا پڑھ رہے تھے؟ کورس کی ایک کتاب۔ اور میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا کہ کوٹ ویسے کا ویسا تہہ کیا ہوا پاس ہی ایک کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ اتنا مت پڑھا کرو۔ زیادہ پڑھنے سے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب مجھے اپنی پیشانی اور کنپٹیوں پر ان کی نرم، چکنی انگلیوں کا لمس بھلا لگ رہا تھا اور میری

Scanned with CamScanner

آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور ان کے کپڑوں سے مٹی کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ انھوں نے پوچھا تھا، کچھ فرق پڑا۔ اور میں نے جی اب بالکل نہیں ہو رہا کہہ کر ان کی کانچ کی چوڑیوں سے بھری کلائی پکڑ کر ان کا ہاتھ اپنی پیشانی پر سے ہٹا دیا تھا۔ اور انھوں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی زرا بھی کوشش نہیں کی تھی بلکہ میں نے خود بہت اچھا بام ہے کہہ کر ان کی کلائی چھوڑ دی تھی۔ لیکن جب اٹھنے لگا تھا تو انھوں نے وہی ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے پھر لٹا دیا تھا اور کہا تھا، تھوڑی دیر آرام کر لو پھر چلے جانا۔ اور انھوں نے مسہری پر سے اتر کر دروازے کے پٹ ایک دوسرے سے بھڑا دیے تھے اور کمرے میں بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ سر میں درد ہو تو روشنی بری لگتی ہے آنکھوں کو۔ اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں بھی کمر سیدھی کر لوں تھوڑی دیر۔ اور وہ اسی بستر پر لیٹ گئی تھیں اور انھوں نے تہہ کیا ہوا لحاف کھول کر اپنے اور میرے اوپر کمر تک کھینچ لیا تھا۔ حالاں کہ کمرے میں اس مسہری سے تین چار گز کے فاصلے پر ایک اور مسہری بھی تھی۔ اور مجھے ایسا لگا تھا جیسے بجلی کی ایک لہر ان کے بدن سے نکل کر میرے جسم میں داخل ہو گئی ہے۔ اور مجھے وہ خواب یاد آ گیا تھا جو دو تین دن ہوئے میں نے دیکھا تھا اور جس میں میں نابینا وکیل صاحب کے گھر کے نیم کے ساتھاں اور اونچے، گول اور بہت چکنے کھمبوں میں سے ایک پر چڑھتا پھسلتا کسی نہ کسی طرح بالکل اوپر پہنچ گیا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ پھسلوں نا، ویسے ہی کھمبے سے چپکا رہوں۔ کہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی شے میرے سارے جسم سے کھنچ کر ایک نقطے پر جمع ہو گئی ہے اور ابھی بندوق کی نال سے گولی کی طرح نکلے گی۔ اس خواب کی لذت اتنی تکلیف دہ تھی کہ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ویسی ہی تکلیف دہ لذت نے اس وقت بھی مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ کروٹ بدلنا چاہا، نہیں بدلی گئی۔ کھسکنا چاہا، نہیں کھسکا گیا۔ اٹھ کر بیٹھنا چاہا، نہیں اٹھا گیا۔ چلانا چاہا، آواز نہیں نکلی۔ ایک ڈراونا خواب میں نے باربار دیکھا تھا کہ کسی بہت اونچی چھت کی منڈیر پر کھڑا ہوں کہ پیر پھسل جاتا ہے اور میں گرتا ہوں اور گرتا چلا جاتا ہوں گرتا چلا جاتا ہوں مگر گر نہیں چکتا۔ چیخنا چاہتا ہوں پر آواز نہیں نکلتی۔ بالآخر میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں بستر پر چت لیٹا جلدی جلدی سانسیں لے رہا ہوتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کیسے میں شکنجے سے آزاد ہوا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو مسہری کے پاس کھڑا جلدی جلدی سانسیں لیتا پایا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحے کرسی پر تہہ کر کے رکھا ہوا کوٹ اٹھا کر اور بھڑا ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر تھا۔ اور پھر صحن، ڈیوڑھی اور باہر کا دروازہ اور اس کی چٹخنی۔ اور میں نے سڑک پر جا کر دم لیا تھا۔ اور تب مجھے یاد آیا تھا کہ جس وقت میں گھر میں داخل ہوا تھا اس وقت نہ میں نے نہ انھوں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ اور میں نے کوٹ پہننے کے بعد جیب ٹٹول کر اطمینان کر لیا تھا کہ بازاری حسینہ اس میں ہے۔ اور جب میں چلنے

لگا تھا تو میری نظر مکان کے اوپر لہراتے ہوئے ہرے جھنڈے پر پڑی تھی اور سپید مسجد سے عصر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تھی۔

ٹرین کے پبلک ایڈریس سسٹم پر کسی بھجن کا ٹیپ بجنا شروع ہوا تو ساجد نے سوچا کہ شاید اب پاکستان کی ٹرینوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ حمد یا نعت سے سفر کا آغاز۔ حمد یا نعت پر سفر ختم۔ اس نے حافظے پر زور ڈالا، مگر اسے کسی حمد یا نعت کا کوئی شعر یاد نہیں آیا، سوائے دو ایک نعتیہ اشعار کے جو جمعرات کو فقیر گلی گلی گایا کرتے تھے۔ ساجد کو میلاد کے خاتمے پر گا کر پڑھے جانے والے دو ایک سلام بھی یاد آئے۔ مگر اسے تو ایسے اشعار کی تلاش تھی جن کا ادبی مقام اور رتبہ بھی ہو۔ اسے تعجب ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو میں ادبی اہمیت کی کوئی حمد یا نعت موجود ہو اور مجھے اس کا قطعاً علم نہ ہو۔ استعجاب انکشاف میں بدل گیا۔ یعنی اردو کا سارا نہیں تو بیشتر اعلا شعری سرمایہ سیکولر ہے! مرثیے، قصیدہ لامیہ، "مدوجزرِ اسلام"، "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"۔ وہ ورق پر ورق الٹتا چلا گیا۔ ٹرین کی رفتار دھیمی پڑ رہی تھی۔ ساجد نے جلدی سے فیصلہ کیا کہ اسے اپنی رائے بدلنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن عین اس وقت اس کا حافظہ اچانک حالی کی مناجات کی طرف مڑا اور اسے مطلع یاد آیا۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

وہ مسکرایا۔ حالی بھی کمال کے شاعر تھے۔ ان کی بہت سی قومی اور ملّی شاعری کی مانند یہ شعر آج بھی اتنا ہی برمحل ہے جتنا سو سوا سو سال پہلے تھا۔

ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ عورت اب سامنے والی سیٹ پر پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر اجالا ہو چکا تھا۔ اس نے کھڑے ہوکر شاہد کا کاندھا ہلایا۔

"جی؟"

"اٹھو! الہ آباد آ رہا ہے۔"

اور جب ساجد نے برتھ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگائی تو اس مغرور شعر نے جو اتنی دیر سے اس کے حافظے کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا، اپنے آپ کو اس کے ذہن کے حوالے کر دیا۔

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

مگر اس کی آنکھوں میں صرف جلن تھی۔ بےخوابی کی جلن۔

Scanned with CamScanner

نیّر مسعود

جانوس

The world, unfortunately, is real.
- Jorge Luis Borges

خرمنے بود مرا، سوختم، اکنوں چہ کنم
.. طالب علی خاں عیشی

آندھی کے آثار تھے۔ دور شمال کی طرف آسمان زیادہ تاریک ہو گیا تھا اور فضا میں بلکی سنسناہٹ تھی۔ ہوا کی رفتار تیز ہو چکی تھی لیکی ابھی اس میں ناہمواری نہیں آئی تھی۔

اُس رات بھی مجھ کو نیند نہیں آ رہی تھی مگر میں نے بستر پر لیٹ کر بجلی بُجھا دی۔ کمرے کا مشرقی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں باہر سے زیادہ اندھیرا تھا، اس لیے باہر کا اندھیرا کمرے کے اندر روشنی -- بہت مدّھم، مگر روشنی -- کی طرح داخل ہو رہا تھا۔ میری چوتھی کروٹ نے پھر میرا منھ مشرقی دروازے کی طرف کر دیا۔ دروازے سے دو قدم آگے کھلے آسمان کے نیچے میرا قدآور کتّا بُت بنا بیٹھا تھا۔ میں دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آندھی کے آثار شروع ہوتے ہی کتّے کے کان رہ رہ کر پھڑکنے لگے تھے۔ وہ عام کتوں سے بہت بڑا تھا۔ مجھ کو یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ دو سال پہلے میں اسی کتے کو اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ کر لایا تھا۔

"ہاؤنڈ!" میں نے آہستہ سے کتے کو پکارا۔

کتے نے بیٹھے بیٹھے دو تین مرتبہ دُم ہلائی۔

"ہاؤنڈ!"

کتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی جگہ پر کئی چکر کاٹے، پھر ذرا آگے بڑھ کر دروازے سے اپنا بدن رگڑنے لگا۔ اسے کمرے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

"بیٹھ جاؤ، شاباش!"

کتے نے پھر دو تین چکر کاٹے اور اس بار دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھ کو اپنا کمرا بہت محفوظ معلوم ہونے لگا اور اب میری آنکھوں پر نیند کی پہلی باریک جھلّی سی منڈھ گئی۔ میں نے داہنی کروٹ لے کر دروازے کی طرف پیٹھ کر لی۔ سر کے نیچے سے ہاتھ ہٹا لیا اور میرے خیالات بےربط ہو گئے۔ یہ نیند کی علامت تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور

rekhta

Scanned with CamScanner

بند کر لیں۔ لیکن جب میرے خیالوں کی بیربطی مہملیت کی حد کو پہنچ چکی تھی اور یہ مہمل خیال بھی مجھے اپنے ذہن کے اندھیرے میں ڈوبتے معلوم ہو رہے تھے، اُس وقت مجھ کو آندھی کی آواز بہت قریب سنائی دی۔

آندھی آ رہی ہے، میں نے سوچا۔ پھر یہ خیال بھی واہیات ہوتا ہوا ڈوب رہا تھا کہ میری پشت پر کتا گرج دار آواز میں بھونکا۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں اور ذہن اور جسم پر سے کھالیں سی کھینچ لی گئی ہوں۔ میں نے تڑپ کر دروازے کی طرف کروٹ لی۔ مجھ کو کتّے پر غصہ آ گیا تھا، لیکن کتا اب اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ بھونکتا ہوا نیچے جا رہا تھا اور اس کی زینہ بہ زینہ اترتی ہوئی آواز سے ظاہر تھا کہ اُسے کوئی آہٹ ملی ہے اور وہ سیدھا اس آہٹ کی طرف جا رہا ہے۔ اسی وقت کھلے ہوئے دروازے کے باہر غبار کی ایک چادر سی گری اور باہر کا اندھیرا بھی گہرا ہونے لگا۔

"ہوا۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "لیکن میں عناصر سے مرعوب نہیں ہوں۔" نیچے سے پھر کتے کی آواز آئی لیکن اس بار اس کی آواز پھٹی ہوئی سی تھی اور اس میں اس کی مخصوص بُوک بھی شامل تھی۔

اس نے کچھ دیکھ لیا ہے، میں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ آندھی نے غرّاہٹ کے ساتھ کمرے کے شمالی دروازے پر ٹکر ماری اور دروازے کے اوپر والا روشنی دان کھل گیا۔ کچھ سوکھے پتّے روشنی دان سے داخل ہو کر کمرےکی جنوبی دیوار سے ٹکرائے اور ہلکی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دیوار سے گھسٹتے ہوئے نیچے فرش پر آ گرے۔ ان سب آوازوں پر کتے کی آواز حاوی تھی۔ وہ لگاتار بھونک رہا تھا اور ہر بار اس کی بُوک زیادہ لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوا سے لڑ رہا ہے، لیکن اچانک مجھے شبہ ہوا کہ میں نے ایک انسانی آواز بھی سنی ہے۔ کتے کی آواز اور تیز ہو گئی۔ میں نے کانوں پر زور دیا۔ شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک گھٹی گھٹی سی لیکن بھاری آواز کتے کو چپ کرانا چاہ رہی تھی۔

میں بستر سے کود پڑا۔ میں بلڈ ہاؤنڈ کی مضرّتوں سے واقف تھا۔ اس وقت آنے والا کوئی ہو سکتا ہے، میں نے یہ نہیں سوچا، اس لیے کہ نیچے جو کوئی بھی تھا اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ مجھ کو ابھی ابھی یاد آیا تھا کہ میں نے آج برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند نہیں کیا ہے اور چمنی کے باہر کھلنے والا سلاخوں‌دار پھاٹک بھی ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ میں نے باؤں سے اپنی چپّلیں ٹٹولیں اور پیروں کو ان میں پھنساتا ہوا تیزی سے زینے اترنے لگا۔

"باؤنڈ!" میں زور سے چیخا، "نہیں، باؤنڈ!"

نیچے برآمدے میں پہنچ کر میں نے پھر کتے کو آواز دی۔ پھاٹک سامنے نظر آ رہا تھا۔ کسی نے اسے بند کر دیا تھا۔ آندھی ابھی زمین کی طرف نہیں جھکی تھی اور اوپر کے مقابلے میں یہاں ہوا کا زور کم تھا، پھر بھی چمنی کے درخت بار بار جھک رہے تھے اور ہوا کی کئی شاخوں میں الجھ رہی تھی۔ پھاٹک کے باہر قدرے بہت روشنی تھی، اس لیے کہ سامنے حاجی زین

الدین کی کوٹھی کے احاطے میں اسی پہلے تیز دودھیا روشنی کا بلب لگایا گیا تھا۔ پھاٹک کی سلاخوں کے سائے لمبے ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان سیاہ دھاریوں کے بیچ میں کتا پچھلی ٹانگوں سے مٹی اڑا اڑا کر مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو تین چھلانگوں میں وہ میرے پاس پہنچ گیا اور میرے گرد چند چکر کاٹ کر پھر واپس جانے لگا، لیکن میں نے بڑھ کر اس کا پٹّا پکڑ لیا۔

"کون ہے؟" میں نے پکار کر پوچھا۔ میری نظریں پھاٹک کے باہر جمی ہوئی تھیں۔ کتا پھاٹک کی طرف جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کچھ دور تک اس کے ساتھ آگے بڑھا۔

"کون صاحب ہیں؟" برآمدے اور پھاٹک کے درمیان رک کر میں نے پھر پکارا۔ لیکن پھاٹک کے باہر کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی میں پھاٹک تک گیا اور کچھ دیر تک اس کی سلاخوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر میں کتے کی طرف مڑا۔

"آؤ دوست، واپس چلیں،" میں نے کتے سے کہا، "کوئی آیا ضرور تھا مگر تمھاری وجہ سے پھاٹک بند کر کے چلا گیا۔"

میں کتے کو پکڑے برآمدے کی طرف واپس ہونے لگا۔ بائیں ہاتھ کے درخت کی شاخوں سے تازہ پتّے زمین پر گر کر ناچ رہے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پتلے تنے والا درخت بہت اونچا تھا اور اس کی چوٹی ہوا کی زد میں تھی۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں آندھی اس کو نقصان نہ پہنچا دے، پھر مجھے خیال آیا کہ ایسی آندھیاں سال میں کئی مرتبہ آتی ہیں اور درخت انھیں جھیل لے جاتا ہے۔

زمین پر پتے اِدھر اُدھر دوڑے اور میں نے برآمدے کی طرف قدم بڑھایا، لیکن مجھے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔ زمین پر پھاٹک کی سیاہ دھاریوں کے درمیان ایک نیا سایہ نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے کتے کے پٹّے پر گرفت مضبوط کر لی اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ باہر پھاٹک کی سلاخوں سے لگا ہوا کوئی کھڑا تھا۔ پیچھے سے پڑتی ہوئی تیز روشنی میں وہ خود بھی کوئی پرچھائیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان سنبھالے ہوئے تھا اور ایک ایسا سیاہ مجسّمہ نظر آتا تھا جس کی کمر سینے سے دوگنی چوڑی ہو۔

"کون؟" میں نے اپنی جگہ سے ہٹے بغیر پوچھا، اور کتے کا پٹّا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کتا بھونکتا ہوا پھاٹک کی طرف جھپٹا۔ مجسمہ تیزی سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر پھر کتے کا پٹّا پکڑ لیا۔

"کون صاحب ہیں؟" میں نے پھر پکار کر پوچھا۔ لیکن جواب ملنے سے پہلے ہی آندھی زمین پر جھک آئی۔ پھاٹک کے باہر کی بھربھری مٹی پر ہوا کا پہلا طمانچہ پڑا۔ غبار کا ایک بھنور سا اٹھا اور مجسمہ اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اِدھر اُدھر سے کئی بگولے دوڑتے ہوئے آئے اور اس بھنور کے ساتھ مل کر ناچنے لگے۔ ہوا ناہموار ہو چکی تھی۔ ایک اور جھونکے نے

Scanned with CamScanner

غبار کو سامنے سے ہٹایا تو مجسمہ پھاٹک سے لگا نظر آیا۔ اس کے بال لمبے تھے اور ہوا سے اڑ رہے تھے۔

"کون صاحب ہیں؟" میں نے ہاتھ بڑھا کر پھاٹک تھوڑا سا کھول دیا۔ "اندر آ جائیے۔"

مگر پھاٹک کھلتے ہی مجسمہ پھر بھڑک کر پیچھے ہٹ چکا تھا، اور اب آندھی کا شور اتنا تھا کہ مجھ کو خود اپنی آواز مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔

"اندر کیوں نہیں آتے؟" میں نے چیخ کر کہا، اور اس بار مجھ کو جواب بھی ملا۔

"کتے کو روکے رہیے۔"

"کتا نہیں بولے گا، اندر آ جائیے۔"

میں کتے کو پکڑے پکڑے برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ زمین پر پھاٹک کی سیاہ دھاریوں کے درمیانی فاصلے کم ہو گئے۔ میری پشت پر نووارد آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں ٹھہر گیا۔ اب نووارد میرے برابر آ چکا تھا۔ حاجی زین الدین کے یہاں کی روشنی برآمدے تک آتے آتے پھیکی پڑ گئی تھی، مگر یہ پھیکی روشنی بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ آنے والا بہت خستہ حال شخص ہے۔ اس کا لباس تک سالم نہیں تھا۔ اس کا رنگ اتنا کالا تھا کہ برآمدے کی مدھم روشنی میں اس کے ناک نقشے کا ٹھیک پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسّی سے لپٹا ہوا ایک بستر تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کا کنستر جس میں کبھی بناسپتی گھی رہا ہو گا لیکی اب ٹین کا کنارےدار ڈھکنا اور کنڈی لگا کر اس کو زیادہ کارآمد بنا لیا گیا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی نظریں کتے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کہاں سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کاٹے گا تو نہیں؟"

"نہیں۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب سے ملنا تھا۔"

"میں ہی ہوں۔"

اب اس نے مجھ کو سلام کیا۔ سلام کا انداز شائستگی سے خالی نہیں تھا۔

"حضور ڈاکٹر صاحب،" اس نے زرا رک کر کہا، "مجھے جان محمد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"جان محمد؟"

"جو پارسال آپ کے دواخانے میں نوکر تھا۔ مجھے وہ کان پور میں ملا تھا۔"

"جان محمد کان پور میں کیا کر رہا ہے؟ آؤ، اندر آ جاؤ۔"

میں نے برآمدے سے ملحق ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر بلب روشنی کر دیا۔

"ہوٹل میں نوکر ہے،" نووارد دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

بجلی کی تیز روشنی میں وہ اور زیادہ خستہ حال معلوم ہو رہا تھا، اور ڈرائنگ روم کی آرائش نے اس کی شکستگی کو اس قدر نمایاں کر دیا تھا کہ میں اس سے سوفے پر بیٹھنے کو کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے پائجامے کی مُہریاں کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں اور قمیص کی آستینیں گھس گئی تھیں۔ اس کے بالوں کے لچھّے کندھوں سے کچھ اوپر جھول رہے تھے۔ چھوٹی مگر گھنی داڑھی اس کی سیاہ جلد میں مل کر اس کے چہرے کو اور بڑا دکھا رہی تھی۔ چوڑی ہڈی اور لمبے قد کا وہ خستہ حال آدمی یقیناً مرعوب کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے گفتگو کا سلسلہ جوڑا:

"جان محمد نے آپ کو سلام کہا ہے اور بغیر کہے نوکری چھوڑ دینے کی معافی مانگی ہے۔ حضور ڈاکٹر صاحب، وہ آدمی بُرا نہیں ہے۔ آپ کے تیس رُپے اس پر نکلتے تھے، وہ اس نے میرے ہاتھ بھجوائے ہیں۔" اس نے پائجامے کے نیفے میں سے ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے نوٹ نکال کر مجھ کو دے دیے۔ "اس نے کہا تھا لکھنؤ پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب کو رُپے دے دینا۔ اسی لیے ناوقت آپ کو تکلیف دی۔"

مجھ کو جان محمد کی ایمان داری پر زرا حیرت ہوئی۔

"حضور، کتّے کو روک لیں تو میں چلا جاؤں۔"

"ابھی آندھی تیز ہے، کچھ دیر بیٹھ جاؤ،" میں نے سوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"حضور کو زحمت ہو رہی ہو گی۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں،" میں نے اسے پھر سوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نووارد کچھ دیر ہچکچانے کے بعد بڑے سوفے کے سرے سے ٹک گیا۔ اس کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس نے بستر اپنے زانوؤں پر اور کنستر سامنے جُوٹ کی چٹائی پر رکھا اور پہلی بار کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس شخص میں کوئی بات تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"تم جان محمد کو کیوں‌کر جانتے ہو؟"

"ہم دونوں ایک ہی ہوٹل میں کام کرتے تھے۔"

"تم بھی ہوٹل میں کام کرتے ہو؟"

"اب الگ ہو گیا ہوں۔"

"اب کیا کرتے ہو؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس کی گردن جھک گئی اور آواز دھیمی ہو گئی۔

"جان محمد نے کہا تھا اپنے لیے بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا، وہ کوئی کام ضرور دِلوا دیں گے۔"

"کان پور سے چلے کیوں آئے؟"

"دل نہیں لگا۔"

Scanned with CamScanner

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یہیں لکھنؤ کا۔ سات برس باہر رہا، لیکی حضور ڈاکٹر صاحب، لکھنؤ والے کا اور کہیں دل بھی تو نہیں لگتا۔"

"یہاں تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"اب کہیں نہیں۔ خاندانی مکان لڑکپن ہی میں ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ والد صاحب کا انتقال آغا میر کی سرائے میں ہوا۔ والدہ مجھے لے کر نوریاگنج کے خیرات خانے میں اٹھ آئیں۔ وہ بھی گزر گئیں تو میں شہر چھوڑ کر نکل گیا۔"

یہاں پہنچ کر وہ سیاہ فام شخص اونگھ گیا۔ وہ کچھ اور بھی بڑبڑایا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا، البتہ "نواب سہراب کی حویلی" کے لفظ میرے کان میں پڑے اور میں نے پوچھا،

"نواب سہراب کی حویلی کیا؟"

"حضور ڈاکٹر صاحب،" نووارد نے ہوشیار ہو کر کہا، "نواب سہراب کی حویلی تو بہت بدل گئی۔"

"ہاں اس کو منظور صاحب نے خرید کر ٹھیک کروایا ہے۔"

"یہ منظور صاحب..." اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، "نواب ہیں؟ نواب منظورعلی خاں؟"

"نہیں،تاجر ہیں۔ منظور شاہ نام ہے۔"

"لکھنؤ ہی کے ہیں؟"

"مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔"

"کاہے کے تاجر ہیں؟"

"یہ بھی ٹھیک نہیں معلوم۔"

اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی اور باہر تیز ہوا کی ہلکی ہموار آواز سنائی دیتی رہی۔

"یہ نواب سہراب کی حویلی..." نووارد کہتے کہتے رکا، پھر بولا، "ہماری تھی۔"

میں نے ذرا حیرت سےاس کی طرف دیکھا۔

"پھر ہمارا وقت بگڑ گیا،" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "والد صاحب کی زندگی حویلی میں گزری مگر انتقال آغا میر کی سرائے میں ہوا۔ مجھے یاد بھی نہیں حویلی کے اندر کیا تھا۔ والدہ بتاتی تھیں..." یہ کہتے کہتے وہ پھر اونگھ گیا اور اس کا سر جھکنے لگا۔

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"حضور ڈاکٹر صاحب،" اس نے پھر ہوشیار ہو کر اپنا جھکتا ہوا سر اٹھایا، آندھی کا زور گھٹ گیا ہے۔ کتے کو روک لیجیے۔ کل جس وقت حکم دیجیے حاضر ہو جاؤں۔"

مجھ کو محسوس ہوا کہ اس کی بھاری آواز اچانک کھوکھلی سی ہو گئی ہے۔ مجھے یہ

بھی محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے نظریں چُرا رہا ہے اور مجھ کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر پریشان ہو رہا ہے۔

"حضور کی مہربانی سے کوئی کام مل جائے تو..." اس نے بستر کو دابتے ہاتھ میں دبایا، سامنے رکھے ہوئے کنستر کو بائیں ہاتھ سے اٹھا کر سوفے سے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکا۔ دوسری کوشش میں بھی نہ اٹھ سکا۔ آخر تیسری بار اس نے جھٹکے سے خود کو اٹھایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی جسے اس نے فوراً ہونٹ بھینچ کر روک لیا۔

اب میں نے دیکھا کہ اس شخص کا بدن کانپ رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی؟" اس نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

"تم کانپ رہے ہو۔"

"جی نہیں تو۔"

"بیٹھ جاؤ۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حضور ڈاکٹر صاحب، کتے کو روک لیجیے،" اس نے کسی ضدی بچے کی طرح کہا۔

پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے جانے دیا جائے۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر کتے کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ کتے نے فوراً تعمیل کی۔ میں نووارد کی طرف مڑا۔

"ٹھیک ہے،" میں نے کہا، "کل صبح نو بجے مطب میں آ جانا۔"

نووارد نے مجھ کو سلام کیا اور دروازے سے باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا، ایک نظر اوپر کے زینوں کی طرف دیکھا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ چند لمحوں میں اس کا سایہ بھی برآمدے سے غائب ہو گیا۔

میں نے بلب بجھانے کے لیے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ باہر ایک دھماکا سا ہوا، اور ابھی میں اس آواز کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ زینے پر سے کتے کی گرج سنائی دی اور اسی کے ساتھ کتا برآمدے سے اڑ کر چمن کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ میں فوراً باہر نکل کر برآمدے سے نیچے اتر آیا۔ سامنے پھاٹک کی سلاخوں کے سائے میرے قدموں تک آ رہے تھے اور مجھ سے دس پندرہ قدم آگے وہ شخص ایک سیاہ ڈھیر کی طرح زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے گرنے سے غبار کا ایک چھوٹا سا بادل اٹھا تھا جو ابھی تک اس پر منڈلا رہا تھا، اور حاجی زین الدین کے یہاں کی روشنی اس کی وجہ سے کچھ دُھندھلا گئی تھی۔ کتا خاموشی مگر بےقراری کے ساتھ اس بےحرکت پڑے ہوئے انسان کو ہر طرف سے سونگھ رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی کتا میری طرف لپکا، منہ سے کچھ باریک آوازیں نکالیں اور پھر اس جسم کی طرف دوڑ گیا۔ میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ ہم دونوں کے درمیان کئی چکر لگا چکا تھا۔

میں اس کے قریب پہنچ کر جھکا۔ وہ زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ بستر اس کے ہاتھ سے

Scanned with CamScanner

چھوٹ گیا تھا لیکن کنستر کا کنڈا ابھی تک اس کی انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ کنستر کا ڈھکنا کھل گیا تھا اور روشنی سیدھی اس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کنستر خالی تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے آدمی کا داہنا ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا اور اس کی مٹھی اس طرح بھنچی ہوئی تھی جیسے اس نے زمین کو پکڑ رکھا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ سمٹا اور بدی دو تین بار ہلا۔ اس نے کنستر کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے زمین پر زور دیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا سر اور کندھے دو بالشت اوپر اٹھ کر پھر زمین سے لگ گئے۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اور میں نے ایک گھٹنا جھکا کر اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ زرا سی کش مکش کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس کی ٹانگوں میں دَم نہیں تھا۔ اس نے جھک کر ایک ہاتھ سے کنستر کو پکڑا اور پھر بیٹھ گیا۔

"چکر آ رہا ہے۔" اس نے بہ ظاہر اپنے آپ کو بتایا۔ اب اس کی آواز بہت کھوکھلی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا۔ کنستر بھی کچھ دور تک اوپر اٹھا، پھر چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ کتا، جو مستقل ہم دونوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا، لپک کر قریب آیا اور کنستر کو سونکھنے لگا۔

"چکر آ گیا تھا۔" نووارد نے مجھ کو بتایا۔

میں اس کو سہارا دیے دیے برآمدے کی سیڑھیوں تک لایا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس شخص پر بےہوشی طاری ہونے لگی اور جب تک میں اس کو ڈرائنگ روم کے سوفے پر لٹاؤں وہ بالکل غافل اور بےحرکت ہو چکا تھا۔ مجھ کو اس کے زندہ ہونے میں شک تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ اور بال گرد سے اَٹ گئے تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی کھل گئی تھی اور اس میں سے مٹی نکل کر جوت کی چٹائی پر گر رہی تھی۔

میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا، پھر تیزی سے اوپر گیا۔ کتا بھی میرے پیچھے ہو لیا۔ اوپر سے اسٹیتھوسکوپ لے کر میں واپس نیچے آیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں مڑا۔ نووارد اب بھی سوفے پر بےحرکت پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور اس معائنے کے بیچ میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن یہ آنکھیں شیشے کی سی تھیں اور ان میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے خدوخال اچھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد باریک جھرّیاں تھیں۔ اگر یہ جھریاں ان کے سیاہ رنگ میں دب نہ گئی ہوتیں تو وہ زیادہ معمّر معلوم ہوتا۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں اور اس حالت میں ایک لاش کی طرح پڑا ہوا وہ بہت مطمئن اور آسودہ حال معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں ہوش جھلکنے لگا۔ اس کی پلکیں تھرتھرائیں۔ اس نے مجھ کو پہچاننے کی کوشش کی، اور پہچان لیا۔ پھر اس نے اٹھنا چاہا اور اس کی آنکھوں سے کرب ظاہر ہونے لگا۔ میں نے اس کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

"لیٹے رہو۔" میں نے کہا، "کیا تکلیف ہے؟"

"میں جاؤں گا۔" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا، اور پھر اٹھنا چاہا۔

"ابھی تمھاری طبیعت نہیں ٹھیک ہے۔" میں نے اسے بتایا اور اپنا سوال دوہرایا، "کیا تکلیف ہے؟"

"تھکن، چکر اور---" وہ رک گیا، پھر بولا، "بہت تکلیف ہے۔"

میں معائنہ ختم کر چکا تھا۔

"اچھا لیٹے رہو۔" میں نے کہا، "دوا دیتا ہوں۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے سر گھما کر ایک نظر مریض کو دیکھا اور میرا ہاتھ ہینڈل پر رکھا رہ گیا۔ باہر سے دروازے پر دباؤ پڑا۔ دروازہ تھوڑا کھل گیا۔ کتّے کا سر اندر داخل ہوا اور ہوا کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ میں مڑا اور تیز قدموں سے مریض کے سرہانے پہنچا۔

"سنو۔" میں نے مریض پر جھک کر آہستہ سے پوچھا، "آج تم نے کیا کھایا تھا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کل؟"

مریض خاموش رہا۔

"کل تم نے کچھ کھایا تھا؟"

مریض خاموش رہا۔

"کب سے بھوکے ہو؟" میں نے زرا درشتی سے پوچھا۔

میری آواز بہ ظاہر مریض کو سنائی نہیں دی۔

"تم کب سے بھوکے ہو؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

مریض کی آنکھیں بےنور ہو چکی تھیں لیکن وہ ہوش میں تھا۔ اس کے اودے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اب میں نے بہت نرم لہجے میں اس سے پوچھا،

"تم نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہے؟"

مریض نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دروازے کے اندر منھ ڈالے کتا ہانپ رہا تھا اور باہر ہوا نیں کے خالی کنستر کو اِدھر سے اُدھر لڑھکاتی پھر رہی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اوپر آ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے اپنے بستر پر بیٹھ کر تکیے سے ٹیک لگا لی اور ذہن پر زور دینے لگا۔ مجھے چپلیں اپنے پیروں سے نکلتی محسوس ہوئیں۔

شمالی روشن دان میں سے گرتے ہوئے سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھ بیٹھا اور چپلیں پہنتا ہوا نیچے اترا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے بند تھا۔

Scanned with CamScanner

میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر میں برآمدے کے کھلے ہوئے دروازے سے نیچے اترا۔ سلاخوں‌دار پھاٹک بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے پھاٹک بند کر دیا اور کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ آندھی تیز ہو گئی تھی۔ مجھ کو اپنے پیروں کے پاس کتے کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"آؤ دوست، واپس چلیں۔" میں نے کتے سے کہا اور برآمدے کی طرف مڑ گیا۔ برآمدے کا دروازہ بند کر کے میں اوپر اپنے کمرے میں پہنچا۔

بستر پر لیٹتے ہی میرے خیالات بےربط ہو گئے۔ ایک خیال میری زبان پر آیا،

"وہ بھی عناصر سے مرعوب نہیں تھا۔" پھر یہ خیال طرح طرح کی مہمل شکلیں اختیار کرنے لگا۔

"پھر بھی جانوس، تم نے انتظار نہیں کیا۔" میں نے کہا اور سو گیا۔

کتنا پانی

گاڑی لیٹ ہوتے ہوتے شام آٹھ بجے کی بجائے رات ساڑھے دس بجے راولپنڈی سے لاہور پہنچی۔ رمیش کو جب بھی لاہور کا ریلوے اسٹیشن دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو وہ اسے ایلس کی طرح اڑا کے خوابوں کی سرزمین میں پہنچا دیتا۔ اسے لگتا جیسے وہ اسٹیشن نہ ہو بلکہ کسی پریوں کی شہزادی کا قلعہ نما پُرشکوہ محل ہو، ایسے عجائبات اور اسرار سے بھرا ہوا جو ابھی دریافت ہونے کے لیے اس کے منتظر ہوں۔ وہاں چلتے پھرتے اس کے دل کے ایک کونے میں یہ احساس بھی کروٹیں لیتا رہتا جیسے وہ عالیشان محل اور اس کی مالک شہزادی دونوں اس کے اپنے ہی ہوں۔ سنگِ مرمر کے فرش والی، بہت بلند اور کھلی ڈیوڑھی کے دونوں طرف اونچے مخروطی بُرجوں والی، سرخ اینٹوں کی عمارت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ پلیٹ فارموں پر لوہے کی دھواں لگی سیاہ چادروں کی چھتیں تھیں۔ آہنی پلوں کے ذریعے آپس میں ملائے گئے ان کھلے کھلے بہت سے پلیٹ فارموں پر بیک وقت چھ چھ قرمزی ڈبوں والی گاڑیاں دھواں اگلتے کالے بھجنگ انجنوں سے جُتی، نئی منزلوں کی کھوج میں نکلنے کے لیے تیار کھڑی ہوتیں۔ گو کہ وہاں میلوں کا سا بھیڑبھڑکا نظر آتا تھا لیکن میلوں میں تو اس قدر افراتفری، بدنظمی اور گرتے پڑتے مسافروں کا نظارہ نہیں ہوتا۔ وہاں پر ایک طرح سے پنجاب میں بسنے والے مختلف مذہبی، معاشی اور سماجی گروہوں کے رہن سہن کی زندہ نمائش منعقد ہو رہی ہوتی۔ پگڑیوں والے، ڈانگیں سنبھالے، ایک دائرے میں بیٹھے، حقہ پیتے، اداس اداس اور لاہور کی بےمہری سے خوفزدہ کسان۔ سرخ رومی ٹوپیوں کے سیاہ پھندنے جھلاتے بےفکرے شہری مسلمان۔ سفید لانگڑی دھوتیوں میں موٹے موٹے سیٹھ۔ پتلونوں والے نوجوان۔ رنگین پگڑیوں اور کرپانوں والے سکھ۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے، سر پر ہیٹ لگائے، ایک اعتماد سے منکتے پھرتے اینگلوانڈین۔ سیدھی آسمان سے اتری ہوئی، سنہرے بالوں والی مغرور میمیں۔ کوہ وقار بنے صاحب بہادران۔ ٹخنوں تک لمبے، ٹوپی والے برقعوں میں بند گرتی پڑتی مسلمان عورتیں۔ ساڑھیوں میں بدن سنبھالتی ہندو عورتیں۔ رفع حاجت کرتے بچے، دھوتی پونچھتی مائیں۔ غراتے ہوئے بھنگی۔ آزادی سے تھرکتے پھرتے لوگ۔ چیختے چلاتے خوانچہ فروش۔ سرخ قمیصوں اور سرخ پگڑیوں والے، سامان تلے ہانپتے قلی۔ نیلی وردیوں میں ایک شانِ بےنیازی سے خراماں خراماں چلتا پھرتا ریلوے کا نچلا عملہ۔ یہ سب آپس میں

rekhta

Scanned with CamScanner

وہاں یوں خلط ملط ہو رہے ہوتے جیسے ریلوے اسٹیشن کوئی بہت بڑی بُڑبُڑ اُبلتی ہوئی دیگ ہو جس میں کوئی یہ سب اجزا ڈال کر، ایک بڑے کفگیر سے خوب زور زور سے ہلاتے ہوئے ان کا حلیم پکا رہا ہو، لیکن اس کے ذائقے کی ذمےداری کسی کی بھی نہ ہو۔ آج جب اس کی گاڑی لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو بجلی کی روشنی تو دور دور تک اسی طرح جگمگاتی ہوئی رات کو دن بنانے کی کوشش میں مصروف تھی، لیکن ہر طرف خاموشی، اداسی اور بےرونقی کا دوردورہ تھا۔ اس شام کی آخری گاڑی کے استقبال کے لیے صرف آٹھ دس قلی بغلوں میں ہاتھ دیے، دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑے تھے۔ کل کوئی سو سوا سو مسافر ہوں گے جو یہاں ختم ہونے والی گاڑی میں سے اتر کر ٹھٹھرتے ہوئے، اپنی گٹھڑیوں کے بوجھ تلے دبے، دروازے سے گزرتے ہوئے ڈیوڑھی میں پہنچ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے یہ بےچینی ٹپک رہی تھی کہ لاہور تو خیر پہنچ گئے لیکن اتنی رات گئے آرام اور گرم کھانے اور سکون کی اصلی منزل گھر پہنچنے کا کیا ہو گا۔ ڈیوڑھی کے دروازے سے ذرا ہٹ کر پلیٹ فارم پر خوف اور سردی سے کانپتا ہوا ایک مریل سا پلا کھانے پینے کے بند اسٹال کے سامنے بکھرے پرانے پتّوں کے گندے دونوں کو کسی ٹکڑے کی تلاش میں سونگھتا اور احتیاطاً چاٹتا چلا جا رہا تھا کہ شاید، اگر اس کی قسمت اچھی ہو تو ایک بار منہ بھر دینے والے لقمے کی لاٹری نکل آئے۔ وہ اپنے کام میں مصروف، ادھر اُدھر چوری آنکھ سے دشمن پر ایک عاجزانہ سی نظر بھی ڈال لیتا تھا۔ اس وقت ہر کوئی اپنی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ لونڈے لپاڑے بھی جمائیاں لیتے، نیند کے نشے میں چُور، والدین کے سہارے، بیزاری کے عالم میں الٹے سیدھے قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت وہ ایک ٹھوکر کے لائق بھی نہ تھا۔ رمیش فرسٹ کلاس کے ڈبے سے اترا تو ایک قلی نے آگے بڑھ کر پوچھا، "صاحب، قلی؟"

"نہیں۔" اس نے سنہری مُوٹھ والی چھڑی افسرانہ ٹھاٹھ سے لہرا کر بوٹ پر بجائی اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ کل شام اسے اپنے ساتھی افسروں کے ساتھ ہوڑہ ایکسپریس سے کلکتے چلے جانا تھا اور وہاں سے پھر شاید برما محاذ پر جانا ہو۔ وہ کرنل رابرٹ سے ایک دن پیشگی روانگی کی خصوصی اجازت لے کر لاہور چلا آیا تھا تاکہ والدین کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار لے۔ مگر گاڑی نے لیٹ ہو کر وقت کو، جو پہلے ہی کم تھا، اور کم کر دیا جس کا اسے افسوس ہو رہا تھا۔ پورچ کے اندر اور باہر کل ملا کر آٹھ دس تانگے کھڑے تھے اور شدید سردی کے باعث ان کے کوچوان پائیدانوں پر کھڑے ہو کر پرجوش آوازیں لگانے کی بجائے کھیسوں کی بُکلوں میں اپنی سیٹوں پر سمٹے سمٹائے بیٹھے، مری مری آوازیں لگا رہے تھے، "ہے کوئی شالمی لوہاری دا سوار؟"

بہت دیر تک معشوق صفت، ہوا کے ہاتھوں پاگل سا ہوا چاند، کبھی دائیں کبھی بائیں دوڑتے دوڑتے ہانپ کر، اب بادلوں کا نقاب پہن کر خود تو نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا مگر سیاہ بادلوں کو سرمئی سی پہچان دے گیا تھا۔ امڈ کر آئے ہوئے بادل، آسمان پر ڈیرے ڈالے، پہلی بوند کے گرنے کے انتظار میں دَم سادھے کھڑے تھے۔ لیفٹیننٹ رمیش نے ایک تانگے والے

کو چھڑی کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، "خالی ہے؟"

"جی صاحب۔"

اس نے پی کیپ اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کدھر صاحب؟"

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کہاں تو اسے گھر پہنچنے کی اتنی جلدی تھی کہ ایک ایک منٹ جو گاڑی لیٹ ہوئی وہ اس پر گراں گزرا -- گوجرانوالہ ریفریشمنٹ روم نے جو کھانا مہیا کیا وہ بھی اسی رنج میں اسے اچھا نہ لگا؛ آدھ کھایا واپس کر دیا -- اور اب جیسے وہ گھر جانا ہی نہ چاہتا ہو۔ اس کا گھر تو تھا جیل روڈ پر، نہر کے پل کے پاس، مگر اس کے منہ سے نکلا میکلوڈ روڈ۔ دراصل لاہور پہنچ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پورا شہر اس کا اپنا گھر ہو؛ اس کی سڑکیں، بازار، سنیما ہال، کلب، ریستوراں، محلے، گلیاں، اسکول، کالج اس کے گھر کے مختلف حصے ہوں؛ کوئی ایک خاص مکان اس کا گھر نہ ہو۔ کوچوان نے چابک ہوا میں لہرایا اور منہ ٹیڑھا کر کے ٹک ٹک کی آواز نکالتے ہوئے نیم خوابیدہ گھوڑے کو چلنے کا حکم دیا۔ پیچھے کھسکتی جاتی، جگمگاتی ڈیوڑھی اور پورچ اندھیرے کی سرنگ کے دوسرے کنارے سنیما میں چلتی خاموش فلم کی مانند نظر آنے۔ اب تانگا تیز ہوا تو وہ تیزی سے پیچھے پھسلنے لگے۔ اب وہ اس ہجوم سے کٹ کر الگ ہو چکا تھا جو اپنی گٹھڑیوں سمیت وہاں سے جلد کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن نے، پتا نہیں کیوں، ان سے انسان ہونے اور ساتھی ہونے کے جتنے بھی ممکنہ رشتے ہو سکتے تھے، اپنے آپ کو ان سب سے یکسر قطع کر کے دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی رات کی آسائش، موسم سے پناہ، کھانے کی جلد یافت اور ایسی ہی تمام ضرورتوں کے لیے تگ و دو، اضطراب، بےیقینی، مبہم سا خوف اسے عجیب ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی نظر آئے۔

ڈیوڑھی اور پورچ کے اوپر اسٹیشن کی دیوہیکل عمارت کسی پہاڑ کی سلہوٹ کی طرح چھائی کھڑی تھی۔ کیا خبر یہ ابھی اپنے بوجھ تلے ان بےمعنی اور فضول کلبلاتے جانے والے کیڑے مکوڑوں کو پیس کر رکھ دے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بھدّی سی مسکراہٹ پھیلی جو چہرے کے نقوش میں کوئی اُجلی چمک یا کوئی معصوم امنگ لہرانے کی بجائے انہیں ایسا بنا دیتی ہے جیسے CONCAVE آئینے میں عکس جھلک گیا ہو۔ اس نے سنہری موٹھ والی چھڑی بوٹ پر زور سے ایک بار بجائی، برہمی سے رخ موڑ لیا اور سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ افسر بننے کا نشہ آج بطور افسر لاہور کی زمین پر پہلی بار قدم رکھنے سے دوچند ہو گیا تھا۔ اپنا شہر، اپنی سڑکیں اور ان پر لیفٹیننٹ رمیش شرما اپنی کمائی سے سالم تانگے میں ہر طرح کی پابندی سے آزاد گھوم رہا تھا، اور کسی کو جواب دہ نہیں تھا۔ کچھ گورے فوجی ہرگنزا ہوٹل کے لوہے کے گیٹ میں سے گزر کر اس کے صحن کو جھومتے جھامتے عبور کرتے ہوئے پہلی عمارت کے لمبے برآمدے کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ پلازا یا ریگل سے انگریزی

فلم دیکھ کر آ رہے ہوں گے، یا میٹرو سے پی کر آ رہے ہوں گے، یا اسٹفلی میں فلور شو دیکھا ہو گا، یا اسٹینڈرڈ میں ہلڑ مچایا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی اینگلوانڈین لڑکیوں کے گھروں سے آ رہے ہوں جو چند روپوں کی خاطر ان کی راہ تکا کرتی ہیں۔ پھر سڑک کے متوازی لگی ہوئی ہوٹل کی کھٹے کی اونچی باڑھ کے پیچھے سب کچھ چھپ کر رہ گیا۔ تانگے کی کینوس کی چھت پر ٹپ سے ایک بوند گری۔ رمیش نے سر باہر نکال کر آسمان پر نظر دوڑائی۔ سب کچھ سیاہی میں لت پت ہو چکا تھا۔ تانگے والے نے چابک لہراتے ہوئے کہا، "شاباش پتّر اوئے، مینہ وی آ گیا تے پہنچنا وی دور اے۔" رمیش نے کوچوان کے چہرے کو دیکھا کہ وہ اس سے کہہ رہا ہے یا گھوڑے سے مخاطب ہے۔

چوک آ گیا۔ اس نے سوچا کہ تانگا دائیں طرف گھما دیا جائے تو پہلے برانڈرتھ روڈ آئے گی جس کے پیچھے رام گلی آباد ہے۔ پھر شاہ عالمی، پھر لوہاری، پھر بھاٹی دروازہ باری باری آئیں گے۔ لاہور کا کون سا ایسا کونا تھا جو سائیکل پر گھومتے پھرتے اچھی طرح اس کا دیکھا بھالا نہیں تھا۔ اسے جہاں صاف ستھری مال روڈ کی بلند وبالا اور وسیع دکانیں، اور دن رات اس کی سائیکل کے پہیوں تلے روندی جانے والی جیل روڈ، لارنس روڈ، کوئینز روڈ، وارث روڈ، اور ان پر واقع کھلے کھلے سبز لانوں والے، ایکڑوں رقبے پر پھیلے، درختوں کے جھنڈوں میں گھرے، محراب دار، لمبے لمبے برآمدوں والے کولونیل ساخت کے بنگلے یاد آتے، وہاں اتنی ہی شدت سے تنگ گندی گلیاں اور گھنے گھنے بدبودار محلے بھی یاد آتے جہاں نانک شاہی چھوٹی اینٹوں کے بوسیدہ ہوتے ہوئے، ایک دوسرے میں گھسے جاتے دو منزلہ سہ منزلہ اندھیرے مکان واقع تھے۔ ان کے ٹیڑھی، درازوں والے چھجوں پر بدرنگ ہوتی ہوئی لکڑی کی منقش کھڑکیاں اور بیل بوٹوں والے جنگلے اپنی گزری شان اور ان کے حسن پر ناز کرنے والے مکینوں اور بنانے والوں کو بوڑھوں جیسی اداس، مضمحل اور مات کھائی ہوئی خاموشی سے یاد کر رہے ہوتے۔ مقابلہ تو محض ہم عصروں کا آپس میں ہو سکتا ہے۔ جو گزر چکا وہ گزر چکا۔ جو ابھی آنا ہے اس کا کسی سے آمنا سامنا ہی نہیں تو مقابلہ کیسا۔ زندگی کے سبھی جھنجھٹ اچھے برے ہم عصروں کو صرف ایک دوسرے ہی سے نپٹانے ہوتے ہیں۔

ہر نئی نسل کے ساتھ کھیل نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔ مکیں و مکاں، زمیں و زماں سب بدل جاتے ہیں۔ اسے یوں لگا کہ اونچی محرابی ڈیوڑھیاں جن پر کبھی سرخی ملے چونے سے پھول پتّے اور شاخیں بنائی گئی ہوں گی اب وقت کے ہاتھوں عاجز ہیں۔ کہیں کوئی کائی زدہ سیاہ پڑتی پتّی، کہیں کوئی شاخ کے بیچ کا ٹکڑا، گرنے کا منتظر، اٹکا کھڑا ہے۔ لکڑی کے دروازے، جنگلے اور کھڑکیاں۔ جن پر کبھی دیدہ ریزی سے نقش و نگار بنائے گئے ہوں گے، اب صحرا میں پڑی ہڈی کی طرح سفید اور بھُربھُرے، ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے جا رہے ہیں۔ اب یہ سارے مکاں سیمنٹ اور سریے کی سپاٹ، تیکھے زاویہ قائمہ والی عمارتوں اور لکڑی پر چمکتے ہوئے رنگوں اور روغنوں سے شکست کھا کر نادم سے، منہ چھپائے کھڑے ہیں۔ محض

اس لیے کہ ان کا وقت بیت چکا ہے اور وہ اب بھی موجود رہنے پر مصر ہیں۔ ماضی، ہوا اور خاک کی مانند ہر طرف نامعلوم انداز میں بکھرا اور پھیلا ہوا، یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی کلہاڑے کا پھل ہو جو حال کے اندر در آیا ہو اور اسے پھاڑتا ہوا آگے نکل جانے والا ہو۔ مگر وہ ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔

پربھات سنیما تیز روشنیوں میں گھرا خاموش کھڑا تھا۔ خوانچہ فروش اور تاک جھانک کے شوقین آج غالباً موسم کی سختی سے گھبرا کر غائب ہو گئے تھے۔ دیواروں پر فلم "پاگل" کے رنگ برنگے بینر سجے تھے جن پر پرتھوی راج داڑھی اور سر کے بال بےہنگم طور پر بڑھائے، پاگلوں کی سی صورت بنائے مختلف پوزوں میں نمایاں تھا۔ آخری شو چل رہا تھا۔ چند تانگے ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ رمیش، جو اس زمانے کے ان سوشل مندروں کا متوالا تھا، غور سے اسے گزرتے دیکھتا رہا جیسے اسے اس میں کبھی دیکھی ہوئی فلمیں اور جس جس کے ساتھ ساتھ جب جب دیکھی تھیں وہ سب یاد آ رہا ہو۔ پھر پیلس، رٹز اور جسونت سنیما گزرے۔ پربھات جیسی ہی کیفیت ان کی تھی اور وہی عالم اس پر گزرا۔ ریجنٹ سنیما کے بالمقابل، سڑک سے کوئی دس بارہ فٹ بلند ایک ٹیلے پر، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا ہوسٹل تھا۔ سڑک کے رخ کھلنے والی بہت سی کھڑکیاں روشن تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر ایف ایس سی اچھے نمبروں میں پاس کر لیا ہوتا تو آج وہ، اپنے پتا کی خواہش کی تعمیل میں، پڑھائی میں منہمک ان انجانے لڑکوں کی طرح اس وقت مطالعے میں مصروف ہوتا اور تین سال بعد ڈاکٹر بننے والا ہوتا۔ باپ تو خوش ہوتا ہی، لیکن ماں کا سر بھی فخر سے آسمان جتنا اونچا ہو جاتا جس نے اس کی ناکامیوں کی وجہ سے ساری عمر کلیجا چھلنی کر دینے والے طعنوں کے تیر جھیلے تھے۔ "رمیش کے سر میں تو تیری طرح بھُس بھرا ہے، بلکہ بھس بھی کہاں ہے صرف ٹین کا خالی ڈبا ہے، زنگ آلود۔" ایسی باتیں سن کر وہ بےحد ملول اور افسردہ ہو جاتیں۔ ایک ٹھنڈی سانس بھرتیں اور دوسرے کمرے میں جا کر ساڑھی کے پلو میں منہ چھپا کر چپ چاپ بیٹھی آنسو بہاتی رہتیں۔ پھر اسی اداسی اور مایوسی کے عالم میں تھکے تھکے قدموں سے پھر کام میں مصروف ہو جاتیں۔

رمیش گندمی رنگ، کھلے ہاتھ پاؤں اور متناسب مضبوط بدن کا اسمارٹ لڑکا تھا۔ اسے زندگی کی ہماہمی کے علاوہ ہر خوبصورت چیز سے پیار تھا مگر کتابوں سے دور بھاگتا تھا۔ باپ کے خوف سے ٹیوٹر کی موجودگی میں مارے باندھے کچھ پڑھ پڑھا لیتا۔ باقی وقت دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا، گپ شپ لگاتا، ہنستا ہنساتا، جیسے تیسے ہر نئی فلم دیکھتا۔ لڑکیوں کے قرب کے لیے بےقرار رہتا؛ تانک جھانک تو چلتی ہی رہتی لیکن اسے ان سے ملنے اور باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اندو کی سہیلیاں کبھی گھر پر آ نکلتیں تو مختلف بہانوں سے اس کے کمرے کے چکر پر چکر لگاتا۔ معصوم معصوم فقرے کستا رہتا۔ وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتیں، ہنستیں اور اس کی موجودگی سے خوش ہوتیں۔ انہیں دیکھ کر اسے

اپنے اندر پیدا ہونے والے احساسات بہت عجیب سے لگتے مگر سمجھ میں کبھی نہ آ سکے؛ ہر احساس اس کی آنکھوں کے سامنے گرگٹ کی طرح تیزی سے رنگ بدل جاتا اور ہر بار اس کی گرفت سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل جاتا۔ اسے لگتا جیسے وہ انسانوں سے لطیف تر، معصوم تر، نازک تر کوئی ماورائی مخلوق ہیں جو پتا نہیں کیوں اور کیسے اس دنیا میں چلی آئی ہیں اور ابھی ہوا میں اپنے دھنک جیسے رنگوں سمیت تحلیل ہو جائیں گی۔ وہ اسے کچھ کچھ ارتی ہوئی تتلیوں کی سی اور کچھ کچھ جھومتے ہوئے پھولوں کی سی لگتیں۔ ہر چیز جو وہ کھاتی ہیں یا پیتی ہیں وہ ان کے منہ سے ہوا میں اڑ جاتی ہے، حلق سے نیچے نہیں جاتی کیونکہ نہ تو ان کا کوئی نظام ہضم ہے اور نہ انہیں غذائیت کی ضرورت ہے۔ وہ تو سب خوشبو، دھنک اور فرشتوں کی مانند کوئی غیرمرئی چیز ہیں جنہیں چاہا تو جا سکتا ہے مگر چھوا نہیں جا سکتا۔ اندو کہتی، "تم یہاں سے جاؤ، ہم نے اپنی باتیں کرنی ہیں۔" اگر نہ مانتا تو وہ ماتاجی سے جا کر شکایت کرتی۔ وہاں سے ڈانٹ سنائی دیتی، "رمیش، تمہارا لڑکیوں میں کیا کام ہے؟ چلو وہاں سے۔" لڑکیوں کے قہقہوں کے درمیان وہ دم دبا کر وہاں سے بھاگ لیتا۔

یہ رومانی بالا اس کے ذہن میں پوری جس مخالف کے اردگرد بلاتخصیص نہیں پھیلا ہوا تھا بلکہ پکی عمر کی عورتیں اور بھونڈی، بدصورت لڑکیاں خودبخود اس سے مستثنیٰ ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اس کے ذہن میں یہ صورت وہم بھی اس بات کا گزر نہ ہو سکا کہ کچرکچر کچے امرود چباتی اور سڑپ سڑپ بڑے کھٹے مالٹوں کا رس نکلنے والی شانتی کے یہ سب کچھ معدے اور پھر انتڑیوں میں نہیں پہنچے گا، یا یہ کہ وہ کوئی غیرمرئی دھنک ہے یا خوشبو ہے یا فرشتہ ہے۔ وہ تو ایسی تھی جسے صرف چھوا ہی جا سکتا تھا، چاہا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ کھلی فضا کا پنچھی تھا، کمرے میں بند رہنے والے قیدیوں کی سی زندگی سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی کو یوں کھول کر دیکھنا چاہتا تھا جیسے کوئی بچہ گھڑی کی ٹک ٹک کا منبع ڈھونڈنے کے لیے اسے کھول کر دیکھنا چاہتا ہو۔ مگر زندگی گھڑی کی مثل کوئی ایک چیز تو ہے نہیں؛ یہ تو مجموعہ ہے نظر آنے والی اور نہ نظر آنے والی ان گنت چیزوں کا۔ ہر نئی جگہ، نئی چیز، نیا کام، نیا تجربہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت دلچسپی لیے ہوئے ہوتا۔ جتنی زیادہ سختی سے کسی چیز پر پابندی لگائی جاتی، اس کا شوق اسے کر گزرنے کے لیے اسی تناسب سے بڑھ جاتا۔ چھٹی جماعت میں تھا تو دوستوں کو بہ اصرار سگریٹ پینے پر آمادہ کیا اور ایک اتوار نہر کے کنارے بیٹھ کر سب نے مل کر سگریٹ پیے۔ چکر آئے، کھانسی آئی، قے آئی اور بہت دیر تک سب وہیں بےسدھ پڑے رہے۔ کسی نے گھر جا کر اس کے باپ کو بتا دیا۔ دو دن تک اس کی پٹائی اور ماں کی جواب طلبی ہوتی رہی۔ شریکِ گناہ ساتھیوں کے والدین نے گھر آ آ کر اس کے ماں باپ سے جو گلے کیے کہ تمہارے بیٹے نے ہمارے بچے کو

بھی خراب کیا، وہ ان کے لیے الگ ندامت اور خفت کا باعث ہوئے۔

سینٹ انتھونی اسکول کے ہیڈماسٹر نے اسے اس کی علمی استعداد میں کمی کی وجہ سے سینیئر کیمبرج کے امتحان کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ لامحالہ اسے پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان دینا پڑا۔ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ سناتن دھرم کالج میں ایف ایس سی میڈیکل گروپ میں بڑی سفارشوں سے داخلہ مل سکا۔ والد ہر قیمت پر اسے ڈاکٹر بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ دو سال بعد امتحان ہوا۔ سوائے انگریزی کے سب مضامین میں فیل۔ تیسرے سال تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اب کیا ہو گا؟ اسے پہلی بار مستقبل اپنے اصلی، گھناونے اور بھیانک رنگ روپ میں دکھائی دینے لگا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ تعلیمی قابلیت اس میں نہیں، لیکن جس اعلا درجے کی زندگی کا وہ عادی ہے اس کے بغیر جینا بھی محال ہے۔ ایف اے پاس تو کلرک ہی بن سکتا ہے، یا پھر بی اے کرنے کے بعد وکیل بننے کی کوشش کرے اور ماموں کے ساتھ اپنے آبائی شہر جہلم میں وکالت کرے؛ شاید باعزت گزراوقات کا ذریعہ نکل آئے۔

دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ اخبارات اتحادیوں کی پسپائی اور جاپانیوں اور جرمنوں کی فتوحات کی خبروں سے بھرے ہوئے۔ سرکاری ریڈیو بھی یہی کچھ بتاتا، مگر یوں کہ پسپائی ہتک آمیز اور مایوس کن نظر نہ آئے۔ ضرورت کی چیزیں روز بہ روز مہنگی ہوتی جا رہی تھیں۔ دیہاتی آبادی تیزی سے شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ روزگار کے نئے ذرائع سامنے آ رہے تھے۔ لیکن عام شہریوں کی زندگی پر، سوائے گاہ گاہ کے بلیک آؤٹ کی تکلیف کے، جنگ کے کوئی خاص اثرات -- خوف، گھبراہٹ، بوکھلاہٹ یا بھگدڑ -- موجود نہیں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنگ ہو تو رہی ہے لیکن کسی اور سیارے پر۔ بعض اوقات کسی ناگہانی حادثے کی طرح خبر آتی کہ اسکول کا فلاں پرانا ساتھی برما فرنٹ پر جہاز کریش کر گیا، فلاں مصر کے محاذ پر جرمنوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر فوجی اسپیشل ٹرینیں دیکھنے میں آتیں۔ ان سے ریلوے کا عملہ خصوصی سلوک روا رکھتا۔ عام لوگ فوجیوں کو دیکھ کر افسوس کرتے کہ پتا نہیں بےچارے زندہ گھر لوٹیں گے بھی یا نہیں۔ فوج میں بھرتی دھڑادھڑ جاری تھی۔ عام گھرانوں کے، میٹرک اور ایف اے پاس، تیز طرار لڑکے بھی فوج میں کمیشن پانے لگے تھے، اس کے لیے اب کسی خصوصی خاندانی بیک گراؤنڈ وغیرہ جیسی شرائط باقی نہ رہی تھیں۔ رمیش کے سینٹ انتھونی اسکول کے کئی ساتھی فوج میں کمیشن پا چکے تھے۔ اس نے بھی عزیز کی دیکھادیکھی درخواست بھیج دی اور باپ کو بعد میں خبر کی۔ انھوں نے دو بار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، "تم جیسوں کے لیے مناسب پروفیشن ہے۔" عزیز کو دہرہ دُون ملٹری اکیڈمی سے کال ملی تو رمیش سائیکل دوڑاتا ہوا گھر پہنچا اور سائیکل پر سوار برآمدے میں چلا آیا۔ اس نے گیلری میں کھلنے والے دروازے کے بند فلائی ڈور کو دھڑدھڑ پیٹا اور، گدی پر بیٹھے بیٹھے، اُچک کر دروازے کے قریب لگے پیٹ اسٹینڈ میں جڑے شیشے میں اپنی صورت دیکھی۔ دو دن

Scanned with CamScanner

کی بڑھی شیو، تلوارمارک مونچھیں، بکھرے بال۔ اسے پتا تھا کہ ابھی ساڑھے بارہ بجے ہیں اور اس کے پتا ڈاکٹر شرما ہسپتال سے نہیں آئے ہوں گے، اس لیے وہ جتنا چاہے غل غپاڑا کر سکتا ہے۔ اس نے بند دروازے کو پھر سے دھڑدھڑایا، گھنٹی کا بٹن دبایا اور ہانک لگائی، "او رامو کے بچے، دروازہ کھول۔" اندر سے خورشید کی رسیلی آواز لہرا لہرا کر فلائی ڈور سے باہر ابل رہی تھی، پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے۔

پکی ہوئی مٹی کی سرخ اینٹوں کی اس بڑی کوٹھی کے وسیع سبز لان کے آخر میں رنگارنگ گلابوں کی کیاریاں تھیں۔ سرکنڈوں پر چڑھی مٹر کی بیلوں پر کاسنی اور نیلے پھول تھے جن کی گرم گرم مہک ہر طرف اڑتی پھر رہی تھی، اور پھر سڑک سے جدا کرنے کے لیے کھٹے کی اونچی باڑہ تھی۔ باہر سنبل کے اونچے، پھیلے ہوئے درختوں کی قطار تھی جن کے سردی سے پیلے ہوتے ہوئے پتے لان میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ سڑک کے پار کنیئرڈ کالج کے دروازے پر چند تانگے کھڑے تھے جن کے گھوڑے اور کوچوان سردیوں کی خوشگوار اُجلی دھوپ تاپتے اپنی اپنی سواریوں کے انتظار میں اطمینان سے اونگھ رہے تھے۔ سڑک پر ایک مریل سا گھوڑا، گردن ڈالے، خاکی پگڑی اور سفید داڑھی والے بوڑھے کوچوان کے چابک کے زور پر، چوں چوں کرتے تانگے کو پُل کی ابتدائی چڑھائی پر کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اس شاداب سی ویرانی کو گھوڑے کی سست ٹپ ٹپ بارونق بنانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔

رمیش نے برامدے میں پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر ہونوں سمیت کھڑے ہو کر، ایڑیاں اونچی کر کے، گزرتے ہوئے تانگے کو ایک نظر دیکھا۔ گھوڑے کی ٹپ ٹپ کو پہچانتے ہوئے اس نے جو اندازہ لگایا درست تھا۔ سیٹھ رام جی داس کی کالی، موٹی، کرکٹ کے بلّے کی طرح چپٹے چہرے والی بیٹی کو وہی تانگا اور وہی گھوڑا اور وہی بڈھا کوچوان جو پچھلے کئی برسوں سے اسے گھر سے ختم چند کالج فار ویمن، پرانی انارکلی، لے جاتا اور واپس گھر پہنچاتا تھا، آج بھی واپس لا رہا تھا۔ رمیش کو اس کے والدین کی احتیاط پر حیرت ہوتی کہ اس کے لیے اتنا بڈھا کوچوان اور اس سے زیادہ بڈھا گھوڑا رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس لڑکی کی آنکھیں اگر چھوٹی ہوتیں تو اسے کالی چینی کہا جا سکتا تھا۔ قریب ہی نہر کے پکے کنارے پر ان کی کوٹھی تھی۔ گھومتے پھرتے کئی بار اس سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی۔ مختلف سماجی تقریبوں میں بھی رمیش کو اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور اس نے کبھی اسے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ایک شادی کے موقعے پر اس نے محض تماشے کی خاطر اسے بھرپور توجہ دیتے ہوئے اور میٹھی ملائم باتیں کر کے خول سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر رونق پیدا ہو گئی لیکن دوسرے لمحے، جیسے اسے رمیش کی باتوں پر یقین نہ آیا ہو، وہ پھر ویسی ہی اداس اور بجھی بجھی سی ہو گئی جیسی کہ ہوا کرتی تھی۔ رمیش نے اس کو ایک بےرحم مذاق سمجھتے ہوئے فوراً وہیں

چھوڑ دیا اور دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کی۔ لیکن اس کے بعد جب بھی اس سے آمنا سامنا ہوتا تو وہ منھ پھیرنے سے پہلے ایک بار ہلکا سا مسکرا ضرور دیتی۔

شانتی نے دروازہ کھولا۔ اس کے جامنی مسوڑھوں میں ٹھکے ہوئے سفید مضبوط دانت رمیش کو دیکھ کر کھِل اٹھے۔

"رامو کہاں مر گیا؟"

وہ جواب میں مسکرائے جا رہی تھی اور رمیش کو ایک بار بھی اس سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔

"تم کہاں تھیں؟"

"میں آپ کا کمرہ جھاڑ پونچھ رہی تھی۔"

اتنے میں رمیش کی ماتا اندر کے برآمدے سے دروازہ کھول کر گیلری میں آئیں۔ وہ سبزی کے چھلکوں سے بھرے ہاتھوں میں چھری پکڑے ہوئے تھیں۔

"رمیش، کیا بات ہے؟ کیوں اتنی تیزی دکھا رہے ہو؟"

"ایک گھنٹے سے چلا رہا ہوں۔ یہاں کوئی دروازہ ہی نہیں کھولتا۔"

"تو دوسرے دروازے سے آ جاتے۔ غصہ تو ہر وقت تمھاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔ اب تم اتنے بھی ٹھاٹھ نہ دکھاؤ۔ جاؤ پہلے سائیکل برآمدے سے ہٹاؤ۔ تمھارے پتا آنے والے ہیں۔ ناراض ہوں گے۔"

"ایک تو یہ اِندو کی بچّی ہر وقت ریڈیو لگائے رکھتی ہے، اور اتنا اونچا جیسے بہری ہو۔"

"اچھا۔ اب خواہ مخواہ کی لڑائی نہ چھیڑو۔ اس کی سہیلی سروج آئی ہوئی ہے۔ پہلے سائیکل اٹھاؤ وہاں سے۔"

"میری کوئی چٹھی آئی ہے؟"

"نہیں۔ تمھاری کوئی چٹھی وٹھی نہیں آئی۔"

"ماتاجی۔ عزیز کو تو آج چٹھی مل گئی ہے کہ فوراً ملٹری اکیڈمی دہرہ دون ٹریننگ کے لیے پہنچو۔ ہم دونوں نے اکٹھے انٹرویو دیا تھا۔ حیرانی ہے کہ اسے آ گئی مجھے نہیں آئی۔" ماتاجی کے چہرے سے خفگی تو اڑی مگر ساتھ ہی رنگ بھی اڑ گیا۔ انھوں نے کھانے کے کمرے میں ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ لگی کرسیوں میں سے ایک کرسی کھینچی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ "او اِندو۔ پرماتما کے لیے ریڈیو بند کر دے اور ادھر آ۔ کاکا، ڈاکیے کوٹھی کی چٹھیاں اسپتال تمھارے پتا کو بھی پہنچا دیتے ہیں۔ ابھی آئیں گے تو پتا چل جائے گا۔ میرے تو دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ رمیش، فوج میں جانا کیا ضروری ہے؟ تو نے ایف اے پاس کر لیا ہے، بی اے پاس کر کے وکالت کر لینا۔ جو لوگ ڈاکٹری پاس نہیں کرتے وہ کیا زندہ نہیں رہتے؟ تیری زندگی ہو، ٹھیک رہے، جب سمے آئے گا تو کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ ابھی کون سی تیری

Scanned with CamScanner

ایسی عمر ہو گئی ہے۔ تیرے ماموں اپنے باپ دادا کے گھر میں رہتے ہیں۔ وکالت کرتے ہیں، ہزاروں کماتے ہیں۔ کانگرس کے نیتا ہیں۔ پورے ضلعے میں بچہ بچہ انہیں جانتا ہے۔"

اندو فضا کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے، آ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ ماتاجی نے چھری اس کے سامنے ہوں میز پر رکھ دی جیسے ہتھیار ڈال رہی ہوں۔ "جا۔ گوبھی بنا کے رامو کو دے دے، تیرے پتا آنے والے ہیں۔ اسے کہہ دے کہ بنا لے۔ دیکھنا ! کہیں لال مرچ نہ ڈال دے۔ صرف کالی مرچ ڈالتی ہے، وہ بھی ذرا سی۔" اندو نے چھری اٹھاتے ہوئے آہستگی سے پوچھا، "کیا بات ہے ماتاجی؟" رمیش نے ہنستے ہوئے کہا، "کچھ نہیں۔ مجھے شاید ملٹری اکیڈمی میں داخلہ مل جائے، بس اس پر اداس ہو رہی ہیں۔ میرے سکول فیلوز میں سے بہت سوں کو تو فوج میں کمیشن مل بھی گیا۔ جوگندر سنگھ، اختر، مائیکل، گوپال... کس کس کا نام لوں۔ عزیز کو بھی کال آ چکی ہے۔ چمکدار پیٹی، سنہرے بٹن، وردی، پی کیپ۔ کیا شان ہو گی ماتاجی۔ گاڑی کی ایرکنڈیشنڈ ڈبے میں سیٹ بک۔ ٹھاٹھ سے سفر ہو گا۔ ہر اسٹیشن پر اتر کر چھڑی بغل میں دبا کر ادھر سے اُدھر ٹہلا کرو۔ سلوٹ پہ سلوٹ ہو رہے ہوں گے۔"

"بس بیٹا چپ رہ۔ مسلمانوں کے لڑکے فوج کی نوکری کیا کرتے تھے۔ دکھشنا لینے والے، شاستروں کا پاٹھ کرنے والے بدھی مان گیانی برہمن بھی کبھی فوجوں میں بھرتی ہوا کرتے ہیں؟ تمہارے پتاجی کی بھکوان جانے کیا سوچ ہے۔ پہلے تو بچوں کو انھا کر عیسائیوں کے اسکولوں میں داخل کرا دیا۔ اب سب صاحب لوگ بنے ہوئے ہیں اور اوپر سے خود گاندھی بھگت بنتے ہیں۔ یہ اچھوتوں کا پریوار الگ میرے سر پر سوار کیا ہوا ہے۔ ماں باپ، بیٹا بیٹی، جدھر دیکھو، جس کمرے میں دیکھو دندناتے پھرتے ہیں۔ نہ اپنا کوئی دھرم رہنے دیا، نہ میرا اور نہ اولاد کا۔ اولاد کو تو یوں جانو عیسائی ہی بنا دیا ہے۔ انگریزی بولتے ہیں۔ کرسمس پر تحفے بانٹتے پھرتے ہیں۔ نیو ایئر مناتے ہیں۔ جوتوں سمیت رسوئی میں پھرتے ہیں، ویسے ہی بھوجی کرتے ہیں۔ ان اچھوتوں کو تو میں ذرا ڈھیل دے دوں تو یہ میرے پوجا کے کمرے پر چڑھ دوڑیں۔ بھکوان ہی جانے اگلے جنم میں میری کون سی جون ہو گی۔" شانتی نے آ کر کہا، "ماتاجی، کام ختم ہو گیا ہے۔ ماں کہتی ہے روٹی دلا دیں۔"

"رامو سے لے لے نا۔"

"وہ نہیں دیتا۔"

"اے رامو۔ رات کی اور صبح کی بچی ہوئی روٹیاں اور جھوٹی نہیں ہے کیا؟ ارے کہیں اتنا سب کچھ کتے کو تو نہیں ڈال دیا؟"

"نہیں ماتاجی۔ اسے کہا ہے کہ ذرا دم لے۔ ہاتھ رندھا ہے۔ ابھی دیتا ہوں۔ یہ بھی ایک نواب جادی ہے۔ جبھ سے شکایت لگانے پہنچ گئی۔"

اندو بولی۔ "ماتاجی! پتاجی نے کئی بار کہا ہے کہ ان کو سچا کھانا دیا کریں۔"

"اچھا اچھا، تو چپ رہ۔ اب بھوجی نالی میں پھینکنے کا اپرادھ بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ رامو، پہلے اسے کھانا دے دے، پھر کوئی اور کام کرنا۔ چل جا شانتی۔ شاباش، لے لے۔" پھر اندو سے کہا، "چل بیٹی، دیر ہو رہی ہے۔ جلدی سے گوبھی بنا کر رامو کو دے دے۔"

شانتی، جو پہلے اپنی بھری بھری آبنوسی پنڈلیوں تک پائنچے چڑھائے، بغیر چُنری کے سارے گھر میں چھاتیوں کے کبوتر پھڑپھڑ اڑاتی دکھ رہی تھی، اب اندو کی اتری کا، جگ جگ سے مسکا ہوا، سرمئی ململ کا دوپٹا بدن پر لپیٹے، روٹی مانگنے کی شرم سے، اپنے بھونروں جیسے سیاہ، رس میں ڈوبے نینوں سے ننگے پیروں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ رمیش کو آج وہ یوں مجرم سی بنی کھڑی بڑی معصوم اور پیاری لگی۔ رمیش کی بدن ٹٹولتی نظروں کی دستک سیدھی جا کر شانتی کے دل پر پڑی۔ اس نے چونک کر رمیش کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں اسے جو طلب اور چاہت زندگی میں پہلی بار اپنے لیے یوں بےکل دکھائی دی، وہ گویا اس کی باقی عمر کے لیے کافی تھی۔ احساسِ تشکر اور ایک گونہ خوداعتمادی سے ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ گردن کو خم دے کر تفاخر کے عالم میں، فرش پر چلتی ہوئی نہیں، ہوا میں اڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ جب تک کمرے سے نکل نہیں گئی اسے اپنے کولھوں پر اس کی نظروں کی سوئیوں کی چبھن محسوس ہوتی رہی۔ لمبی موٹی چوٹی گدرائے ہوئے کولھوں سے باری باری مس ہوتی، پھسلتی اور پھسل کر لہراتی۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو اسے بار بار بلاتا اور جانے کے لیے کہتا، کسی مہاراجا کی طرح۔ اچھوتوں کے لیے تو وہ مہاراجا ہی تھا۔ وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار اس کے بدن سے متعارف ہو رہا ہو۔ شانتی کو ابھی پتا نہیں چلا تھا کہ رمیش لاہور چھوڑ کر ٹریننگ کے لیے دہرہ دون جا رہا ہے، ورنہ اس کی آنکھوں میں مستی کی بجائے آنسو بھرے ہوتے۔

ماتاجی کرسی پر اسی طرح افسردہ بیٹھی تھیں۔ رمیش نے کہا، "ماتاجی، آپ اتنی دکھی نہ ہوں۔"

"تو 'جگ جگ جیے بیٹا۔ میری زندگی بھی تجھے لگ جائے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اب ہر صبح تو اس بستر سے نہ اٹھے گا نہ ہر رات اس میں سوئے گا۔ میں ہر روز اسی طرح رسوئی بنایا کروں گی مگر کسی کھانے پہ تیرا انتظار نہ ہوا کرے گا۔ پتا نہیں اب تیرا کن کن دیسوں اور شہروں میں جانا ہو گا۔ تیرا بیاہ ہو گا، تیرے بچے ہوں گے، تیرا اپنا گھر ہو گا جہاں تو ان کے ساتھ مل کر رہا کرے گا اور میرا گھر تیرے گھر سے الگ ہو گا۔ کہو! یہی چاہتے تھے نا تم اور تیرے پتاجی؟ اب تُو کبھی کبھی مہمانوں کی طرح آیا کرے گا اور چند دن رہ کے واپس اپنے گھر چلا جایا کرے گا۔ آج سے ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے۔ اب ہم پھر کبھی اس طرح اکٹھے نہیں رہیں گے جیسے آج تک رہتے آئے ہیں۔ اب اگر یہی جیون کی ریت چل پڑی ہے تو کوئی مانے نہ مانے سبھی کو اس پر چلنا ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگیں۔ رمیش نے پیچھے سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور چہرہ ان کے سر پر رکھ دیا۔

Scanned with CamScanner

وہ ہاتھ اونچا کر کے اس کے سر پر پھیرتی رہیں۔ رمیش کو پتا نہیں کیوں اپنے بڑے ماموں کی بےاولاد بیوہ یاد آ گئی جسے سب ہی بھابھی کہتے تھے اور جو اسٹور میں پڑی کسی غیرضروری اور بھولی بسری چیز کی طرح جہلم میں اس کے چھوٹے ماموں کے بنگلے کے ایک کونے کی چھوٹی سی اجاڑ کوٹھڑی میں پڑی رہتی تھی۔ گھر والا کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ کوئی رشتےدار اگر باہر سے آتا تو پہنچتے ہی ایک بار ان سے ملتا اور پھر رخصت ہوتے ہوئے انہیں سلام کرنے کا فرض پورا کرنے جاتا۔ وہ دونوں موقعوں پر دعائیں دیتی جاتیں اور آنسوؤں کی بہتی ہوئی دھاروں کو اپنی گاڑھے کی میلی سی چادر سے پونچھتی جاتیں۔ رمیش کو حیرت تھی کہ جب انہیں پتا بھی ہے کہ ملاقاتی ان کا ہمدرد اور بہی خواہ نہیں، محض دکھاوے کے لیے رسم پوری کرنے آیا ہے تو وہ روتی کیوں ہیں۔ اتنے میں کار کا ہارن بجا۔ پرانی طرزِ زندگی کو الوداع کہنے کے لیے ماتاجی کو بس اتنی ہی مہلت مل سکی۔ انہوں نے گھبراہٹ میں جلدی سے آنسو پونچھے اور کھانا لگانے کے لیے اٹھ گئیں۔

میز پر مختلف کھانے تھے۔ گابےگابے پکنے والے گوشت کی بھی ایک ڈش آج موجود تھی۔ گوشت کو میٹ کے نام سے پکارا جاتا۔ دستور کے مطابق صرف مرد اور لڑکے اسے کھا سکتے تھے۔ عورتیں تو اسے ہاتھ لگانا بھی پاپ سمجھتیں۔ اندو باپ کی شہ پر ماتاجی کی نظر بچا کر کچھ نہ کچھ میٹ اچک لیتی۔ ماتاجی کو پتا چل جاتا تو بہت خفا ہوتیں۔ ڈاکٹر شرما خلافِ معمول آج کھانے کی میز پر خوب چہک رہے تھے لیکن یہ تسلیم کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا کہ وہ رمیش کے ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ کے لیے منتخب ہونے پر خوش ہیں۔ مدن رمیش سے دہرہ دُون، اکیڈمی اور فوج کی نوکری وغیرہ کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ اگر کسی سوال کا جواب رمیش سے نہ بن پاتا تو ڈاکٹر شرما اس کا جواب دینے لگتے۔ مدن کا جوش و جذبہ دراصل تمام بچوں کی مانند پورے ماحول کے مزاج کو منعکس کر رہا تھا۔

اندو چاہتی تھی کہ سروج جیسی شرمیلی لڑکی کو اپنے کمرے میں کھانا کھلائے مگر پتاجی کے کہنے پر اسے سروج کو لے کر میز پر آنا پڑا۔ سروج بڑی پتلی دبلی، بھولی سی لڑکی تھی۔ جب چلتی تو اس کے سرخ گالوں میں جیلی کی طرح ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی، جو بہت بھلی لگتی اور اس کی معصومیت میں اضافہ کرتی۔ گزشتہ سال میٹرک میں وہ سر گنگارام ہائی اسکول جیل روڈ میں اندو کی کلاس فیلو تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اندو تو لاہور کالج فار ویمن بال روڈ میں فرسٹ ایئر میں داخل ہو گئی اور سروج کے باپ نے جو صوبائی سیکریٹریٹ میں اپر ڈویژن کلرک تھا اسے گھر بٹھا دیا اور ایک چالیس سالہ رنڈوے ٹھیکیدار سے اس کی منگنی کر دی۔ وہ کرشن نگر میں اپنے چھ سات بہنوئیوں اور والدین کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی جس کی اوپر کی منزل آدھی بنا کر چھوڑ دی گئی تھی، کیونکہ جنگ کی وجہ سے قیمتوں میں جو ایک دم اضافہ ہوا تو بابوجی

کے لیے تکمیل ممکن نہ رہی۔ یہ مکان جو باہر سے کھنڈر نظر آتا تھا اس کے باپ کی ساری عمر کی کمائی کا ثمر تھا۔ پہلے تو وہ محلے کی لڑکیوں سے بھرے تانگے میں سکول آتی جاتی رہی، جب میٹرک میں پہنچی تو اس کے باپ نے سائیکل خرید دی۔

اندو کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ کچھ اس کے ساتھ کونونٹ میں پڑھتی رہی تھیں، کچھ اڑوس پڑوس کی لڑکیاں تھیں۔ سب ہی امیر گھرانوں سے تھیں اور تیزی طراری کے علاوہ خوداعتمادی بھی رکھتی تھیں۔ رمیش کی فلرٹیشی کو کسی نے فلرٹیشن سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا اور ویسے بھی وہ اسے باتوں میں اڑا دیتی تھیں۔ وہ ان سے دبتا تھا۔ البتہ سروج غریب طبیعت اور جھینپو تھی، اس کے پیغامِ محبت کو سنجیدگی سے لے بیٹھی۔ پھر اسے شاید اپنے برہمن بلکہ کشمیری برہمن ہونے کا گمان تھا۔ سمجھی کیا خبر بات لگی منڈپ تک جا پہنچے۔ دو بار وہ اپنی ہمت اور حوصلے کی آخری رمق تک کو بروئےکار لا کر اکیلی لارنس گارڈن کے تنہا گوشوں میں اس سے ملنے آئی۔ ایک دوپہر وہ اس کے ساتھ لارنس گارڈن کی ایک سُونی پہاڑی کے اوپر بھی گئی جہاں اسے رمیش نے پہلی بار ہونٹوں پر چوما۔ اسے کسی لذت، لطف یا دیرینہ پیاس کے بجھنے کا کوئی احساس نہ ہوا، البتہ خوف، گھبراہٹ اور گناہ کے احساسات کے درمیان اس کے سینے سے لگ کر ایک اُچٹتا سا تحفظ کا احساس ذہن میں ابھرتے ہی پھر سے کہیں غائب ہو گیا۔ رمیش کو محض بدنی تقاضوں کی تسکین اور سب کچھ جلد کر گزرنے پر وحشیانہ اصرار تھا، اور ادھر سروج محبت میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہر مشکل اور کٹھنائی سے لڑ مرنے کے تصورات میں گم تھی۔ ان کی مابین ان ملاقاتوں میں مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اس کے بعد رمیش کئی بار کرشن نگر کی کچّی گلیوں میں گندی نالیاں پھلانگتا اس کے گھر اندو کا پیغام پہنچانے کے بہانے گیا اور اسے ہجر و فراق کے دکھوں سے بھرے خط دے آیا۔ کئی بار سائیکل پر پیچھا کرتے ہوئے اسے راہ میں ملا، مگر وہ بس اتنا ہی کہتی، "اپنے جیسی کوئی لڑکی ڈھونڈیے۔ میں آپ کے قابل نہیں۔" وہ چند دنوں میں سروج کی ضد کے سامنے اپنی چاہت کی ہار بھول بھال گیا، لیکن اب بھی کبھی اس سے آمناسامنا ہو جاتا تو سوالِ وصل کرنا نہ بھولتا اور وہ بچوں کو ٹالنے والی مسکراہٹ مسکرا کر چل دیتی۔

تانگے والے نے پوچھا، "صاحب میکلوڈ تو ختم ہو رہی ہے۔ اب کدھر چلنا ہے؟"

"ہاں۔ اچھا، ریگل چوک کی طرف چلو۔"

چوک میں واقع ڈاکٹر یار محمد خاں کی نئی طرزِتعمیر کے مطابق بنی کوٹھی کے سامنے سے تانگا بائیں طرف مڑتا ہوا ذرا سی گھائی اتر کر بال روڈ پر چل پڑا۔ اندھیری، خاموش اور گیلی سڑک پر سست قدم گھوڑے کی ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ وقفے وقفے سے ایک تال کی صورت میں آ رہی تھی۔ اسکول کا بال روڈ پر کھلنے والا دروازہ، گھنے درختوں میں گھرا، تاریکی میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کے سامنے لاہور کالج فار ویمن کا دروازہ تھا۔اس کے چھوٹے

Scanned with CamScanner

بھائی مدی کو اس اسکول میں داخل کرایا گیا تھا کیوں‌کہ اس کے پتا سمجھتے تھے کہ رمیش کے نالائق رہ جانے میں سینٹ انتھونی اسکول بھی برابر کا قصوروار ہے۔ دومنزلہ مکان تحمّل سے کھڑے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ کہیں کوئی روشن کھڑکی اس پُھوار میں دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوتی۔ کچی پکی پُراسرار گلیاں سڑک کے دائیں بائیں نکل کر اندھیرے میں کہیں چلی جا رہی تھیں۔ اس سناٹے میں لوگ اپنے مکانوں میں گھسے گرم بستروں کی آسائش میں دن کے دکھوں کی چبھن ایک نئی صبح تک کے لیے بسرا چکے تھے۔ سامنے چند فٹ کی چڑھائی پر مال روڈ تھی۔ بارش ہلکی ہونے کے باوجود ڈھلان میں واقع ہال روڈ پر اس جگہ گھوڑے کے سُموں سے سڑپ سڑپ پانی بولنے لگا۔ سامنے ریگل چوک تیز روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ ریگل کو جانے والی گلی کے اوپر روشن بلبوں کے احاطے میں "فار ہُوم دی بیل ٹولز" فلم کا بینر لگا تھا جس میں گیری کوپر مُنڈے سر والی انگرڈ برگمین کے منتظر ہونٹوں کو چومنا چاہتا تھا۔ برابر میں کرپارام اینڈ سنز کی بہت بڑی دکان کا بورڈ ان روشنیوں میں گاہکوں کو بلا رہا تھا۔ جب کہ کرپارام اور اس کے سنز آرام سے گھر میں سو رہے ہوں گے۔ تانگہ چڑھائی چڑھ کر مال روڈ کو عبور کرتے ہوئے ٹمپل روڈ اور لارنس روڈ کے سنگم پر آ رکا۔ یوں لگتا تھا جیسے مال روڈ خاموشی اور بےرونقی سے گھبرا کر سیاہ چمکدار لحاف اوڑھے بجلی کے کھمبوں کے نیچے سو گئی ہو اور بے منزلہ عمارتیں اسے حیرت سے تک رہی ہوں۔ کھسں نی کٹھڑی میں بند کوچوان بولا۔ "صاحب، اب کدھر چلوں؟"

"دیکھو تم مجھے جیل روڈ پر ریس کلب کے قریب چھوڑ دو۔"

"اس موسم میں صاحب، اتنی دور! واپسی پر کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔"

"اچھا تم چلو تو سہی، واپسی کے بھی پیسے لے لینا۔"

"نہیں صاحب، موسم خراب ہے اور گھر دور ہے۔ میرا کمزور جانور صبح سے جُتا اب تھک کر چُور ہو گیا ہے۔ یہاں سے آپ کو ابھی اور تانگا مل جائے گا۔"

"اچھا تم سامنے لارنس روڈ پر لے لو اور کوئینز روڈ کے چوک پر چھوڑ دینا۔ ساتھ ہی پلازا سنیما ہے، وہاں سے تانگا مل جائے گا۔"

"چلیے، جیسا حکم۔"

وہ سیکرڈ ہارٹ کی عالیشان کیتھیڈرل کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ چھت پر ہرکھا کا سنگیت بج رہا تھا۔ بالکل اس کے سامنے پہنچ کر وہ تانگے والے سے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا، "ذرا روکو" اور نیچے اتر گیا۔ وہ سالہاسال اس سے ملحق اسکول میں پڑھنے کے لیے ہر روز آتا رہا تھا۔ان دنوں تو اسے بس ایک بڑی سی گنبد والی اونچی عمارت نظر آتی رہی جس کا مینار اور بھی اونچا تھا۔ آج رات پہلی بار جو اس کا پُرحشمت حسن اسے نظر آ رہا تھا وہ کہاں سے آیا؟ اس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر چھوڑ دیا۔ کھمبے کی روشنی میں ذرا

سی بھاپ ہوا میں اڑ کر غائب ہو گئی۔ اس نے سیکرڈ ہارٹ کیتھیڈرل کے پُرہیبت حسن کے آگے سر جھکا کر سینے پر کراس کا نشان بنایا کہ طالب علمی کے زمانے سے مسیحی آداب کا یہی ایک ڈھنگ اس کے ذہن میں باقی تھا۔ پھر تانگے کی سیٹ پر بیٹھ کر بولا، "چلو"۔ وہ اپنے اسکول کے آگے سے اسی سحر میں مبتلا گزر گیا۔ اسے اپنی ہمجولی اور استاد بھی یاد نہ آ سکے۔ کوئینز روڈ کے چوک پر آ کر تانگا رُک گیا۔ بارش تھم گئی تھی اور تیز ہوا چل پڑی تھی۔ آسماں پر بادل ایک بڑے سے روشن دھبے کے آگے مشرق کی سمت تیزی سے دوڑے جا رہے تھے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا۔ پلازا کے سامنے کوئی تانگا نہیں تھا۔ غالباً شو ختم ہو چکا تھا۔ اس نے تانگے والے کو پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ اس نے پہلے تو نوٹ کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور پھر اسے زندگی کی دعا دی۔ اس نے برانڈی کے بٹن بند کیے، چھڑی ہاتھ میں پکڑی اور دو میل کی مسافت پیدل طے کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو گیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ جب وہ لاہور پہنچا تو لاہور خراب موسم کی وجہ جلد سو گیا تھا۔ اس نے سوچا لاہور بھی عجیب سی موجی شہر ہے، پہچاننے پر آئے تو سوتے میں کسی اجنبی کو پہچان کے گلے لگا لے اور نہ پہچانے تو برسوں سے چھاتی سے چمٹے ہوئے کو جاگتی آنکھ میں ذرا جگہ نہ دے۔

وہ لارنس روڈ پر پیدل آگے بڑھا تو بائیں ہاتھ دومنزلہ عمارت تھی جس میں کبھی ایک انگریز خاندان رہا کرتا تھا۔ شاید اب بھی رہتا ہو۔ اس نے ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں جب سائیکل پر اکیلے ٹیوٹر کے گھر جانا شروع کیا تو وہ ہر صبح اس عمارت کے سامنے پہنچ کر کئی کئی منٹوں تک کھڑا پانچ فٹ اونچی چاردیواری کے اندر عمارت کے سامنے والے بڑے کھلے صحن میں ایک انگریز بچی کو گھڑسواری کی مشق کرتے دیکھتا رہتا۔ کبھی کنٹر اور کبھی دلکی چلتے گھوڑے پر بیٹھی بچی کے کمر تک لمبے، بوجھل سنہری بال ہوا میں اڑتے اسے بہت خوبصورت لگتے۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر پھیلے کچھ تاثرات اسے یاد رہ گئے تھے۔ کچھ شوق اور کچھ خوف کے علاوہ بہت سی بےیقینی وہاں پھیلی ہوتی کہ آیا وہ ٹرینر کے معیار پر پوری اتر رہی ہے یا نہیں۔ بچی کی نظر برآمدے کے کسی کونے میں کھڑے ٹرینر پر باربار پلٹ کے جاتی۔ ٹرینر کی انگریزی میں دی جانے والی ہدایات، کبھی اونچی اور کبھی نیچی آواز میں مستقل آتی رہتیں مگر اس کی صورت رمیش کو کبھی نظر نہ آ سکی اور نہ یہ سمجھ میں آ سکا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ لیکن ٹرینر کی آواز میں جو شفقت اور اضطراب وہ محسوس کرتا اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی کا باپ ہو گا۔ گھوڑا جب بیرونی دیوار کے متوازی دوڑتا ہوا اس کے سامنے سے گزرتا تو اس کے سیاہ کان، سر، پھڑپھڑاتے نتھنے اور ماتھے پر پھیلا سفید نشان اسے نظر آتا۔ رمیش بعض اوقات گھڑسواری کی تربیت دیکھنے میں ایسا ڈوب جاتا کہ اسے ٹیوٹر کے پاس پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ کبھی سنہری بالوں والی لڑکی بھی اسے فٹ پاتھ پر کھڑے نظارہ کرتے دیکھے، لیکن وہ اپنے ٹرینر کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش میں اس قدر منہمک ہوتی کہ کبھی اس کی طرف آنکھ

Scanned with CamScanner

انھا کر نہ دیکھ سکی۔ رمیش کو توقعات سے نفرت تھی، ان سب توقعات سے جو دوسرے آپ کو اپنے منتخب کردہ معیار پر پورا اترتے دیکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا کہ اندر دیوار کے ساتھ کھڑے سنبل کے بھاری بھرکم درخت سے ایک چھڑی کھینچ کر توڑے، ہمیشہ بند رہنے والے اس پھاٹک کے پٹ کھولے، اندر جا کر سڑسڑ تیں چار چھڑیاں اس ٹرینر پر برسائے اور کہے کہ بند کرو یہ توقعات کا کاروبار۔

آج وہ خوبصورت لڑکی پتا نہیں کہاں ہو گی۔ اب تو وہ ایک عورت ہی چکی ہو گی۔ ایک حسین عورت۔ سنہری بالوں اور گلابی ہونٹوں والی عورت۔ مجھے تو بھلا وہ کیا پہچانے گی، میں بھی اسے پہچان سکوں گا یا نہیں؟ کیا وہ گھڑسوار ہی سکی، یا وہ ٹرینر توقعات توقعات پکارتا زیرزمیں چلا گیا؟ اس نے دیوار کے اوپر سے اندر نظر ڈالی کہ شاید آج بھی وہ لڑکی اس صحن میں اپنے سنہری بال اڑاتی، کالے گھوڑے کو دوڑا رہی ہو گی۔ وہاں اسے صرف پالتی برآمدے کا بیولا سا کھڑا نظر آیا، باقی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

بائیں ہاتھ پر جڑیاگھر کی عقبی دیوار شروع ہو گئی اور دائیں ہاتھ پر نیم دائرہ بناتی ہوئی ایک چھوٹی سی میس روڈ نامی سڑک، بڑے بڑے محراب دار برآمدوں اور اونچی اونچی چھتوں اور درختوں بھرے کھلے کھلے گھاس کے لانوں والی کولونیل طرزتعمیر کی بڑی بڑی کوٹھیوں کی چاردیواریوں کے بیچوں بیچ رینگتی ہوئی۔ جہاں گنگارام اسپتال زیرتعمیر ہے وہاں یہ مرزنگ روڈ کو کاٹتی ہوئی ذرا سا بل کھا کر مختصر لانوں والی ان مقابلتاً چھوٹی کوٹھیوں کے جھرمٹ میں جا گھسے گی جن کی ہر لکیر سیدھی اور ہر زاویہ قائمہ ہے، اور پھر اس بستی میں گھومتی پھرتی واپس لارنس روڈ پر آ نکلے گی۔ عزیز کی کوٹھی بھی اسی بستی میں تھی۔ دائیں ہاتھ پر ڈاکٹر گنیش داس کی کوٹھی کے سامنے پہنچنے پر اس نے پتا نہیں کیوں اپڑیاں انھا کر عزیز کی دومنزلہ کوٹھی کو دیکھنے کی لاحاصل کوشش کی۔ اگر دن بھی ہوتا تو یہاں سے اسے وہ کوٹھی کیوں‌کر نظر آ سکتی تھی؟ بائیں ہاتھ پر جڑیاگھر کی دیوار اس کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کے اوپر بلندوبالا درختوں کی ایک اور اندھی دیوار چھائی ہوئی تھی جن کے پتے ہلکی پھوار تلے کبھی چھن چھنانے لگتے اور کبھی پھر سے خاموش ہو جاتے۔ اس دیوار کے پیچھے پتا نہیں جنگل کے کون کون آزادہ رو چوپائے اور پرندے، انسانوں کی کون کون سی توقعات کی تکمیل کے لیے قید ہیں۔ لارنس باغ کا دروازہ آ گیا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا، کیوں‌کہ اسکول جاتے ہوئے یہاں پہنچنے پر پہلی بار سیکرڈ ہارٹ کیتھیڈرل کا مخروطی مینار یک دم اس کے سامنے نمودار ہوتا اور آسمان میں کھبتا ہوا دکھائی دیتا۔ اسے دیکھ کر وہ لرز جایا کرتا تھا کیوں‌کہ اس کا مطلب ہوتا تھا کہ کوئی دم میں وہ اس کی بغل میں واقع اسکول پہنچ جائے گا جہاں اس دن بھی ہر دن کی طرح بات بات پر پکڑ ہو گی، جو کیا ہے اس کے لیے بھی اور جو نہیں کیا جا سکا اس کے لیے بھی۔ لڑکی اب جب اسے ڈرنے کی ضرورت نہ تھی تو وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پوری سڑک پر

صرف ایک دو کھمبے روشن تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اندھیرےمیں دبی سڑک کے روشن حصے بارش کے پانی کی عطاکردہ آنکھ سے اس مختصر مہلت میں جھٹ پٹ کچھ دیکھنا چاہ رہے ہوں، لیکن کیا کیا جائے، آج آنکھ ملی تو سب کچھ اندھیرے میں لت پت ہو کر رہ گیا۔ لارنس باغ کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر جاتی ہوئی سڑک پر دور تک کھمبے روشن تھے مگر ویرانی اور اداسی ویسی ہی تھی جیسی باہر والی سڑک پر۔ اس کے کنارے برسوں پرانے مہاں پُرکھوں جیسے رُکھ کھڑے تھے جن کے سیاہ موٹے تنے تھے اور ان کی روشنی کی زد میں آنے والی، نیچے نیچے کی سبز شاخیں اس وقت بالکل سیاہ رنگت اختیار کیے ہوئے تھیں اور بےجان اعضا کی طرح لٹک رہی تھیں۔ یوں خاموش، بارش میں کھڑے بھیگتے وہ بہت بےبس نظر آ رہے تھے، اتنے کہ جیسے مرضی کے خلاف زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔ درختوں کی اداسی اتنی گہری تھی کہ انھیں دیکھ کر رمیش پر بھی اداسی چھانے لگی اور اسے اپنی لاپور پہنچنے کی خوشی کو برقرار رکھنے کے لیے سیٹی بجانے کی مدد لینی پڑی۔ باغ کے اندر رمیش کی بائیں طرف مصنوعی پہاڑی تھی جو آہستہ آہستہ درختوں اور سبزے کے طفیل اصلی لگنے لگی تھی۔ اس کی اونچ نیچ کو اس نے پتا نہیں کتنی بار دوستوں کے ساتھ ناپا تھا، آنکھ مچولی کھیلی تھی، پرندوں کا غلیل سے نشانہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک گرمیوں کی چھٹیوں میں عزیز چھرّے والی بندوق لے آیا۔ وہ پوری دوپہر لارنس کی پہاڑیوں پر پرندوں کا شکار کرنے کی کوشش میں مارے مارے پھرتے رہے اور لے دے کر ایک کبوتر انھیں نصیب ہوا۔ گھر والے الگ ان کے بارے میں فکرمند رہے کہ کہاں گم ہو گئے۔ ڈانٹ ڈپٹ تو جو ہونی تھی سو ہوئی، مگر شام ہوتے ہوتے دونوں کو تیز بخار ہو گیا۔ رمیش کی ماتاجی کو پکا یقین تھا کہ جبوبشّا کے کارن ہوا ہے، جب کہ ڈاکٹر شرما کہتے تھے کہ لُو لگنے سے ہوا ہے۔

لارنس کے دوسرے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے چلتے چلتے اندر نظر دوڑائی۔ پورے باغ کی چوڑائی ختم ہونے پر مال روڈ کے کنارے واقع لارنس ہال تو اتنے اندھیرے میں کیا دکھائی دیتا، اس جگہ البتہ کسی دور کی کہکشاں میں جھلملاتے ننھے سے ستارے کی مانند ایک روشنی بلب کبھی نظر آتا کبھی غائب ہو جاتا۔ چند قدم آگے لارنس روڈ ریس کورس روڈ میں جا ملتی تھی۔ سنگم پر پہنچ کر وہ سراج نرسری کے، جہاں ہر قسم کے پھول پودے لگتا تھا جب سے دنیا بنی اس وقت سے لے کر آج تک دستیاب چلے آتے ہیں، اردو اور انگریزی میں لکھے لمبے لمبے بورڈوں کے ساتھ ساتھ گولائی میں دائیں طرف گھومتا ہوا، سڑک پر لگے ارجن اور سنبل کے بڑے بڑے جگادری درختوں کی اونچی محراب کے نیچے بچھی چھوٹی سی سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔ اس کے اندر کہیں جلد پہنچنے کا احساس قطعی نہیں جاگا تھا بلکہ میل بھر لگاتار چلتے رہنے سے اس کا بدن گرم ہو کر خودبخود بھڑکے ہوئے گھوڑے کی طرح خودمختار ہو گیا تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے لاپور سے، اور ان سب یادوں سے جن کے مجموعے سے اس کا اپنا ایک خاص لاپور بنتا تھا، گلے مل رہا

Scanned with CamScanner

ہو۔ اس کے اندر ہیجانی رَوئیں برق رفتاری سے چل رہی تھیں اور ان کے باعث اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اسے مبہم سے انداز میں لگتا جیسے ابھی کوئی بہت عمدہ، اچھی اور دل پذیر سی بات ایک دھماکے سے واقع ہو کر اس کی زندگی کو دائمی مسرتوں سے بھر دے گی۔ وہ خوش تو تھا لیکن اس کی خوشیوں کے ساتھ ساتھ کسی انجانے خوف کا سایہ بھی چل رہا تھا۔ کبھی اسے لگتا جیسے ابھی کہیں سے کوئی جانکاہ خبر پہنچے گی اور سب تلپٹ ہو جائے گا۔ لاہور سے ہمکنار ہونے کا اس کی سڑکوں پر چلتے رہنے کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا، اور اس شوق کی تکمیل کے لیے اسے صرف کل شام تک کی مہلت تھی۔ اتنا لمبا فراق اور اتنا مختصر وصال؟ کل غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی گاڑی اسے لاہور سے لے کر کلکتے روانہ ہو جائے گی۔ وہاں سے شاید برما جانا ہو اور کون جانے وہاں سے کدھر جائے اور کب واپسی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واپسی کبھی نہ ہو، یہاں صرف خبر ہی پہنچے کہ میدانِ جنگ میں کام آیا۔ لاہور کے تو کان نہیں جو سن سکے، آنکھ نہیں جو کسی کی موت پر رو سکے۔ یہ تو اپنی دھن میں چلتے رہنے والا بیپروا، مست متوالا ہے جو وقت کی طرح سدا جواں ہے۔ ہزاروں برسوں سے یونہی چلا آ رہا ہے اور سدا یونہی رہے گا۔ یہ کب کسی کا ماتم کرتا ہے۔ اس سوچ سے وہ چھ فٹ کا، بڑے دبدبے سے چلتا ہوا پُراعتماد جواں شخص سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ وہ سڑک سے اتر کر ایک پیپل کے درخت کے ہیولے کی طرف بڑھا، اسے دونوں ہاتھوں سے تھپتھپایا پھر جھک کر اس کی جڑوں میں سے انگلیوں سے مٹھی بھر مٹی نکال کر ماتھے سے چھوائی اور پھر دھیرے سے کہا، "لاہور مجھے بھولنا نہ۔"

دفعتاً تیز ہوا کا جھونکا اٹھا۔ درختوں کے پتوں پر جمع پانی یک دم سڑک پر برس پڑا۔ افسردگی مترشح کرتی ہوئی موت کی پرچھائیں آگے گزر گئی۔ وہ گانے لگا، چل چل رے نوجواں۔ تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ یوں سڑک پر اونچی آواز میں گانا افسرانہ شان کے خلاف ہے تو پھر خاموش ہو گیا۔

سامنے جیل روڈ کے پار، سڑک سے کچھ دور، پیچھے ہٹ کر جیل کی بلندوبالا پیلی ڈیوڑھی کھڑی تھی جو درختوں کے جھنڈ میں گھری، اندھیری رات میں اتنی ہی کالی تھی جتنا کہ اس کا لوہے کا اسی جتنا اونچا، بند سیاہ پھاٹک تھا۔ پھاٹک میں ایک چھوٹی کھڑکی تھی جس میں سے آتے جاتے قیدی جھک کر گزرتے۔ اس وقت وہ بھی سختی سے بند تھی۔ پھاٹک کے اوپر ڈیوڑھی کی چوڑائی جتنی لمبی سنگِ مرمر کی تختی تھی جس کے اوپر موٹے سیاہ انگریزی حروف میں "سینٹرل جیل لاہور" لکھا تھا۔ اس کے نیچے ایک بلب روشن تھا جس سے پھاٹک نظر آ رہا تھا لیکن روشنی زیادہ تر چھوٹی کھڑکی پر مرکوز تھی۔ ڈیوڑھی کی ایک طرف لکڑی کا تین ٹانگوں کا اسٹینڈ تھا جس کے درمیان میں کانسی کا موٹا تھال لٹک رہا تھا۔ ہر آدھے گھنٹے کے بعد سپاہی کھڑکی کھول کر نکلتا اور اس پر ضرب لگاتا تاکہ قیدی آدھے آدھے گھنٹے کے حساب سے اپنی رہائی کے وقت کا شمار رکھ سکیں۔ اسٹینڈ کے قریب

ایک سپاہی ہر وقت رائفل پکڑے الٹی شی کھڑا رہتا اور وقفے وقفے سے ڈیوڑھی کے سامنے مارچ کرتا ہوا ایک دو چکر لگا کر پھر اپنی جگہ پر آ کے کھڑا ہو جاتا۔ اس وقت بھی ایک سپاہی معمول کے مطابق خاکی پگڑی سر پر رکھے، رمیش جیسی برانڈی اور پتلون پہنے، سایہ سا بنا، رائفل سنبھالے اس جگہ الٹی شی کھڑا تھا۔ رمیش نے اپنی سرکاری وردی کی برانڈی، پتلون، جوتوں پر نظر دوڑائی۔ ایک واضح مشابہت ابھر کر اس کے سامنے آئی۔ یوں لگا جیسے وہ سپاہی وہ خود ہے جو رائفل سنبھالے دیش بھگتوں کو اندر بند کر کے چالیس روپے ماہوار کے عوض ان پر پہرا دے رہا ہے۔ کھڑی کھلی۔ اسے یوں لگا جیسے بیس سال پہلے پھانسی پا جانے والے بھگت سنگھ، راج گرو اور دت سرخ گلابوں کے ہار پہنے قیدیوں جیسی گھٹنوں تک پہنچتی نیکروں اور کمر تک آتی کرتیوں میں ملبوس (جن پر سیاہ لکیروں سے بڑے بڑے خانے بنے ہوتے ہیں) ننگے پاؤں، ہنستے ہوئے کھڑکی سے ایک ایک کر کے نکل رہے ہیں۔ ہر طرف کالے کالے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم پھیلا تھا جو انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا، جس سے ایک طرف ریس کورس روڈ کے آخری سرے پر مال روڈ کے کنارے بنے ہوئے گورنر ہاؤس اور دوسری طرف جی او آر اسٹیٹ اور اردگرد کی سڑکوں پر واقع بنگلے، جن کا طرزِ زندگی اپنے آپ میں سلطنت برطانیہ کی عظمت کو ہمہ وقتی خراج کی ادائیگی کا ایک انداز تھا، ہل کر رہ گئے۔ خاکی برانڈی والے سپاہی نے رائفل اٹھا کر جھٹ سے سیدھی کی۔ ٹھائیں۔ تینوں ہنستے ہوئے چہرے منہ کے بل گر کر اندھیری سیاہ زمین میں جذب ہو گئے۔ اژدہام ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ایک سپاہی گھٹنے پر ایک ضرب لگا کر کھڑکی کے اندر واپس داخل ہو رہا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ کا گجر بجا تھا۔ ٹھنڈی تیز ہوا اس کی برانڈی میں گھس آنے پر اصرار کر رہی تھی۔ کالے بادل گم ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ہلکے سرمئی بادل تیزی سے کہیں اڑے جا رہے تھے۔ چاند شریر بچے کی طرح بادلوں میں منہ دیے اپنی دانست میں چھپا ہوا تھا۔ پردوں میں چھپی اس کی کھلکھلاہٹ غور سے دیکھنے پر صرف نظر ہی نہیں آتی تھی بلکہ سنائی بھی دیتی تھی۔ اب شرمائی شرمائی چاندنی پھیلنے لگی تھی۔ ریس کورس روڈ اور جیل روڈ کے سنگم پر، چوک کے دائیں ہاتھ پر کسی مخیّر نے قیدیوں کے ملاقاتیوں کی سہولت کے لیے ہینڈپمپ لگوایا ہوا تھا۔ دودھ دہی کی ایک غلیظ سی دوکان تھی جو اس وقت بند تھی۔ کوئی دس بارہ مربع گز سرکاری زمین کسی نے لیپ کر اس کے اردگرد ایک ایک کھڑی اینٹ نصب کر کے حدبندی کرتے ہوئے نماز کے لیے جگہ مخصوص کر دی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی مسلمان ملاقاتی نماز پڑھتا ہوا نظر آ جاتا۔ دائیں طرف جیل روڈ پر کوئی سو گز جائیے تو سر گنگارام ہائی اسکول فار گرلز تھا جہاں اِندو اور سروج اکٹھی پڑھا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں صبح کے نو بجیں گے تو ہر طرف سے گہری نیلی قمیص اورسفید شلوار دوپٹے میں، پیدل، بائیسکلوں پر، تانگوں میں بھری ہر عمر کی لڑکیاں

Scanned with CamScanner

بستوں کا بوجھ سنبھالتی جوق در جوق، گھبرائی گھبرائی، جلدی جلدی چلتی پہنچنا شروع ہو جائیں گی۔ وہ چوک میں آ کر بائیں طرف مڑ گیا۔ سڑک نیم دائرے میں جیل کے گرد گھومتی چلی گئی تھی۔ اب اس کے دائیں ہاتھ پر، سڑک کے متوازی، گھاس کا کھلا میدان تھا۔ اس کے بعد سرخ اینٹوں سے بنے، جیل کے افسران کے بنگلے قطار میں کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جیل کی کوئی بیس فٹ اونچی کچی دیوار چل رہی تھی، جس کی مرمت اور لپائی وغیرہ خود قیدی ان میں سیڑھیاں لگا کے کر رہے ہوتے جس سے صورتِ حال عجیب مضحکہ خیز اور ساتھ ہی اداس سی نظر آتی۔ لگتا جیسے کوئی سوار اپنی سواری کندھے پر لادے مصروفِ سفر ہو۔ پوری انسانی زندگی شاید اسی طرح کی ہے۔ وہ اب ذرا اور تیز چلنے لگا۔اس کے بائیں ہاتھ پر بڑے بڑے لانوں والے پرانی وضع کے بنگلوں کی قطار چل رہی تھی۔ ہر ایک میں، آباد ہونے کا بھرم رکھنے کے لیے ایک آدھ بلب ادھر اُدھر روشن تھا۔ ان بنگلوں کی پشت پر گھڑدوڑ کا وسیع میدان تھا جو جی او آر اسٹیٹ نامی بہشت کے کناروں تک پہنچتا تھا جہاں کسی نوری سیارے سے آئی ہوئی مخلوق اس پوتّر، پاکیزہ ماحول کی خنک، خاموش مدھرتا میں بیٹھی پنجاب کے تپتے میدانوں اور غلاظت میں کلبلاتے کیڑوں جیسے انسانوں کے شہروں پر حکومت کرتی۔ اس میں بسنے والے ہندوستانی خاندانوں کے کرداروں میں بھی انگریزی پن یوں ڈولتا ہوا جھلکتا جیسے بھرے تالاب کی متحرک سطح پر کسی چیز کا عکس ابھرتی دبتی لہروں کے بلوں میں الجھ کر ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہوا قطعی غیرحقیقی اور بےبنیاد نظر آتا ہے۔

ایک روز اس کے پتا نے اسے بتایا تھا، "جیل کی اس دیوار کو مٹی کی گھٹیا سی کچی دیوار نہ جانو۔ اس کے پیچھے انگریز نے ہندوستان کا مستقبل قید کر رکھا ہے۔ قاتل اور ڈاکو تو اسے کھڑا کرنے کے لیے محض ایک بہانہ ہیں۔ اس کا اصل کام تو کچھ اور ہے، سیاسی حقوق مانگنے والوں کو دبانا، توڑنا، بکھیرنا۔ یہ ایک خوفناک مشین ہے جو غلامی کو دائمی بنانے کے لیے آقا غلاموں کے خلاف استعمال کرتے آئے ہیں۔ اس کے پیچھے جیل کی اپنی مخصوص دنیا آباد ہے جو ہماری دنیا سے مختلف ہی نہیں، کہیں زیادہ ظالمانہ بھی ہے۔ پھانسی کی کوٹھیاں ہیں، تنہائی کی کوٹھڑیاں ہیں، مشقت ہے، کوڑے ہیں، دشمنیاں ہیں، دوستیاں ہیں، مخبریاں ہیں، کمینگیاں ہیں، نشے ہیں، ذلتیں ہیں، پختہ مجرم ہیں، اور ان کا تختۂ مشق بننے والے معصوم و مجبور ناکردہ گناہ دوسرے قیدی ہیں۔ یہاں ظلم ہے، جبر ہے، تشدد ہے، ملی بھگت ہے، بلیک میلنگ ہے۔ غرض ہر خباثت اپنی بدترین اور ظالم ترین شکل میں یہاں موجود ہے۔ محبت، ہمدردی، عفو، حسنِ سلوک، وہ سب اعلا اقدار جن سے انسانیت عبارت ہے ان کو یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ بقا کے لیے جدوجہد اپنی ننگی اور بدترین صورت میں یہاں نظر آتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ رمیش نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور اپنے بیان کی کڑواہٹ ان کے

چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس بظاہر سردمہر، کم گو اور دوسروں سے اپنے معیار کے مطابق اعلا کارکردگی کا سختی سے متقاضی شخص اندر سے اتنا سخت نہ تھا جتنا اس کا خیال تھا۔ اس کے پتا نے اسے بتایا کہ آزادی کیا چیز ہوتی ہے۔ گاندھی، نہرو، سُبھاش اس کے لیے کس طرح بےغرض لڑ رہے ہیں۔ وہ جبر کا تلخ ذائقہ جانتا تھا اور اس کے دل میں اس کے خلاف شدید نفرت تھی، اس لیے اسے ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والے لوگ اچھے لگنے لگے۔ اسے گاندھی اور نہرو کی نسبت سبھاش زیادہ پسند تھا کیونکہ وہ جبر کے خلاف ٹکرا جانے کا درس دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود آج تک، باپ کی پابندیوں سے لے کر ملازمت کی بندشوں کے جبر تک، سب کچھ سہتا رہا تھا اور ٹکرانے کاحوصلہ اپنے میں پیدا نہ کر سکا تھا۔

اب اس کے بائیں ہاتھ پر مدّھم چاندنی میں "تاج پیلس" کی مقابلتاً نئی، دو منزلہ سفید عمارت نمایاں طور پر چمک رہی تھی۔ یہ اسے بہت پسند تھی۔ ادھیڑ عمر عورتوں جیسے پھیلے ہوئے بھاری بھرکم جسموں والی پرانی کوٹھیوں کے درمیان، اپنے تیکھے نقوش اور کاٹتے ہوئے تیز زاویوں اور چونے سے بنے سفید نقش و نگار کے باعث یہ عمارت ایک سولہ سالہ اسمارٹ لڑکی کی طرح کھڑی دکھائی دیتی جس نے پرانی وضع کے چاندی کے گہنے پہنے ہوئے ہوں۔ وہ سوچتا کہ جب کبھی اس کے ہاتھ پیسا لگا تو رہنے کے لیے بالکل ایسا ہی بنگلا تعمیر کرائے گا۔ اس سے آگے ریس کلب کا دروازہ تھا جس کے اندر اس نے جھانک کر تو بارہا دیکھا تھا مگر اسے عبور کبھی نہ کیا تھا۔ دروازے کے بالمقابل اور سڑک کے پار میدان تھا جس میں گھڑدوڑ کے دن تانگوں کا ایک ہجوم لگ جاتا، اور جو غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی خالی ہو جاتا اور جیل روڈ ایک بار پھر سنسان ہو جاتی۔ سامنے ذرا فاصلے پر دائیں جانب زنانہ پاگل خانے کی دومنزلہ عمارت کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ اوپر کی منزل پر کمروں کے سامنے بنا برآمدہ یہاں سے نظر آ رہا تھا جس کو لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگا کر بند کرنے کی کوشش میں جانوروں کے پنجرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس سرد بھیگی رات کے سنّاٹے میں، جو آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، وہاں قفس کی چیخ جیسی زنانہ آواز ابھری:

پکھیاں دی ڈار ہوسی
اوس ویلے آ مِلسو جدوں کفی تیار ہوسی

وہ ٹھٹھک کر انھی قدموں پر رک گیا۔ نسوانی آواز نے یہی بول اسی انداز میں گاتے ہوئے تین بار دوہرائے اور پھر ایک دلدوز نعرہ لگایا؛ ہائے او مار سُٹیا جے۔ وہ کھڑا سوچتا رہ گیا کہ یہ شکوہ اس نے کس کے خلاف کیا ہے؟ خدا کے، محبوب کے، دشمن کے، زمانے کے یا زندگی کے خلاف؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ اسے یاد آیا کہ پہلے کسی نے اسے بتایا تھا کہ رات گئے زنانہ پاگل خانے سے کوئی عورت پُرسوز آواز میں ماہیا گایا کرتی ہے اور پھر

سینٹرل جیل سے اس کا محبوب، جو اسے بھگا لے جانے کی کوشش میں قتل کر بیٹھا اور اب عمرقید کاٹ رہا ہے، اس کے جواب میں ماہیا گاتا ہے، اور یوں ان کے دلچسپ سوال جواب دیر تک چلتے رہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ عورت پاگل واگل نہیں ہے، صرف محبوب کا قرب پانے کے لیے پاگل ہی کر یہاں پہنچی ہے۔ وہ کچھ دیر سینٹرل جیل کی جانب کان لگائے کھڑا رہا۔ وہاں سے کوئی جواب نہ آیا، نہ پاگل خانے سے پھر ماہیا گانے کی آواز آئی اور نہ کوئی دلدوز نعرہ بلند ہوا۔ ہر طرف وہی سناٹا پھر سے طاری ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بوند پتوں سے پھسلتی ہوئی، سڑک پر ادھر ادھر گڑھوں میں جمع پانی میں ٹپک کر آں کرتی۔ چاند کا گویا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے وقفوں کے لیے بادلوں سے باہر رہنے لگا۔ بل کھاتی ہوئی کالی بھیگی سڑک ہزاروں آنکھوں والا شیش ناگ بنی پڑی چمکتی تھی۔

رمیش نے سوچا کہ اگر وہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہوتا تو ان بچھڑے ہوئے پریمیوں کو ملا دیتا۔ مگر ان ظالموں نے تو اسے اٹھا کر پتا نہیں کہاں پھینکا تھا کہ اب ایک کی آواز بھی دوسرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ریس کورس ختم ہوا تو دائیں ہاتھ پر جیل روڈ میں سے نکل کر لیں پور روڈ کہنے درختوں میں سے گزرتی جی او آر اسٹیٹ کو جا رہی تھی۔ سنگم کے اس کونے پر ریس کورس کے گرد کوئی دس گز لمبی اور چھ فٹ اونچی پکی دیوار بنا دی گئی تھی تاکہ سڑکوں پر لوگوں کو دوڑتے ہوئے گھوڑے مفت میں دیکھنے کا موقع نہ مل سکے۔ مگر ہر بار دوڑ کے دن عام لوگ اور بچے اس دیوار پر بیٹھے نلانکت گھڑدوڑ کا لطف اٹھایا کرتے۔ رمیش نے بھی اس دیوار پر بیٹھ کر چند بار ریس دیکھی تھی۔ بچوں کے قد کاٹھ کے چھوٹے چھوٹے آدمی سرکس کے جوکروں کی سی مختلف تیز رنگوں کے ریشمی کپڑوں سے بنی وردی پہنے، تنومند گھوڑوں پر بیٹھے، دور سے دھم دھم زمین کو دھمکاتے ہوا کی طرح اس کے سامنے سے گزر کر اگلے موڑ پر غائب ہو جاتے، لیکن ان کی دھمک کچھ دیر تک زمین کے سینے سے ابھرتی، دیوار میں سے گزرتی، اس کے اوپر خاموش، اکڑوں بیٹھے لوگوں کے بدنوں میں سرایت کرتی رہتی۔ وہ اداس ہو کر اپنی ٹھوڑیاں ملے گھٹنوں پر رکھ لیتے۔ اتنے میں دائرے کے پرلے موڑ پر وہی گھوڑے پھر نمودار ہوتے۔ پویلین میں کھلبلی مچ جاتی۔ گھوڑے بدن کے ریشے ریشے کا زور لگاتے اگلے چڑھے آ رہے ہوتے۔ پویلین سے غلغلہ بلند ہوتا۔ ہر شخص بےچین ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور پھر دوڑ ختم۔ کئی گھوڑے سواروں کو لیے اپنے زور میں دیوار تک چلے آتے، اور پھر ٹٹھنے پھڑپھڑاتے، دُلکی چلتے واپس لوٹ جاتے۔ چلیے ٹھیک ہے دوڑ تو ہو گئی، مگر اس میں ریس کھیلنے والی بات کب اور کہاں نکلی، یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

پاگل خانے کے گھنٹے کی آواز ایک بار ابھری، بھیگے ماحول میں تھراتی رہی، اور پھر وہی خاموشی آہستہ آہستہ ماحول پر طاری ہو گئی۔ تو رات کا ایک بج گیا تھا۔ یہ ساتھ ہی جو سڑک دائیں طرف کو نکل گئی ہے دو سو گز جا کر عین مردانہ پاگل خانے کے بڑے

دروازے میں گھس جاتی ہے۔ جیل روڈ پر سیدھا آگے، زیادہ دور نہیں یہی بس تیس چالیس قدم پر، سنبل کا ایک مہاں، پُرکھوں جیسا پُرشکوہ رُکھ آدھا اس کی کوٹھی کے لان میں ہے اور آدھا کھٹے کی باڑھ میں سے باہر نکلا کھڑا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو چھوا۔ وہ خاموش رہا۔ رمیش نے جانا سو رہا ہو گا، اور اندر پتاجی بھی تو سو رہے ہوں گے۔ بالمقابل کنیئرڈ کالج فار گرلز، لوہے کے سیاہ پھاٹک کے اندر اپنی سرخ اینٹوں کی عمارت سنبھالے، سنبل، پیپل اور دوسرے بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ میں چھپا آرام کر رہا تھا۔ چونکہ یہ کالج ہے اس لیے یہاں طالبات کی کوئی وردی مقرر نہیں۔ لڑکیاں یہاں بھی تانگوں اور اپنی اپنی سائیکلوں پر آتی ہیں مگر سو گنگارام ہائی سکول جتنا طالبات کا اژدہام نہیں ہوتا۔ چند ایک کاروں پر آتی جاتی ہیں۔ یہاں کی بیشتر طالبات کے چہروں اور لباس پر والدین کی مالی آسودگی واضح طور لکھی ہوئی پڑھی جا سکتی ہے۔ اس نے لکڑی کے بند پھاٹک کے اوپر سے ایڑیاں اٹھا کر اپنے لان میں چوروں کی طرح نظر دوڑائی۔ برآمدے میں کرسیوں کی قطار لگی تھی۔ ان کے آگے بان کی گھٹیا سی چارپائی پر سیاہ ڈھیری سی پڑی تھی، اللہ یار چوکیدار اپنے لحاف میں سردی سے چھپا سو رہا تھا۔ رمیش کا کالا لیبراڈار نسل کا بڑا سا کتا ٹامی، چٹکی ہوئی چاندنی میں ایک بڑے سے رواں سیاہ دھبے کی طرح اپنے آبائی وطن جیسی سردی کا حظ اٹھاتا، ہر گملے اور ہر درخت کے تنے کا سونگھ سونگھ کر معائنہ کرنے اور کسی مانوس بُو کو دوبارہ سونگھنے کی ہوس میں مصروف تھا۔ اس نے سوچا یہ ابھی ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرے گا، جو اس نے کیا۔ رمیش مسکراتے ہوئے بولا، "باسٹرڈ! سدا سے ایسا ہی ہے۔" ٹامی سے اس کی رفاقت بہت گہری تھی۔ جہاں بھی وہ جاتا ٹامی ساتھ ہوتا۔ ایک بار رات گئے وہ شانتی سے مالٹوں کے باغ میں مل کر واپس آ رہا تھا تو پتاجی برآمدے میں اس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔

"تم اپنے کمرے میں روشنی جلتی اور کتاب کھلی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"جی، میں ایسے ہی ذرا باہر نکلا تھا تو دیکھا کہ یہ ٹامی کسی بلّی کے پیچھے بھاگتا ہوا ادھر پچھواڑے نکل گیا۔ میں نے سوچا کہیں کھو نہ جائے۔ اسے پکڑ کے لا رہا ہوں۔"

انھوں نے اس کے بہانے کو شک کی عینک سے جانچنے کی کوشش تو کی مگر کچھ پلّے نہ پڑ سکا، ہونہہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔ پھر بولے، "اچھا جاؤ، اپنا پڑھو وڑھو۔"

رمیش کو یاد آیا کہ ایک بار اس کے پتا کے ایک دوست ٹامی کو اپنی اسی رنگ و نسل کی کتیا سے ملانے کے لیے مانگ کر اپنی کار میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ دو دن کے بعد وہ اسے واپس چھوڑ گئے۔ اس کے بعد سے اس کی یہ حالت تھی کہ کار اپنی ہو یا کسی مہمان کی، ذرا دروازہ کھلا رہا اور وہ جھٹ سے داخل ہوا۔ وہ ایک پُراشتیاق مسافر کی صورت، سوال پہنچنے کی تمنا میں پچھلی سیٹ پر اکڑوں بیٹھ جاتا اور کسی طور باہر نکلنے پر راضی نہ ہوتا۔ آخر کھینچ کھانچ کر بدقت نکالا جاتا۔

Scanned with CamScanner

اس نے سوچا کہ نہر صرف سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہے، دیر اب ہو ہی چکی ہے، کیوں نہ اسے بھی دیکھ آؤں۔ ویسے بھی کوٹھی والے سب لوگ اندر نرم اور گرم بستروں میں، بےخبر پڑے سو رہے ہیں، کچھ دیر اور سو لیں۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ساتھ ہی افسوس نے بھی سر اٹھایا کہ اس کے وہاں سے مستقل چلے جانے پر کہیں بھی کسی کمی کا کوئی شائبہ نہیں۔ یہ حرامی شامی بھی، جس کا دن رات کا ساتھ تھا، اپنی کھال کے اندر ویسا ہی مطمئن اور خوش، لاں کی گھاس میں لوٹیں لگاتا پھرتا ہے جیسے ہمیشہ لگایا کرتا تھا۔ اس پر اوس سی پڑ گئی۔ پوری شام میں پہلی بار سردی کا احساس جاگا۔ اس نے برانڈی کا کالر چڑھا کر گلے کا بٹن بھی بند کر لیا۔ نہر کے پل پر پہنچنے کے لیے سڑک اردگرد کی سطح سے اونچی اٹھنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ ذرا سا جھک کر چڑھائی چڑھنے لگا۔ سڑک کوئی سات آٹھ فٹ اونچی ہوئی ہو گی تو اسے سڑک سے بہت پیچھے ہٹ کر اپنے بنگلے کی بیرونی دیوار کے آخر میں، بنگلے کو پشت دیے شانتی کے باپ لالو کے کوارٹر کی چھت نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک کمرہ مویشیوں کے لیے بنا ہوا تھا۔ کوارٹر کے آخر پر مالنوں اور امرودوں کے باغ کی تین ساڑھے تین فٹ اونچی کچی دیوار باغ کے ساتھ ساتھ اور پیچھے کو دوڑتی چلی گئی تھی۔ اس سے آگے سکھ نالہ تھا جو نہر کے پیچھے سے گزر کر ادھر آتا اور تمام سال گندی ناک کی طرح رستا اور ہو کے بھبھکے اڑاتا رہتا، مگر برسات میں بپھر جاتا۔ اس کے پرلے کنارے پر پاگل خانے کے سپاہیوں اور اسٹاف کے دوسرے آدمیوں کے کوارٹر تھے جو نہر کے کنارے کنارے بنی ہوئی پکی سڑک تک آ پہنچتے تھے۔ یہاں باغ کا ایک ذرا سا کونا دکھائی دیتا تھا، باقی باغ اس کے تصور نے اسے پورا کر کے دکھا دیا، جس کے پتے پتے سے وہ خوب واقف تھا۔ یہ سُونا باغ اس کا پرانا ہمدم و ہمراز اور پناہ گاہ تھا۔ سبھی درخت اس کے دوست تھے اور ان پر بیٹھنے والے پرندے اس کے غمگسار تھے۔ بچپن میں باپ سے پٹتا تو سیدھا یہیں آتا، اپنی بےبسی پر کھل کر رونے کے لیے۔ سلگتی آگ جیسے ذہن کے زخم چاٹنے کے لیے یہ اچھی جگہ تھی۔ مشکل سبق یہیں یاد کیے جاتے۔ امتحانوں کی تیاری بھی یہیں ہوتی۔ وہ گھنٹوں کسی تنے سے کمر لگائے خوابوں میں گم رہتا۔ فیل ہونے کے بعد اکیلے بسورنے کے لیے ٹھیک مقام تھا۔ جواں ہوا تو ہر نئی محبت پر ایک نئی طرح کی میٹھی دکھن کا لطف یہیں اٹھاتا۔ یہ گویا اس کی سلیمانی ٹوپی تھی جسے پہن کر وہ نہ صرف لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا بلکہ یہاں آ کر اسے دکھ درد کے لیے اندر سے ایک سہار اور برداشت پیدا ہوتی محسوس ہوتی۔ گرمیوں کی کئی دوپہریں اس نے وہاں شوخ گلہریوں کی اچھل کود دیکھنے میں گزاریں، برسات کی کئی شامیں جلتے بجھتے فضا میں تیرتے پھرتے جگنوؤں کی آنکھ مچولی دیکھنے میں بتائیں، پچھلی سردیوں کی بہت سی راتیں شانتی کے اور اپنے جواں جسموں کی مسحورکن بھول بھلیوں کو دریافت کرنے میں صرف کیں۔ وہ ایک عجیب حیرت انگیز تجربہ

تھا جسے لمس کا کھیل کہنا چاہیے! ہاتھوں کا لمس، ہونٹوں کا لمس، سینے کا لمس۔ جسموں کے اندر ایک خاموش تلاطم ابھرتا چلا آتا۔ بدن کا تشنج، اعصاب کا کھچاؤ، ریشوں کا تناؤ بڑھتا چلا جاتا۔ پھر اس میں آسودگی پیدا ہونے لگتی، اور آخر طوفان تھم جاتا، طغیانی اتر جاتی۔ اس کے بعد اس کے بدن کا سُونا پن اور گہرا ہو جاتا۔ سناٹا گونجنے لگتا۔ تنہائی اس کے اندر ایک مہیب آواز میں بولنے لگتی۔ اسے لگتا جیسے اس کا بدن ایک خالی گنبد ہے جس کے اندر شانتی اپنا بھرپور ننگا بدن لیے، دیوانوں کی طرح چیختی ہوئی، تانڈو ناچ رہی ہے اور اس کے چھ ہاتھوں میں خون ٹپکاتے ہوئے چھ انسانی سر ہیں، اور ہر سر اسی کا سر ہے۔ وہ اپنے کپڑے سنبھالتا ہوا شانتی سے کوئی بات کیے بغیر فوراً اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ چوہوں کے پیچھے بھاگتا نامی اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے آگے آگے دلکی چال میں چل پڑتا اور ہر چند قدم کے بعد مڑ کر اسے دیکھتا جاتا۔ جب وہ یوں انجان بنا شانتی کو ننگی پیٹھی چھوڑ کر، پیٹھ دیے، سر نیہوڑائے آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہوتا تو شانتی کا دل چاہتا کہ وہ کسی دن اسے مار کر کھا جائے اور پھر اسے اپنی انتڑیوں میں سے نکال کر غلاظت کا ایسا ڈھیر بنا دے جیسا غلاظت کا ایک ڈھیر دنیا کی نظروں میں وہ خود ہے۔ پھر تو یہ کہیں نہ جا سکے گا۔

وہ سرگوشی میں پوچھتی، "کل آؤ گے؟"

اس کی آواز کان میں پہنچتی تو رمیش کا ذہن اب کویا شانتی کے جسم کی ٹھوس حقیقت سے اور نشے کے اترنے کی کیفیت سے گھبرا کر جھنجھلا اٹھتا۔ وہ سختی سے کہتا، "نہیں۔ کبھی نہیں۔"

دوسرے دن شام تک وہ دل میں اپنے عہد پر غیرمتزلزل انداز میں ڈٹا رہتا۔ جوں جوں شام رات میں ڈھلنے لگتی، اپنے کوارٹر میں بیٹھی شانتی کے بدن کے خاموش بلاووں کو ریڈیو سگنل کی طرح رمیش کا بدن پیہم موصول کرتا رہتا۔ رات گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ واضح، شدید اور پُراصرار ہوتے چلے جاتے اور اس کا بدن اس کے اپنے اختیار سے باہر ان سے پہلے اندرونی طور پر جاگتا، پھر سلگتا، پھر بھڑک اٹھتا اور جواباً سگنل بھیجنے لگتا۔ جب پاگل خانے کا گھنٹا رات کے بارہ کا گجر بجاتا تو اس کا بدن کسی سیخ پا گھوڑے کی طرح اس کے قابو سے باہر، اس کے واضح حکم کے خلاف، اپنے آپ اٹھتا اور باغیچے میں پہنچ جاتا۔

نکھری چاندنی میں نہر کا مٹیالا پانی چھوٹے چھوٹے بھنور بناتا پل کے نیچے سے تیزی سے نکلتا اور پھر اپنی معمول کی رفتار پر لوٹ کر آہستہ آہستہ آگے پھسلتا جا رہا تھا۔ دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ کولتار کی کچی سڑک تھی جس پر بجلی کے کھمبے نصب تھے جن میں سے چند ایک اب روشن بھی تھے۔ بائیں کنارے پر شیشم کے اونچے اونچے گھنے پیڑوں تلے درختوں کی چھال بچھی ہوئی تھی جس پر صبح شام انگریز اور دیسی صاحب اور میمیں گھڑسواری کے لیے نکلتیں۔ بائیں کنارے سے ہٹ کر نیچے کیتال پارک تھا جس کے دھول مٹی

Scanned with CamScanner

سے اٹے، گڑھوں سے بھرے راستے تھے جن پر سائیکل بھی آسانی سے نہ چل سکتی تھی۔ کچھ کوٹھیاں بن رہی تھیں، کچھ بن چکی تھیں۔ مالکوں نے فخر کے اظہار کے لیے سری نواس اور انند بھون جیسے نام ان کی پیشانیوں پر لکھ رکھے تھے۔ ان کے پیچھے کھمبوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ داہنی کنارے پر سڑک تک پاگل خانے کے ملازمین کے کوارٹر چلے گئے تھے۔ ان کے سامنے سکھ نالہ بہتا تھا جو کینال پارک کے قریب نہر کے نیچے گھس جاتا اور پھر کوارٹروں کے آگے جھاڑجھنکاڑ میں پھنسا اپنی بدبو سمیت سطح زمین پر آ ظاہر ہوتا، اور پھر رمیش کے بنگلے کے عقب میں واقع مالنوں اور امرودوں کے باغ کے پاس سے گزرتا ہوا پاگل خانے کے دوسرے ڈاکٹروں اورکمپونڈروں کی بستی کے بیچوں‌بیچ سے بل کھاتا سینٹرل جیل کے پیچھے جا پہنچتا اور وہاں سے فیروزپور روڈ پر بنے پل کے نیچے سے بہتا ہوا آگے پتا نہیں کہاں نکل جاتا تھا۔ شنید تھی کہ راوی میں جا گرتا ہے۔ آج چونکہ بارش ہوئی تھی اس لیے اس وقت خوب بھرا ہوا چل رہا تھا۔ رمیش نہر کے پل کے درمیان میں چڑھ کر بیٹھ گیا اور نیچے نہر کی طرف ٹانگیں لٹکا لیں۔ سامنے چاند اٹکا کھڑا نیلی نیلی روشنی دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔ فضا میں پھیلا نمی کا بوجھ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر اسے نچوڑا جا سکتا تو پانی کے فوارے پھوٹ پڑتے۔ جیل روڈ نہر کا پل عبور کرتے ہی ویرانے میں داخل ہو جاتی۔ کوئی آدھے میل آگے جا کر گورا قبرستان کی سیاہ لکڑی کی ڈیوڑھی، لوہے کا سیاہ پھاٹک اور چاردیواری تھی۔ دن میں اکا دکا گزرنے والوں کو درختوں کے نیچے قبروں کے سنگ مرمر کے تعویذ اور کراس عاقبت کی یاد دلاتے نظر آ جاتے۔ باقی ہر طرف ہُو کا عالم ہوتا۔ کوئی میل بھر آگے زمین پر جگہ جگہ ہوئی ریلوے لائن تھی۔ اس پر ایک مملوک الحال پھاٹک تھا جس سے آگے لاہور چھاؤنی کی سنسان حدود شروع ہو جاتی تھیں۔ پوری زندگی میں رمیش ایک آدھ بار ہی وہاں تک پہنچنے کا حوصلہ کر سکا تھا۔ قبرستان کا خیال دل میں آیا تو اسے یوں لگا جیسے موت کا وحشی پنجہ اس کے گال کو چھوتا ہوا گزر گیا ہو۔ اس کے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ کمیشن ملنے کے بعد جب تک محاذ سے اس کے چند ساتھیوں کے مرنے کی خبریں نہ ملی تھیں اسے یوں لگا کرتا تھا جیسے موت کسی دوسری دنیا کی چیز ہو جس کا دائرۂ کار اس تک نہیں پہنچتا۔ اب جب کہ وہ خود محاذِ جنگ پر جا رہا تھا، موت کا مبہم موہوم بیولا وقفے وقفے سے اس کی آنکھوں کے آگے گھوم سا جاتا۔

اسی نہر کا پانی سیدھا کھڑے ہونے پر اب اس کی ناف کے اوپر تک پہنچتا تھا لیکن بچپن میں جب وہ تیرنا سیکھ رہا تھا تو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے ڈبونے کے لیے بہت تھا۔ زندگی کی بےشمار صبحیں، دوپہریں اور شامیں اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ اس کے کنارے رنگارنگ کھیل کھیلنے اور شرارتیں کرنے میں گزاری تھیں۔ گزرتے تانگوں اور آتے جاتے راہ گیروں کے باوجود ننگے ہو کر پل پر سے چھلانگیں لگائی جاتیں اور پھر جھٹ سے نیکریں پہن کر اپنی حرکت پر، جس کا اُنے جانے والے کوئی نوٹس نہ لیتے، ہنستے ہنستے

کھاس لگے کنارے پر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ عزیز کا ایک چچازاد ہاشم اندروں بھاٹی گیٹ میں رہتا تھا اور اسلامیہ سکول میں پڑھتا تھا۔ عزیز کی اس سے بہت دوستی تھی۔ اس کے والدین غالباً غریب تھے اس لیے ابھی تک وہ لوگ اس غلیظ گلی میں واقع اپنے پرانے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ چھٹی کے دن وہ عزیز سے ملنے نہر کے کنارے چلا آتا اور وہاں چپ چاپ بیٹھا ان لوگوں کو شرارتیں کرتے دیکھتا رہتا اور انکریزی ملی پنجابی انکریزی لب ولہجے میں بولتے سنتا رہتا۔ شرمیلا بہت تھا، جب کبھی نہر میں نہاتا تو نیکر کے علاوہ بنیان بھی تن سے الگ نہ کرتا۔ اسے زیادہ تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے کنارے کے قریب قریب رہتا۔ ایک بار اصرار کیا گیا کہ ہاشم بھی ننگا ہو کر پل پر سے چھلانگ لائے۔ وہ نہ مانا تو زبردستی اسے ننگا کر کے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر مچھلی سی طرح نہر کے درمیان میں اچھال دیا گیا۔ ایک غوطہ، دوسرا غوطہ۔ جب اسے تیسرا غوطہ آیا تو سب نے کہا، گیا۔ اسے جتنا تیرنا آتا تھا وہ اتنی بھی کوشش اپنے بچاؤ کے لیے کرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ عزیز نہر میں چھلانک لگا کر تیزی سے تیرتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور غوطے کھاتے، بہے جاتے ہاشم کو کنارے کی طرف زور زور سے دو تین دھکے دیے۔ وہ کنارے کے قریب ہوا تو رمیش نے کہنی کا ہاتھ پکڑ کے دوسرا بازو نہر میں پھیلا کر اسے بالوں سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ وہ اپنی عریانی سے بےنیاز کنارے پر بیٹھا کھوں کھوں کھانسنے لگا۔ اس کے منہ اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا اور وہ حواس باختہ سا تھا۔ اب سب اسے نیکر پہنا رہے تھے مگر وہ یہی نہیں رہا تھا۔ یہ شاید ظلم کے خلاف اس کا احتجاج کا طریقہ تھا۔ بدن تو اس کا بھی ویسا ہی تھا جیسا سب کا تھا، تو پھر یہ خواہ مخواہ چھپانے کیوں پھرتا تھا؟ اسے ہماری طرح ننگے ہو کر چھلانگیں لگانے میں کیا تکلیف تھی؟ چہرے پر پردہ ڈال دو تو ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا ناممکن ہو جائے۔ انہیں کچھ کچھ افسوس بھی تھا کہ بےچارے کے ساتھ کچھ زیادتی ہو گئی۔

بابو رام پردیسی پاگل خانے کے اُن پڑھ سپاہیوں میں ایک نوجوان میٹرک پاس سپاہی تھا۔ اس کی رہائش کینال پارک میں اپنے کسی صاحبِ حیثیت رشتےدار کے پاس تھی۔ وہ تقریباً رمیش اور عزیز کا ہم عمر تھا۔ انہیں نہر میں نہاتا دیکھ کر وہ بھی ان کے پاس چلا آتا، لیکن یہ لوگ اسے منہ نہ لگاتے تھے۔ اس کا نام اور تخلص دونوں ہی انہیں جاہلانہ اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے۔ گرمیوں کی ایک شام کنیئرڈ کالج ہوسٹل کی لڑکیاں کالج کی بس میں ایف سی کالج کسی تقریب میں شمولیت کے لیے جا رہی تھیں کہ نہر کے کنارے پہنچ کر بس خراب ہو گئی۔ سب لڑکے اسے دھکا دینے لگے۔ بابورام پردیسی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس پھول گئی۔ وہ نہایت پُرجوش انداز میں لڑکوں کو حکم دینے لگا، "مت دھکا لگاؤ اس بس کو۔" پھر اس نے نیکر اتار کر الگ پھینک دی اور کمر کو آگے پیچھے حرکت دینے لگا۔ اتنے میں بس اسٹارٹ ہو گئی اور وہ بس کے پیچھے پیچھے "یہ دیکھو، یہ دیکھو" کے نعرے لگاتا ہوا بھاگنے لگا۔ جب بس آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے جھٹ سے نیکر پہن لی

Scanned with CamScanner

اور سر ہاتھوں میں پکڑ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کسی نے اس سے بات نہیں کی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سب نے کپڑے پہنے اور بابورام پردیسی کو خوفزدہ آنکھوں سے دیکھتے اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

سردیوں کی ایک دوپہر کو رمیش باقی دوستوں سے پہلے نہر پر پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر نہر کے کوسے کوسے پانی سے اکیلا کھیلتا رہا، پھر بور ہو کر باہر نکل آیا۔ اتنے میں ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی بہت لمبی سی گاڑی، جس کی چھت اتری ہوئی تھی، چلاتا ہوا نہر کے کنارے سڑک پر اس کے قریب آ کر رکا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے رمیش کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور اس سے باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گاڑی آگے بڑھاتا گیا۔ رمیش ساتھ ساتھ چلتا اسے اس کے سوالوں کے جواب نہایت تمیز سے دیتا گیا، تمھارا نام کیا ہے؟ کہاں پڑھتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ چڑھائی چڑھتے چڑھتے پل کے قریب چوک میں پہنچ گئے۔ پھر اس نے کہا، "میرے ساتھ چلو گے؟ اس شاندار گاڑی میں سیر کرا کے تمھیں یہیں واپس چھوڑ دوں گا۔" وہ یہ فرمائش سن کر پہلے تو حیرت زدہ ہوا، پھر اسے شک گزرا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے جواب دیا، "تو ٹھینک یو۔" اس پر وہ شخص بولا، "اگر میں تمھیں اٹھا کر گاڑی میں بٹھا لوں تو تم کیا کرو گے؟" اس نے غصے سے کہا، "تم مجھے ہاتھ تو لگا کر دیکھو۔" نہر میں بہت سے انجانے نہانے والے لڑکے حالات کی غیرمعمولی صورت کو بھانپتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ گاڑی والے نے جب لڑکوں کو اکٹھا ہوتے دیکھا تو گاڑی بھگا کر لے گیا۔ سب لڑکے اس کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ وہ کیا کہتا تھا۔

دوسرے دن صبح نو بجے ماتاجی رمیش کو اٹھا رہی تھیں۔ "اٹھو! ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" شانتی کی ماں رکھی کمرے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ وہ بستر سے "ٹی ٹی" ہو رکھی جھاڑو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سلام کیا۔ دعائیں دیں۔ رمیش نے پوچھا، "لالو، سنگت رائے سب ٹھیک ہیں؟ شانتی اب جھاڑو میں بھی تمھارا ہاتھ نہیں بٹاتی؟"

شانتی کی ماں نے پھیکی پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بتانا شروع کیا، "چھوٹے صاحب پچھلی چھٹی پر آپ سیدھے شملے چلے گئے۔ بڑے صاحب، اندو دیدی، ماتاجی، کاکاجی سب وہیں پہنچے ہوئے تھے، اور وہاں سے آپ واپس نوکری پر چلے گئے۔ اس لیے آپ کو پتا نہیں چلا۔ شانتی کی تو آپ کے جاتے ہی شادی کر دی تھی۔ اب تو خیر سے اس کی گود میں دو مہینے کا بیٹا بھی ہے۔ آج کل وہ یہیں آئی ہوئی ہے۔ ہمیں رامو نے آپ کے آنے کا بتا دیا تھا۔ وہ تو آپ کو سلام کرنے کے لیے صبح سے کوٹھی کے کئی چکر لگا چکی ہے۔ آپ سو رہے تھے۔ اب بچے کو دودھ پلانے گئی ہے۔ بس آتی ہی ہو گی۔ بھگوان کی کرپا سے اسے ویسا ہی گھر مل گیا جیسا وہ چاہتی تھی۔ بڑی نصیبوں والی ہے۔ اس کا سسر اور پتی روہتک میں ہڈی کا

کام کرتے ہیں۔ دیہاتوں سے مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں پنجر خرید کے دلی کارخانوں میں بھیجتے ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ بڑے دھنوان ہیں جی وہ، ہماری طرح کنگلے تھوڑا ہی ہیں۔" بات ختم کرتے کرتے اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ سینکڑوں میل کے فاصلے پر بسنے والے سمدھیوں کی دولت کا محض تذکرہ کرنے سے چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے صدیوں سے غربت و افلاس کی ماری ہوئی وہی پرانی رکھی سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس کی بات سن کر رمیش گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ اٹھا، باپ کا ڈریسنگ گاؤن پہنا اور اندر کے برآمدے میں ڈھلے ڈھلائے دن کی چمکتی دھوپ میں بیٹھنے کے لیے نکل آیا۔ وہ صحن سے آگے پکی دیوار کے اوپر سے باغیچے میں لگے مالٹے کے درختوں کی چمکدار سبز پھننگوں میں لٹکے ہوئے نارنجی مالٹوں کو گھورنے لگا۔ پھر دور صحن کے ایک کونے میں بنی رسوئی میں مصروف رامو کو آواز دی۔

"رامو! مجھے چائے یہیں دے دو۔"

"اندر میز پر آپ کی حاضری لگا دی ہے۔ چائے بھی وہیں ہے۔"

"ارے بھائی یہیں دے دو۔"

عام حالات میں تو رامو شاید اس کی بات نظرانداز کر دیتا۔ مگر اب چونکہ وہ پردیسی ہو گیا تھا اور آج شام کو جا بھی رہا تھا، رامو بجلی کی سی تیزی سے رسوئی سے نکلا، اس کے سامنے میز رکھی اور اس پر ناشتہ چن دیا۔

"پتاجی اسپتال چلے گئے؟"

"آج ڈرائیور نہیں آیا۔ وہ پہلے اندو اور منی کو کالج اور اسکول پہنچائیں گے اور پھر ہسپتال سے ہوتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔ بس آپ کے حاضری کھاتے کھاتے وہ یہاں ہوں گے۔"

"اور ماتاجی؟"

"وہ آپ کے کپڑے دھو رہی ہیں تاکہ شام تک تیار ہو سکیں۔"

اتنے میں شانتی صحن میں داخل ہوئی۔ رامو بولا، "لیجیے آ گئی چھمک چھلو! یہ اسکول سے ہی لاٹ صاحب کی بچی بن کر لوٹی تھی، شادی کے بعد سے تو نخرا بالکل ہی نہیں سنبھلتا۔"

لالو کی خواہش تھی کہ اس کے بچے کسی طور پڑھ جائیں۔ سنگت رائے تو پہلی جماعت ہی میں اسکول سے ایسا بھاگا کہ پھر لوٹ کر نہ گیا؛ لالو کا کوئی جتن کارگر نہ ہو سکا۔ شانتی جوں توں کر کے جب تیسری جماعت تک پہنچ گئی تو مسیحی تبلیغی مشن والوں نے، جو اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ان کا مذہب اختیار کرنے والے اچھوت افلاس اورجہالت میں نہ گھرے رہیں، اسے اپنے رہائشی اسکول میں مفت تعلیم دینے کے لیے منتخب کر لیا۔ کتابوں کے علاوہ وہاں رہنا، کھانا، حتیٰ کہ کپڑے جوتے بھی مفت تھے اور دیگر

اخراجات کے لیے پانچ روپے ماہانہ نقد ملتے۔ مگر شانتی جب آٹھویں جماعت میں دوسری بار بھی فیل ہو گئی تو مشنری اسکول کی انتظامیہ نے اسے گھر واپس بھیج دیا۔ لالو کو بہت دکھ ہوا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ یہ پڑھ لکھ کر نرس تو ضرور ہی بن جائے گی، مگر مشنری سکول کی ہیڈمسٹریس نے اسے بلا کر نہایت افسوس سے بتایا کہ لڑکی کا می پڑھائی میں نہیں اس لیے مشن دوسرے حق دار بچوں کی بجائے اسکول اور ہوسٹل کے اخراجات اس پر مزید ضائع نہیں کر سکتا۔ لالو پریشان ہو گیا کہ اب کیا کرے۔ آٹھویں تک پڑھی بیٹی کا ہاتھ کس بھنگی کے ہاتھ میں پکڑا دے۔ اس کے اپنے عزیزوں میں تو کوئی اس کا اہل تھا نہیں۔ جھاڑو کوٹھے کا کام کرنے سے اب وہ منکر تھی۔ رکھی البتہ خوش تھی کہ اچھا ہوا شانتی گھر واپس آ گئی کوٹھی اور مویشیوں کے محنت طلب کام میں اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ شانتی نے کمروں اور غسل خانوں کی صفائی کی حامی بھر لی لیکن کموڈ صاف کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

رمیش نے اب شانتی کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے رنگ ڈھنگ ہی اور تھے، بڑی بڑی کالی آنکھیں، لمبا قد، بھرا بھرا گہرا سانولا جسم جو کپڑوں کے بند توڑ کر آزاد ہونے کے لیے کسمساتا، بےقرار نظر آتا۔ کیا یہ وہی شانتی تھی؟ چھ سات سال پہلے جب وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک کالی سی کچرا لڑکی، میلا کچیلا کچھا پہنے گھر کے پچھواڑے امرودوں اور مالٹوں کے باغ میں اس کے اور اندو کے پیچھے پیچھے، ڈرتی ڈرتی گھوما کرتی تھی۔ اور منع کرنے کے باوجود کچے امرود اور مالٹے اچک اچک کر توڑتی اور بھاگ جایا کرتی۔ اب تو اس کا بدن گلا پھاڑ پھاڑ کر منادی کر رہا تھا۔ رمیش کو دیکھ کر اس پر کپکپاہٹ اور بوکھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ بدن سنسنا اٹھتا۔ دل بےطرح دھڑکنے لگتا۔ وہ اسے آنکھ اٹھا کر جی بھر کے دیکھنے کی طلبگار بھی ہوتی اور نظریں نیچی کیے کہیں بھاگ جانا بھی چاہتی۔ لیکن پاؤں زمین میں گویا دھنس کے رہ جاتے۔ وہ حوصلہ کر کے کبھی ایک نظر اس کی آنکھوں میں ڈھونڈتی کہ شاید ان میں اس کی گرما گرم طلب کے عوض کہیں تھوڑی سی چاہت چھپی ہوئی ہو۔ سامنے رمیش کی پٹارا سی کھلی آنکھیں اسے سالم نگلے جا رہی ہوتیں۔ ایک دن ہاتھ میں جھاڑو پکڑے کھڑی شانتی کے دونوں گداز بازو پکڑ کے رمیش نے کہا کہ آج رات بارہ بجے پچھواڑے کے باغیچے میں آنا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ صرف ایک بار اس کی آنکھوں کو نظروں سے ٹٹولا کہ دیکھے وہاں کیا ہے۔ وہاں پیار یا اپنائیت جیسی کوئی چیز نہ تھی، صرف شرارت پر تلے بچے کی آنکھیں تھیں جن میں مردانہ تحکم کا عنصر تھا۔ کوئی پانچ ہزار سال پہلے کالے جو کبھی اس ملک کے مالک تھے، گوروں کے آگے میدانِ جنگ میں پورا ملک ہار گئے تھے اور سب مفتوحین کی طرح آزادی خودداری اور عزت نفس بھی ہار بیٹھے تھے۔ دراوڑ عورتیں فاتح آریاؤں کے بستروں پر بزور و جبر سجائی گئیں۔ پنڈت رمیش کمار شرما کا اپنا رنگ بھی پتا نہیں کون کون اچھوت دراوڑ رگوں سے کس کس طرح

گزرتا ان کے رنگ میں رنگتے رنگتے اب تک سنہرے سے گندمی ہو چکا تھا۔ آنکھیں نیلا رنگ کھو کر سیاہ ہو چکی تھیں اور بال سنہرے نہ رہے تھے، کالے ہو گئے تھے۔ آج پھر وہی کھیل قدرے مختلف صورتِ حال میں کھیلا جانے والا تھا۔ ایک دراوڑ عورت جس کے خاندان کو عیسائیت اختیار کرنے کے بعد ہزاروں سالوں میں پہلی بار کبھی کبھی اپنے انسان ہونے کا شائبہ گزرنے لگا تھا، آج ایک آریائی کو، بلکہ نیم آریا کو، یہ رضا ملنے جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شانتی کے بےقرار بدن کی طلب کی صدا کو رمیش کے بدن نے اسی انداز کے کانوں سے سنا تھا جس انداز کے حلق سے شانتی نے اسے صدا دی تھی۔ جیسے پاگل خانے سے مایا گائے کا جواب سینٹرل جیل سے آیا کرتا تھا۔

رمیش شانتی کو دیکھ کر ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ کیا یہ وہی شانتی ہے؟ ماں بننے کے عمل میں تو وہ گویا ایسا سونا ہی گئی تھی جو ابھی کٹھالی سے کندن بن کر نکلا ہو۔ اس کا گہرا سانولا رنگ اب صاف ہو کر سونے کے بندوں سے لگا کھا رہا تھا۔ چہرے پر وقار اور اعتماد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ رمیش کے دل میں شانتی کے خلاف نفرت سی اٹھتی تھی کہ اس نیچ عورت نے اچھوت ہوتے ہوئے اسے پیار کرنے پر مائل کیا اور دنیا کا غلیظ ترین گناہ اس سے سرزد کروایا۔ لیکن اس نفرت کے باوجود وہ برابر اس کے سپنوں میں آتی اور ان میں وہ اس سے ہنس ہنس کے باتیں کرتا اور خوش ہوتا۔ اس وجہ سے اسے شانتی پر اور بھی غصہ آتا۔ سامنے سے آتی ہوئی شانتی کے بدن کی کشش محسوس کرتے ہوئے اور پرانی رغبتیں یاد کر کے وہ نفرت اس وقت گویا کہیں بہہ گئی۔ کسے ہوئے بدن کا تناؤ اس کے خون میں ایک بار پھر گھلنے لگا۔ لمس کا احساس اس کی انگلیوں کی پوروں پر جلنے لگا۔ اس کے جسم کی چاہت دفعتاً اس کے اندر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ باپ کی قمیص اور پاجامے سے جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھا شرمایا۔ اس نے سوچا کہ وہ کپڑے کسی طرح اس کے بدن کے سلگاؤ سے بےخبر رہ سکتے تو مناسب ہوتا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سلگاؤ اس کے باپ کی تکریم کے منافی ہو۔ شانتی گود میں بچہ اٹھائے آگے بڑھتی آ رہی تھی۔ اس کا ہر قدم گویا اس کی بےشرمی اور گناہ کے نتیجے کو اس کی ہستی کے مرکز کے قریب تر لا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھری ٹھوس حقیقت اور اس کے محض تصور میں اتنا بڑا فرق ہو گا، اس کا اندازہ اسے پہلے نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح زمین پھٹ جائے اور وہ یوں ہی بیٹھا بیٹھا نیچے چلا جائے۔ خیال گزرا کہ شاید گود خالی ہو اور اس کے اندر کچھ نہ ہو، شاید وہ اپنے جسم کی، جذبات بھڑکانے والی جسمیت کے ساتھ تنہا چلی آئی ہو۔ وہ برآمدے کی تین سیڑھیاں چڑھ کر اس کے سامنے ایک فاتح کی طرح آ کھڑی ہوئی۔ کھلے ہونٹوں سے بےاختیار مسکراہٹ ہر طرف صبح کے اجالے کی مانند پھیل رہی تھی۔ تازہ دنداسے سے کاسنی مسوڑھے اور مضبوط سفید دانت سنگھار کی کوشش سے زیادہ اس کی مضبوط قوتِ ارادی کے مظہر

Scanned with CamScanner

تھی۔ اس کی مائع مخملیں سیاہ آنکھوں کو قرار نہیں تھا۔ چاہت اور محبت میں ڈوبی نظریں ایک لحظے کو رمیش کے چہرے پر تڑپتیں، وہاں کچھ تلاش کرتیں اور دوسرے لحظے تفاخر اور ممتا میں ڈوبی اپنے بازوؤں کے درمیان سینے سے چمٹائی گٹھڑی کی طرف پلٹ جاتیں۔ وہ شاید رمیش کے چہرے پر بھی اسی تفاخر اور ممتا کا کوئی شائبہ ڈھونڈتی تھیں جو شانتی کے اپنے دل میں بچے کے لیے تھا۔

شانتی نے کہا۔ "چھوٹے صاحب، سلام۔"

وہ ہنسنے لگا جیسے ٹامی سے کھیلتے وقت ہنستا تھا۔ "بیاہ کر لیا شانتی، اور ماں بھی بن گئیں؟ بڑی جلدی کی تم نے۔ کیا نام رکھا ہے اس کا؟"

"رمیش۔" یہ کہتے ہوئے وہ بچے کا کپڑا ہٹا کر دونوں بازو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے نزدیک دوہری ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بدن کی مہک میں اب نومولود بچے اور چھاتیوں سے رسنے والے دودھ کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ نام سن کے شل ہو گیا جیسے ایک کان کے اندر سینٹرل جیل کا اور دوسرے میں پاگل خانے کا گھنٹا بیک وقت بج اٹھے ہوں۔ کاش میں نے نام نہ پوچھا ہوتا۔ کیا ضرورت تھی مجھے؟

ہلانے جلانے سے بچے کی اگرچہ ہوبھی سے تیوریاں چڑھ گئیں اور بند آنکھیں اور مچ گئیں، لیکن یہ دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ ننھے رمیش کے چہرے کی تراش بالکل اس کے اپنے پتاجی کے چہرے جیسی ہے جس کے اوپر للو بھنگی کی ناک رکھی ہے۔ وہ کانپ گیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ وہ جو اتنے لائق ڈاکٹر، اتنے بڑے آدمی ہیں اور جنھیں ہر لمحے اپنی ان خوبیوں کا پورا احساس رہتا ہے اور جو میرے باپ بھی ہیں۔ میں نے ان کی یہ گت بنا دی؟ وہ اگرچہ بڑے جابر ہیں مگر اتنی بڑی سزا، اور وہ بھی میرے ایک اچھوت کو ہاتھ لگانے کے گناہ کی سزا۔ یہ ان کے لیے اتنی کڑی ہو گی کہ پشت در پشت رہتی دنیا تک سدا چلتی رہے گی اور میرے پتاجی بیچارے نیچ بھنگی در بھنگی بنتے چلے جائیں گے۔

شانتی نے سرگوشی میں کہا۔ "رمیش بابو یہ آپ ہی کا..." پھر کچھ وقفہ دے کر اضافہ کیا۔ "...بھنگی ہے۔"

پھر اس نے پیچھے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ اسے وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی اینٹ وغیرہ مل جائے۔ لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ شادی کے بعد سے خاص طور پر اسے یوں فرش پر بیٹھنے میں تامّل تھا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ آٹھ دس کرسیاں قطار میں لگی ہوئی تھیں، لیکن ان پر بیٹھنے کی وہ جراًت نہ کر سکتی تھی، اور نہ رمیش میں اتنی ہمت تھی کہ اپنے ان مہمانوں کو کرسی پر بٹھا سکتا۔

"بیٹھ جاؤ شانتی۔" رمیش نے کہا۔

اسے یوں فرش پر بیٹھنا، جبکہ اس گھر کا اکلوتا پوتا اس کی گود میں ہو اور وہ اس کی ماں بھی ہو، بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ لیکن ان حالات میں دل واپس جانے پر بھی کس

طور آمادہ ہو سکتا تھا! مجبوراً وہ برآمدے کے ستون سے کمر لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔

جب شانتی مشنری اسکول چلی گئی تھی تو رمیش کو اس کی غیرحاضری کا کچھ پتا نہ چلا تھا۔ کئی برسوں کے بعد ایک دن جب وہ واپس آ گئی تو خیال آیا کہ ہاں یہ بھی ایک چیز یہاں ہوا کرتی تھی۔ اب وہ صاف کپڑے پہنتی تھی اور بال سلیقے سے بنانے لگی تھی۔ دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا کہ وہ پل بھر کے لیے بھی اپنے بدن کی آگ سے غافل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دلکش بدن کو یوں چُراتی چھپاتی رہتی جیسے اس پر نادم ہوا۔ اسے اپنے کسے ہوئے جسم اور خاص طور پر پھیلی ہوئی قوسوں کا ہمہ وقت احساس رہنے لگا تھا۔ جوانی یوں زور کر کے اس پر چڑھی تھی جیسے نیلے آسماں پر ساون کی کالی گھٹا خودبخود موج درموج دوڑی چلی آتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ خود پریشان ہو جاتی کہ قدرت کو اسے اتنا بہت سا نوازنے کی بھلا کیا سوجھی۔ کسی جھاڑو دینے والے، چرس پینے والے بھنگی کا تو بہت کم میں کام چل جاتا۔ اسکول جانے سے پہلے جو بھوکی نظریں زمیں پر گرے امرودوں کی تلاش میں بھٹکا کرتی تھیں، اب جوانی کے رس نے ان میں طلب و شیفتگی کی تحریر ہویدا کر دی تھی، جسے رمیش نے پڑھ کر اسے بلایا۔ کسی غریب کے ہاتھ اگر کہیں سے دولت لگ بھی جائے تو وہ دنوں میں لٹ پٹ کے خالی ہو جاتا ہے۔ وہ اسی سے ڈرتی تھی۔ وہ پچھواڑے باغ میں اپنے بدن کا سارا خزانہ ڈھیر کر کے اپنی دانست میں اپنی ذمےداری سے فارغ ہو گئی۔

بہت دنوں کے بعد آج شانتی کے سامنے پھر اس کی تمناؤں کا مرکز موجود تھا۔ وہ اس کے گلے سے لپٹ کر خوب رونا چاہتی تھی۔ یہی تو ایک سکھ ہے جو بغیر اپنے پیاروں کے کہیں میسر نہیں آ سکتا وگرنہ اور کیا ہے جو روپیا نہیں خرید سکتا۔ لیکن وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس کا نہیں، نہ کبھی ہو گا۔ اگر وہ چاہے بھی تو اچھوت کو کیسے اپنا سکتا ہے۔ مگر اپنی اس حسرت کا کیا کرے! اسے بھی اس نے اپنی دوسری حسرتوں کی مانند امید کا بادبان لگا کر طوفانی سمندر میں دھکیل دیا کہ شاید کسی روز کنارے سے ہمکنار ہو سکے۔

رمیش کے دل میں خیال گزرا کہ اگر شانتی کے ہاں لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوتی تو غضب ہو جاتا۔ یہ بچت ہو گئی۔ اس جھوٹے سے بہانے کے سہارے اس نے ضمیر پر چھایا گردوغبار دھو ڈالا۔ اس کا دُھلنا تھا کہ ایک بار پھر شانتی کے دعوت دیتے ہوئے بدن نے اس پر دیوانگی سی طاری کر دی۔ اس کے اپنے بدن سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے چاہا کہ کاش اس وقت رامو اور ماتاجی گھر میں نہ ہوتے تو وہ ایک بار، صرف آخری بار شانتی کے بدن سے لپٹ جاتا، اس میں اپنا آپ ضم کر دیتا۔ اسے سامنے بیٹھی، چمکتے ہوئے سفید دانتوں سے ہنستی شانتی یک دم بہت پیاری لگنے لگی۔ رمیش نے آواز اور لہجے میں اپنائیت

Scanned with CamScanner

کا رس گھولتے ہوئے پوچھا، "اری کیوں ہنسے جا رہی ہے پاگلوں کی طرح؟"

"مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔"

"ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔"

"نہ بابا، میں نہیں بتاتی۔ اس پر تھپڑ پڑتے ہیں بڑے زور کے۔"

یہ سنتے ہی رمیش پر چھائی ہوئی چاہت کی دیوانگی وہیں دھری رہ گئی۔ چہرہ یک دم سرخ ہو گیا۔ چنگاریاں چھوٹنی بند ہو گئیں اور وہ شل ہو گیا۔ اسے یاد آیا جب شانتی نے ایک رات اس سے پوچھا تھا کہ اگر اسی طرح منگت کی دوستی اندو سے ہو جائے تو تمھیں کیسا لگے گا۔

شانتی نے اب اس کے تیور پھر بدلتے دیکھے تو کہا، "میں نے غلط بات کہی تھی، مگر سچ مانو کہیں مذاق میں نہیں۔ اپ برا مان گئے۔ سخت سزا دی۔ یاد ہے میں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ اب پھر مانگتی ہوں۔ چھوٹا رمیش بھی میرے ساتھ معافی مانگتا ہے۔" شانتی نے گود میں لیے بچے کے دونوں ہاتھوں جوڑ دیے۔ "بس اب تو دل سے بھلا دیں۔"

رامو نے رسوئی سے آواز دی۔ "رمیش جی! برتن اٹھا لوں؟"

"نہیں۔ ابھی چائے پی رہا ہوں۔"

شانتی نے پوچھا، "اب کب آئیں گے آپ؟ میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں دیکھنے کو۔"

رمیش بالکل بُجھ گیا تھا۔ سب جذبے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اسے اپنا آپ بہت خالی لگنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ شانتی اب اٹھے اور جائے۔ وہ اسے، اپنے آپ کو اور اس بچے کو اور زیادہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس نے رکھائی سے کہا، "سال لگ جائے گا۔"

"ہائے رام! ایک سال؟ اتنی لمبی جدائی میں تو میرا دم نکل جائے گا۔"

اتنے میں ماتاجی اندر سے آ گئیں۔ شانتی پر نگاہ پڑتے ہی بولیں، "اری تو پھر آ گئی؟" پھر رمیش کو مخاطب کر کے کہنے لگیں، "صبح سے چار چکر لگا چکی ہے۔ یہ تو کوئی پاگل ہے۔ بچے کی ماں بن گئی ہے مگر بچپنا نہ گیا۔ جب دیکھو رمیش، رمیش کرتی پھرتی ہے۔ کوئی خط آیا؟ خود کب آئے گا؟ مجھے خط سناؤ۔ اندو کو تو تم جانتے ہو اپنی مرضی کی ہے۔ خط سنانے کے لیے وہ اس سے بیس چکر بھی لگوائے تو یہ لگاتی ہے۔" ماتاجی کے نزدیک شانتی کا رمیش سے معصوم لگاؤ کچھ اس نوعیت کا تھا جیسا کہ وحشی جانوروں کو اپنے رکھنے والوں سے ہو جایا کرتا ہے۔ کہ ان کی پل بھر کی جدائی میں بےچین ہو اٹھتے ہیں۔ یہ سوچنا تو ان کے تصور کی حدوں سے بہت دور تھا کہ ان کے آپس میں زن و شو والے تعلقات بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اچھوت تو انسانوں سے ایک درجہ کمتر مخلوق ہے اور ان کا بیٹا اتنا نیچ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سے تعلقات پیدا کر لے جو انسان ہی نہ ہو اور جانوروں کے زمرے میں آتا ہو۔ ماتاجی نے رمیش سے بات جاری رکھی۔ "چل بیٹا اٹھ۔ نہا لے۔ آج ڈھائی بجے پنڈت دیوی دیال وکیل کے ہاں ٹمپل روڈ چلنا ہے بردکھاوے کے لیے۔"

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ شادی تھوڑا ہی ہے۔ بردکھاوا ہے۔ وہ پہلے مانیں تو، پھر منگنی ہو گی، اس کے بعد کہیں شادی کی نوبت آئے گی۔ بیٹا، بڑی سُندر لڑکی ہے۔ بی اے پاس۔ گاتی بہت اچھا ہے۔ اور پھر یہ کہ بڑے دھنوان لوگ ہیں۔"

شانتی کا اپنی چاہت کے ذکر پر فخر سے مسکراتا ہوا منہ بردکھاوے کا نام سن کر کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے پچھلے باغیچے میں دور کہیں بیٹھے کوے کی کائیں کائیں سنائی دے رہی تھی، جیل روڈ پر تانگا کھینچتے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی، لیکن اس کے سامنے گویا خاموش فلم چل رہی تھی۔ دو اجنبی چہروں کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے؛ پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ وہ چپکے سے اٹھی، بیٹے کو چھاتی سے چمٹایا؛ اور خاموش فلم کو چلتا چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔ آنسو اس کی بےخبری میں آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ بندہ جو چاہتا ہے اسے مل تھوڑا ہی جایا کرتا ہے۔

دو بجے کے قریب کھانے سے فارغ ہو کر رمیش اور اس کے پتا باہر لان میں نکل آئے۔ باقی لوگ دیوی دیال کے گھر جانے کی تیاری میں زورشور سے مصروف تھے۔ لان میں پاگل خانے سے آئے ہوئے دو پاگل کیاریوں میں پودوں کی نلائی کر رہے تھے۔ پھاٹک کے قریب لالو بھنگی پاگل خانے سے چھٹی ہونے کے بعد جھاڑو دے رہا تھا۔ وہ دونوں لان میں ٹہلنے لگے۔ اس کے کاندھی بھگت پتا قیمتی سودیشی گرم سوٹ ڈاٹے اسے اپنے لمبے تجربات کی روشنی میں انگریزوں کے ساتھ نوکری کرنے کے ڈھنگ پر انگریزی زبان میں بھاشن دے رہے تھے۔ چھوت چھات سے متنفر پتاجی اچھوتوں کے ایسے ہمدرد تھے کہ اپنے صاف ستھرے چہرے پر خاموشی سے لالو بھنگی کی ناک لگوا لی اور کبھی کٹوانے کا نہ سوچا۔ اس خیال پر وہ اپنے دل میں بھی نہ ہنس سکا بلکہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

کنیئرڈ کالج میں چھٹی ہو چکی تھی۔ گرم گرم روشن میٹھی دھوپ میں بھیگے درختوں، گیلی گھاس اور شوخ پھولوں کی مہک میں بسی جیل روڈ خاموش، سنسان ہونے کے باوجود اداس نہیں صرف سوچتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ رمیش بچپن سے پاگلوں کو اپنے لان میں کام کرتے دیکھتا آیا تھا۔ ان پر جب بھی نظر پڑتی وہ ایسی غیرواہم سی چیز لگتے جیسے مٹی، جس میں نہ کوئی احساس ہو، نہ تمنا، نہ حسرت، نہ طلب، نہ شعور اور نہ زندگی۔ رمیش ایک پاگل کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے کام میں مصروف تھا اور وہ ساتھ ہی، دھیمی آواز میں مگر اتنی ہی تیزرفتاری سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ رمیش نے سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ پلے نہ پڑا؛ صرف اتنا پتا چلا کہ شکووں کا کوئی طومار ہے۔ اور شکوے کرنے کا مطلب ہے کہ اس شخص نے امید کی لو، چاہے کتنی ہی ماند کیوں نہ پڑ چکی ہو، ابھی اپنے اندر بجھنے نہیں دی۔ اس نے دوسرے پاگل کی طرف نظر دوڑائی۔ وہ قطعی خاموش، مطمئن اور ایک اوسط آدمی کی سی سنجیدگی سے کام میں مصروف تھا۔ ان

Scanned with CamScanner

دونوں کے چہرے دیکھنے سے ہی پتا چل جاتا تھا جیسے وہ دو مختلف کروں کے باسی ہوں۔ ان کے درمیان سوائے کام کی نوعیت اور پاگل خانے کی وردی دو مشترک چیزیں تھیں۔ رمیش نے پہلے پاگل سے پوچھا، "کیوں بھئی، یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ اپنے آپ میں مست رہا۔ جب وہی سوال بار بار دوہرایا گیا تو وہ کسی حد درجہ خوفزدہ انسان جیسی بھیانک طور پر کھلی آنکھیں لیے، کھڑپی ہاتھ میں پکڑے، خودحفاظتی کے انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پتاجی نے آواز دی، "رمیش واپس آ جاؤ۔ یہ مقابلتاً محفوظ ہیں لیکن اتنے بھی نہیں۔ نہ جانے تمہیں کتنا بڑا دشمن سمجھ لیں۔ یہ علاج کی تمام منزلوں سے گزر چکے ہیں۔ یہ صحت یاب تو نہیں ہوں گے مگر ان کی حالت اور زیادہ خراب بھی نہیں ہو گی۔"

یہ پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر کا فیصلہ تھا۔ رمیش کو سن کر مایوسی ہوئی۔ زندگی کتنی ظالم ہے کہ ہر کسی سے اپنی ہی مانگے کی عطا کی قیمت مع سود کے اس کی آخری سانس تک وصول کرنے پر مصر رہتی ہے۔ لالو بغل میں جھاڑو دبائے اور اپنی بلب جیسی ناک کے نیچے جھاڑو جیسی بکھری مونچھیں پھیلائے چھوٹے صاحب کو معلوم کرنے چلا آ رہا تھا۔ رمیش نے چوری چوری ڈاکٹر شرما کے چہرے پر یہ یقین کرنے کے لیے نظر دوڑائی کہ ناک ان اپنی ہی ہے یا لالو کی لگی ہوئی ہے۔

مدن، اندو اور ماتاجی اپنے بہترین کپڑے پہنے باہر آ گئے۔ پتاجی ولزلے کار میں سب کو بٹھا کر خود شان سے چلاتے ہوئے پنڈت دیوی دیال ایڈووکیٹ کے گھر کے لیے چل پڑے۔ کیوں نہ ہو۔ کلاس ون افسر بیٹے کا رشتہ طے کرنے جا رہے تھے۔

رمیش اور اس کی رجمنٹ ایک مہینے کے اندر اندر کلکتے سے ہوتے ہوئے آسام کی برما سے ملحقہ سرحد پر پہنچ گئے۔ بڑے بڑے درختوں سے ڈھکی پہاڑیوں کا سلسلہ ہر طرف پھیلتا چلا گیا تھا۔ کھلی جگہوں پر ایس میں الجھی ہوئی لمبی پیلی گھاس اور چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور زمین پر بچھی جڑی بوٹیاں ہوا میں لہلہا رہی تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچے تھے تو درختوں کی خالی، کالی شاخیں آسمان کی طرف بازوؤں کی طرح اٹھی فریادکناں نظر آتی تھیں۔ جنگل کی خاموشی اور تنہائی میں یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ کہیں آس پاس جنگ بھی ہو رہی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جنگ صرف ہندوستان کے اخباروں کے صفحوں پر لڑی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کی شہری آبادی جنگ کے بالواسطہ اثرات سے بُری طرح متاثر ہو رہی تھی -- انھیں کپڑے، مٹی کے تیل، چینی، آٹے اور بنیادی ضرورت کی ایسی ہی دیگر چیزوں کے لیے مہینوں بھٹکنا پڑتا اور قیمتیں بڑھتے بڑھتے عام آدمی کی پہنچ سے بہت آگے نکل گئی تھیں۔ دیہاتوں سے آبادی شہروں کی طرف تیزی سے منتقل ہونے لگی۔ سلم بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ شہری آبادی کو ہفتے میں ایک آدھ بار بلیک آؤٹ کی مصیبت جھیلنی پڑتی جس سے زندگی کئی کئی گھنٹوں کے لیے معطل ہو کر رہ جاتی۔ لیکن ہندوستان جنگ کا قبیح چہرہ براہِ

راست دیکھنے سے بچا رہا تھا۔

رمیش کی رجمنٹ نے ایک پہاڑی کی پشت پر، جو ہندوستان کے رخ واقع تھی، خیموں کی بستی آباد کر لی۔ ایک طرف جوانوں کے رہائشی اور لنگر کے خیمے تھے، اور ان سے کوئی سو گز ہٹ کر کمیشنڈ افسران کے خیمے اور میس تھا۔ دشمن کے ہوائی حملے اور توپ خانے کے فائر سے بچاؤ کے لیے جگہ جگہ خندقیں کھودی گئی تھیں۔ ان کی رجمنٹ دو مہینے سے منتظر تھی کہ ہیڈکوارٹر سے حکم آئے تو آگے بڑھیں یا دشمن حملہ آور ہو تو اسے پسپا کریں۔ لیکن لگتا تھا کہ ان کے ہیڈکوارٹر اور دشمن دونوں نے اس رجمنٹ کو دانستہ ایک لامتناہی انتظار کی عقوبت میں مبتلا کر رکھا ہے، اور دوسری طرف بار بار تنبیہ کی جاتی کہ ہر وقت تیار رہو، جانے کس لمحے کیا ہو جائے۔ ہدایات کے بارے میں ذرا سی بےاحتیاطی پر سخت سزا دی جاتی۔ اس اثنا میں درخت بڑے بڑے پتوں سے لد گئے۔ بارشیں بھی ہوئیں۔ پیلی پڑتی ہوئی گھاس نے رنگ بدل لیا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ اتنی بہت سی گھاس موجود ہے لیکن اسےکھانے کے لیے ایک جانور بھی نہیں۔ چمکتی دھوپ، گرجتے بادلوں اور سنسناتی صاف ہواؤں تلے ہریالی کا یہ سمندر پڑا ٹھاٹھیں مارتا، جس کے ذرا سے حصے میں چند سو نقوس بنیان اور نیکر پہنے، دن بھر پسینا بہاتے چیونٹیوں کی طرح مصروف رہتے۔ فوجیوں کو بےمقصد طور پر مصروف رہنے کا گر آتا ہے۔ جوان ہر شام تھالیوں اور دیگچیوں پر تھاپ دیتے ہوئے کچھ دیر کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر ماہیے گاتے، پھر تکیوں پر سر رکھ کر روتے اور خوابوں میں وطن کی فضاؤں میں پہنچ کر رات اُن کے ساتھ بسر کرتے جن کے بجر میں شام کو آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ سو گز کے فاصلے پر افسران کرنل جیمز کی صدارت میں میس کے خیموں کے سامنے دائرے میں کرسیاں بچھا کر محفل جماتے، جس میں کچھ تو دن کی کارگزاری کی روداد ہوتی، باقی وقت انگریزی لطیفے اور مزاحیہ گانے سننے اور سنانے میں صرف ہوتا۔ آداب کی حدوں کے اندر رہتے ہوئے حاضرجوابی اور جگت بازی کا مظاہرہ بھی ہوتا۔ آبدار اور بیرے پھرتی سے وسکی کے گلاس پر گلاس بنا بنا کے پیش کرتے جاتے۔ انھیں ہر دن کے ختم ہونے پر ایک طرح کی خوشی سی ہوتی کہ چلو غیرمعیّنہ قید کا ایک دن اور کم ہوا، کل صبح کا سورج شاید کوئی اچھی خبر لے کر آئے۔ دس بجے کے قریب کرنل صاحب اٹھتے تو سب اپنے اپنے خیموں کا رخ کرتے۔ رمیش سب افسروں سے عمر اور عہدے میں چھوٹا تھا۔ انگریزی اسکول کی تعلیم وتربیت کے باعث اس کا اظہارِ بیاں دیگر دیسی افسروں کی نسبت زیادہ بامحاورہ اور موثر تھا اس لیے کرنل جیمز اس کی باتوں پر خوب ہنس کر اس کا دل بڑھاتا اور اسے بات کرنے کا خصوصی موقع دیتا۔ وہ کبھی کبھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کلام کرتا تو رمیش کے دل میں اس کے لیے اپنائیت کا احساس اور بڑھ جاتا۔ رمیش کرنل سے چھوٹا موٹا مذاق کرنے کی جرأت بھی کر لیتا تھا۔

ان دنوں پتا نہیں کیوں یہ بول، اٹھتے بیٹھتے، گھومتے پھرتے، اس کے ذہن میں گونجتے

Scanned with CamScanner

رہتے ہوا سمندر، گوپی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی۔ یہ بول جن کا تعلق اس کے بہت پیچھے رہ گئے بچپن سے تھا، اب جبکہ وہ محاذ جنگ پر جاپانیوں کے خلاف نبردآزما تھا تو کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے تھے؟ اسے پتا نہیں تھا کہ بچپن، پرانی بھرپور محبت اور قوموں کا گزرا ہوا سنہری دور جب ایک بار بیت جائیں تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے، سوائے خوابوں میں آنے کے؛ لیکن یادوں سے نکلتے بھی نہیں، آخری سانس کے نکلنے تک۔ اگر قومیں بھوک اور فاتحین کے ہاتھوں تذلیل کی مار مسلسل یگوں تک کھاتی رہیں تو آخر وہ وقت بھی آ کے رہتا ہے کہ جب سنہری دور کا یہ بھوت اجتماعی دماغ سے نزلے کے گندے پانی کی طرح خارج ہو جاتا ہے اور وہاں صرف کسی بھی قیمت پر روٹی کی طلب باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی کبھی ٹھیک سے پوری نہیں ہو پاتی۔ اگر یقین نہ آتا ہو تو اچھوتوں سے پوچھ کے دیکھ لو جنھوں نے پکی اینٹ ایجاد کی، نقشے بنائے اور ان کے مطابق شہر تعمیر کیے، پانی کے لیے پکے کنوئیں بنائے، گندے پانی کے اخراج کے لیے نالیاں بنائیں، حمام بنائے، گندم کے لیے گودام بنائے، کپاس ڈھونڈی، کپڑا بنانے کا فن پیدا کیا۔ پنڈت رمیش تم اور تمھارے پرکھ کیا منہ لے کر اس دھرتی پر وارد ہوئے تھے؟ ایک لوہے کی تلوار اور دوسرا گھوڑا جن کے سامنے تانبے کی کمزوری اور بیل کی سست رفتاری مات کھا گئے اور اس کی پاداش میں تم نے علم وفن اور عقل ودانش کے منہ پر ایسا کس کے تھپڑ مارا کہ اس کے داعی آج تک ہوش میں نہیں آ سکے۔ گھنی چھاؤں والے بڑ تمھارے ہوئے جہاں بیٹھ کر بودھوں کو نروان نصیب ہونے لگا۔ مہکتے آم اور رسیلی کونلیں تمھاری ہوئیں۔ سلگتے ہوئے گیت اور دھڑکتا ہوا سنگیت گیا۔ رقصاں دوشیزائیں ٹھٹھک کے وہیں رہ گئیں اور آج تک اسی پوز میں کھڑی ہیں۔ ان کے بدن تو تمھارے تصرف میں آئے لیکن ان کے اپنے اندر سے ابھرنے والی پھبن اور اپنے نازوادا پر محکم اعتماد، جو حسن کی کاٹ کے اصل راز ہوتے ہیں، لوٹ کے پھر نہ آ سکے۔ دیوی دیوتا جنھیں انھوں نے بنایا، پوجا، معظّم کیا، وہ بھی صرف تمھاری پرارتھنائیں سننے لگے اور ان بےچاروں کو خداؤں سمیت کسی کو پکارنے کا یارا ہی نہ رہا۔ ان کے کان فقط تمھارا حکم سننے کے لیے وقف ہو گئے اور ان کے انگ انگ کو ان کی مائیں صرف ان احکام کی تعمیل و تکمیل کے لیے اپنے رحموں میں نو نو مہینوں تک پرورش دینے لگیں۔ شکست کیا کھائی کہ سب کچھ بدل کے رہ گیا، زمین و زماں سمیت۔ ریڈانڈین لوگوں کی طرح اپنے ہی دیس میں ہوتے ہوئے وہاں کا کچھ بھی اپنے بس میں نہ رہا۔ سوائے بےبسی کے باقی ہر چیز نئے آنے والوں کے تصرف میں چلی گئی جو زیادہ طاقتور تھے۔ تو کیا طاقت کے علاوہ سارا علم و فضل، تہذیب وتمدن، انسانیت کی بہبود کے تمام فنون بےکار کی چیزیں ہیں؟

ہرا سمندر، گوپی چندر بول میری مچھلی کتنا پانی۔ یہ بول اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کر رہے تھے یا محض محاذ جنگ اور دشمن کے انتظار کی بوریت سے گھبرا کر بچپن کے زمانے میں پناہ گزین ہو جانے کی آرزو کا ایک روپ تھے؟ اسے یاد تھا جب رات کا کھانا

سرِشام کھانے کے بعد اڑوس پڑوس کے بچوں کا جمگھٹا ان کے لان میں ایک قطار میں بچھی سفید اجلی چادروں والی چارپائیوں کے اردگرد اکٹھا ہو جاتا۔ گھڑونچی پر دھری مٹی کی دو سرخ صراحیاں سوندھی سوندھی اور گیلی گیلی جاں‌فزا خوشبو اڑا رہی ہوتیں۔ رات کی رانی کی تیز خوشبو مشام جاں میں سنجیدہ موسیقی کی مانند ایک ارتعاش سا بپا کرتی چلی جاتی۔ نامی، جو اپنے آپ کو شاید بچوں میں سے ایک جانتا تھا، منہ کھولے ہانپتا ہوا ہر کھیل میں جی جاں سے منہمک ہوتا؛ چھپنے والوں کے ساتھ چھپتا اور کھوجنے والوں کے ساتھ کھوجتا۔ کوکلا چھپاکی کھیلا جاتا تو پٹنے والوں کے ساتھ اس پر بھی ایک دو کوڑے برستے اور وہ خاموش ہنسی سے گھاس پر لوٹ پوٹ ہوتا چلا جاتا اور اٹھ کر پھر ساتھ بھاگنے دوڑنے لگتا۔ پتاجی اندر کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ ماتاجی دن کے کام کاج سے تھکی، چارپائی پر بیٹھی مسکراتی رہتیں اور جب ڈھونڈنے والا عاجز آ جاتا تو اپنے پاس بلا کر چپکے سے کہتیں، "بےوقوف، گیراج کے پاس چنبیلی کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جا پکڑ لے وہاں۔" بچوں کے کھیلنے کا شور دور دور تک جاتا۔ شور سن کر شانتی اور منکت، ننگے پاؤں، ننگے بدن، اپنے بوسیدہ غلیظ کچھے پہنے، دبےپاؤں چوروں کی طرح آ کر، نہایت ڈرے اور بجھے ہوئے، برآمدے کے ستون سے کمر لگا کر کھیلتے بچوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگتے۔ ماتاجی نے کبھی نہ کہا کہ انھیں بھی کھیل میں شامل کر لو۔ پتاجی باہر نکل آتےتو ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انھیں لان میں لے آتے اور اندو اور رمیش کو آواز دیتے کہ انھیں بھی ساتھ کھلاؤ۔ ماتاجی ایسے موقعوں پر ڈاکٹر شرما کو یہ ہدایت دینا کبھی نہ بھولتیں کہ اب آپ ہاتھ دھو لیں۔ بچے اپنا کھیل جاری رکھتے۔ وہ دونوں لان میں بت بنے کھڑے ایک ایک کا منہ تکتے رہتے۔ ان کا کھیل میں شمولیت کے لیے لان میں آنا ہندو مسلمان سبھی بچوں کو کھلتا تھا۔ سارے بچے ان سے چھو جانے کے خوف سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ان سے دور دور رہتے۔ ڈاکٹر شرما کی سفارش بےکار تھی کیونکہ شکست کے اثرات کئی تہذیبوں کے گزر چکنے کے باوجود بہت ہمہ گیر اور دوررس تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسی بھی بچے سے بات کرنے کی جرأت کیے بغیر، پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور دل شکستہ، ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر بوجھل قدموں سے چلتے واپس اپنے گھر پہنچ جاتے۔ دس بجے کے قریب اردگرد کی کوٹھیوں سے آوازیں آنے لگتیں، "للتا، چندن، واپس آؤ۔" "عائشہ، محمود، صبح اسکول نہیں جانا کیا؟" بچے ایک ایک کر کے بھاری دلوں اور سست قدموں سے واپس چل پڑتے۔ گرمیوں کی شاموں میں تو پورا گھر لان میں بسا ہوتا۔ رمیش نے سوچا میرا گھر کیسا خوشیوں کا گہوارہ تھا، لیکن اس شانتی نے میری پوری زندگی میں غلاظت گھول کے رکھ دی۔ ایک رات کہنے لگی کہ تم مجھے ہونٹوں پر کیوں نہیں چومتے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایسا کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کہنے لگی اس لیے کہ میں اچھوت ہوں؟ میں نے جواب دیا، چلو یوں ہی سہی۔ یہ سنتے ہی اس نے دونوں پاؤں میری چھاتی پر رکھ کر ایسا دھکا دیا کہ میں بےبس ہو کر

پیچھے زمین پر جا پڑا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔

گویہ نہ کہ اس جنگل میں ایک ایک دن اتنا بوجھل اور طولانی ہوتا گیا کہ انہیں لگتا کہ کبھی نہیں گزرے گا اور ان کی زندگیوں کے راستے میں کھڑا، وقت کو یوں ہی خلا میں معلق کیے رہے گا۔ ایک دن پر دوسرا ویسا ہی دن سسک سسک کر رینگتا ہوا آن گرتا۔ بوریت کا ذہنوں پر دباؤ تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ جوانوں کے درمیان گالی گلوچ اور مارپیٹ کے واقعات رونما ہونے لگے تھے۔ ہر صبح شاہ بلوط اور صنوبر کے درختوں سے ڈھکا وہی پہاڑی سلسلہ پھر ویسا ہی نظر آتا جیسا پچھلے دن نظر آتا رہا تھا۔ شمال اور مغرب کی طرف اونچے سے اونچے ہوتے پہاڑ تھے۔ دور مغربی کونے میں سفید برفانی چوٹیاں کھڑی تھیں جن کو دیکھنے پر آوارہ بادلوں کا گمان گزرتا۔ ہر شام اندھیرا یہ تصویر لپیٹ کر رکھ دیتا اور ہر صبح اجالا اسی کو پھر وہیں لٹکا دیتا۔ کھانے بدذائقہ ہوتے گئے۔ ابتدا میں اس گھنے پہاڑی جنگل کی خاموشی، تنہائی اور اداسی میں ہر جانب خوف اور خطرے کی لرزتی لپکتی لہریں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں جو ان کے دلوں کی دھڑکن کی رفتار بدل دیتیں، مگر انتظار سے تھک کر آخر انہوں نے دشمن کا انتظار کرنا بھی چھوڑ دیا۔ صرف بوریت تھی جو ان کی روحوں پر صحرائی ریت کی مانند تودے بناتی تہ در تہ جمتی چلی جا رہی تھی۔ ذہن ہر طرح کے خیالات کی زد میں آ آ کر شل ہو گئے تھے۔ شراب میں سے لطف کو کسی نے نکال پھینکا تھا۔ قہقہے صرف حلق کے اوپر اوپر سے آواز کے ابلنے کا نام رہ گئے تھے۔

گالوں کی چوڑی ہڈی، تانبے جیسے سرخ رنگ، چھوٹے قد، اکہرے بدن اور تیز موسموں کی مار کھائے چہروں والے مقامی اپنے خچروں اور ٹٹوؤں پر سامان لادے کیمپ سے دور دور چوروں کی سی رازداری کے ساتھ مغرب کے رخ تیزی سے نکلتے جا رہے تھے۔ اسکاؤٹس کبھی کچھ نسی ہوئی دال جیسی کھٹی کھٹی بو چھوڑتے ہوئے بچوں اور عورتوں اور چکی داڑھیوں والے مردوں کو پوچھ گچھ کے لیے پکڑ کر لے آتے۔ ان کے بھاری پپوٹوں میں دبی ننھی ننھی سیاہ آنکھیں، کہیں دور چھپی گھبراہٹ، انجانے خطرے اور خوف کو جھلکاتی ہوئی، رحم کی بھیک کے لیے تکرار کر رہی ہوتیں۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ایسے علاقے میں رہتے تھے جو ٹکرانے والی دو فوجوں کے بیچ میں آ گیا تھا۔ ان کی آنکھیں پوچھ رہی ہوتیں کہ وطن کی زمین جو صدیوں سے انہیں اپنی گود میں سنبھالے بیٹھی تھی آج کیوں باہر اچھال رہی ہے۔ اپنے ہی دیوارودر منھ موڑے انجان بن کے کیوں کھڑے ہو گئے ہیں۔ نہ ماتا سمان دھرتی اپنی بنتی ہے اور نہ کوکھ سمان چوکھٹ سنبھالتی ہے، تو کوئی دنیا میں کس پر اپنائیت کا مان رکھ سکتا ہے۔ دھرتی ماتا ہو، چوکھٹ ہو یا دیوتا، یہ سب اسی کے ساتھ ہو جاتے ہیں جس کے ہاتھوں میں بندوق ہو۔ وہ نہ تو چپٹی ناک پر جاتے ہیں اور نہ گورے رنگ کو دیکھتے ہیں، سب فیصلہ طاقت ور کے حق میں دے دیتے ہیں۔ ان بھولے بھالے انسانوں کے گاؤں مفت میں

اجڑ گئے تھے اور بستیاں بے گناہ ویران ہو گئی تھیں۔ تاریخ جب چڑھ جاتی ہے تو فطرت کی مانند جو بھی اس کے غصے کے ہتھے چڑھ جائے تہس نہس ہو جاتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور اصول کی پابند نہیں ہوتی۔ ان میں سے ہر ایک یہی کہتا کہ وہ محفوظ علاقے کے شہر میں مزدوری کی تلاش میں جا رہا ہے۔ ان سے دشمن کے بارے میں کبھی کوئی مفید مطلب اطلاع نہ مل سکی اور نہ ان بےچاروں کو کچھ معلوم ہی ہوتا تھا۔ گاؤں کیوں چھوڑ دیا؟ ان کا جواب ہوتا، بمباری کےخوف سے۔

کپتان ولیمز نیا نیا انگلستان سے آیا تھا اور اس رجمنٹ میں پہلی بار پنڈی آ کر شامل ہوا تھا۔ اس نےکمیشن سینڈہرسٹ سے لیا تھا اس لیے اس کے دہرہ دون سے کمیشن لینے والے ساتھی اس کی خصوصی تعظیم کرتے تھے۔ وہ رمیش سے کوئی پانچ سال عمر میں بڑا، پتلا دبلا، لمبے قد کا خاموش طبع نوجوان تھا۔ اسے کتابیں پڑھنے، دوربین سے پرندے دیکھنے اور ان کی عادات و خصائل کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو فارغ وقت میں ایک کاپی میں درج کرتا رہتا۔ احکامات کی بجاآوری میں نہایت مستعد اور ایک ذمےدار طبیعت کا مالک افسر تھا۔ مجلس میں بھی جچی تلی گفتگو کرتا۔ بڑھ بڑھ کے بلاوجہ بولتے رہنا اسے پسند نہ تھا۔ شراب پینے میں بڑی احتیاط برتتا اور بالعموم پوری شام ایک ہی گلاس پکڑے بیٹھا گزار دیتا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ لوگ جب اپنے اہل خانہ کے بارے میں جذباتی باتیں کرتے یا خودرحمی کے انداز میں گفتگو کرتے، جس میں ہندوستانی افسران پیش پیش ہوتے، تو خاموشی سے بیٹھا سنتا رہتا۔ خودرحمی اس کے نزدیک ناکامیابی کا اعتراف ہی نہیں، بلکہ خود کو سزا دینے کا ایک انداز بھی تھا اور اپنے عزیزوں کے لیے برملا جذباتیت کا اظہار کرنا اپنے ذاتی معاملات کو پبلک کرنا تھا۔ سرسری نظر میں محسوس ہوتا جیسے اس کے دل کی جگہ برف کا ٹکڑا رکھا ہے جس میں گرمی نام کو نہیں۔ رمیش کو وہ اچھا لگتا تھا۔ اس کا لیے دیے رہنے کا انداز رمیش کے لیے اگرچہ انوکھا نہ تھا لیکن وہ اپنے باپ کے حوالے سے اسے صرف بڑھاپے کی خصوصیت شمار کرتا رہا تھا۔ یہ بات اسے حیران کرتی کہ جو شخص عام زندگی میں بوریت کا شکار نظر آیا کرتا تھا، اب جب کہ ہر طرف بوریت کا دوردورہ تھا تو ویسا ہی نارمل تھا جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی ہابیوں میں اسی طرح دلچسپی سے مصروف رہتا۔ جنگ کا دوسرا نام موت ہے، اور جب جنگ کا انتظار مہینوں پر پھیلا ہوا ہو اور انتظار کے مہینوں کا ایک ایک لمحہ زندگی اور موت کی کشاکش میں کٹ رہا ہو تو انسانی برداشت جواب دینے لگتی ہے، رواداری اور سہار ختم ہو جاتی ہے، بدمزاجی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ لوگ بات بےبات ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، مارپیٹ کرتے ہیں۔ جنگ کے انتظار اور موت کے خوف کے باعث وہاں کے افسروں میں بھی نفسیاتی الجھنیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کثرت سے شراب پینے میں اپنے لیے پناہ ڈھونڈی تھی۔ ولیمز پر ان حالات کا کوئی اثر نہ تھا۔

Scanned with CamScanner

رمیش خاموشی، خوف، اداسی اور بےیقینی سے بچنے کے لیے اس کے خیمے میں جا بیٹھتا، اس کے ساتھ جنگل میں مقررہ حدود کے اندر پیدل گھومنے نکل جاتا، دنیا بھر کی باتیں کرتا، اپنے خواب اسے سناتا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی پرندے دیکھنے کی ہابی میں دلچسپی لینے لگا۔ ولیمز کے نزدیک رمیش ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا تھا۔ وہ اس سے سکول کی شرارتوں، اور عزیز کے ٹیچرز کو چکر دینے اور کلاس فیلوز کے ساتھ لڑنے اور بازاروں میں گھومنے کی کہانیاں، اور باپ کے گلے، بہن بھائی سے پیار(جو ملازمت کے بعد سےزیادہ بڑھ گیا تھا)، ماں سے محبت، شانتی سے مہم جویانہ کھیل، کملا سے منگنی وغیرہ، سب قصّے سن چکا تھا۔ ایک دوپہر ولیمز نے اسے دوربین سے شاہ بلوط کے ایک گھنے درخت کی ڈال پر مرغ زرّیں کا ایک جوڑا بیٹھا دکھایا اور کہا کہ تم نے مور کے علاوہ اس سے زیادہ خوبصورت پرندہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

اس نے دوربین سے دیکھتے ہوئے جواب دیا، "ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے سر پر تو نیلی چم چم چمکتی کلغی ہے۔ ارے! یہ تو تانبے جیسی دم کا چنور بنا کے ناچنے لگا۔ اتنے بہت سے رنگ، اور ہر رنگ ایسا جیسے مختلف دھاتوں کے چمکتے ہوئے ٹکڑے ہوں۔ ساتھ میں اس کی مادہ بیٹھی ہے؟"

"اسی کو رجھانےکی خاطر تو ناچ رہا ہے۔ آج کل ان کے ملاپ کے دن ہیں۔"

رمیش نے دوربین ہٹا کے ہنستے ہوئے کہا، "مادہ تو اس کے مقابلے میں بہت بدصورت ہے۔ مٹیالے بھورے رنگ کا ایک عام سا پرندہ ہے۔ کوئی دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہیں کرے گا۔"

اسی طرح ہنستے ہوئے رمیش نے پھر دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ ولیمز نے کہا، "لیکن مثال فیرنٹ اگر تم سے اتفاق کرے تو بیاہ کس سے کرے؟ اس کے لیے تو کوئی کملا موجود نہیں۔"

رمیش کہنے لگا، "اب اس کی چونچ میں چونچ ڈال دی ہے، گویا چوم رہا ہے۔ بےوقوف، گدھا، اپنے حسن کی توہین کر رہا ہے۔"

"مثال فیرنٹ بےچارہ برہمن نہیں صرف مثال فیرنٹ ہے۔ اس لیے اسے شانتی کو چومنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔"

لفٹیننٹ رمیش نے بڑے زورکا قہقہہ لگایا جس پر ولیمز نے کہا، "آہستہ رمیش، اگر مسز فیرنٹ نے تمھاری آواز سن لی تو ہمارا دوست بےچارا مصیبت میں پھنس جائے گا۔ یہ شرمیلا پرندہ ہے اور انسانوں سے خائف رہتا ہے۔ خواہ مخواہ ان کا لطف کیوں غارت کرتے ہو؟"

رمیش نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے افسردگی سے کہا، "تم ٹھیک کہتے تھے۔ وہ اڑ گئے۔"

سفید، پیلے اور گلابی پھولوں کی آٹھ آٹھ نو نو فٹ اونچی، چوڑے چوڑے پتّوں والی جھاڑیاں ہر چہار طرف پہاڑیوں پر اگی سبز سبز گھاس پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دوپہر میں ان کی تیز خوشبو سے پورا جنگل مہک رہا تھا۔ ولیمز نے اسے بتایا کہ چوڑے پتّوں والی تمام جھاڑیاں دراصل منطقۂ حارہ کی باسی ہیں، لیکن یہاں چونکہ بارش کی اوسط دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے تو حوصلہ کر کے اس بلندی تک بھی چلی آئی ہیں۔ رمیش جھاڑیوں سے مختلف رنگوں کے پھول توڑ توڑ کر اپنی مٹھی میں جمع کرتا جا رہا تھا، اور ولیمز کی بات بھی سنتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے خیمے کی طرف واپس چل پڑے۔ راستے میں انھیں اپنے جوان ملے جو بہنگیوں پر پانی کے کنستر نیچے وادی کی ندی میں سے بھر کر اوپر لا رہے تھے۔ ولیمز کہہ رہا تھا، "لگتا ہے جیسے فطرت کو ایک جنوں ہے زندگی کو قائم و دائم دیکھنے کا، اور اپنی اس دھن میں اس نے ہر ذی حیات کو جنس کی چٹیک لگا رکھی ہے۔ سب دیوانہ وار اپنی اپنی نسل کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور پھیلانے کے عمل میں مصروف ہیں۔ پودے، پرندے، چوپائے، کیڑے، مچھلیاں، انسان، سب کو ہی ایک لگی لگی ہوئی ہے۔ جنس فطرت کے تمام تحفوں میں سب سے خوبصورت تحفہ ہے۔ شاید اس لیے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا گیا ہے کہ فطرت کے پوشیدہ منصوبوں کی تکمیل میں مخلوق کی طرف سے کسی رکاوٹ کے حائل ہونے کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ تمھارا کیا خیال ہے رمیش؟"

"ہاں۔ وہ ذہن کو مفلوج کر دینے والا، جھکڑ کی طرح تیز جذبہ ہوتا ہے۔"

ولیمز بولا، "طاقت ور مردوں نے عورتوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اور جائیداد کو اپنی نسل میں مخصوص کرنے کے لیے اس تیز جذبے پر پابندیوں کا سلسلہ شروع کر دیا، اور صدیوں سے اس بوجھ تلے دبے دبے ان کے ذہن اس کیفیت کو پہنچ گئے ہیں کہ جنس کی بات پر عام آدمی پھیکی ہنسی ہنس کر چپ ہو جاتا ہے، حالاں کہ اس میں شرمندہ ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ کیا خیال ہے تمھارا؟"

رمیش نے کہا، "تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے لیکن اسے کہیں تو ختم ہونا چاہیے۔"

"صرف فریقین کی پسندیدگی پر۔ رمیش! تمھیں اپنا پہلا جنسی تجربہ یاد ہے؟"

"دنوں تک ضمیر کے کچوکوں نے میرا جینا حرام کیے رکھا۔"

"تمھاری بات دوسری ہے۔ تمھاری دوست اچھوت تھی اور تم نے ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے بندھے ٹکے سماجی بندھنوں کی جو خلاف ورزی کی وہ بےاطمینانی کا سبب بن گئی۔"

"نہیں، ہندوستان کی پوری چالیس کروڑ آبادی کی یہی حالت ہے۔ شادی کے رشتے سے باہر جنسی تعلق پر ہر ضمیر چیختا ہے۔"

"یہ انگریز یا ہندوستانی کا مسئلہ ہرگز نہیں۔ جہاں جہاں بھی شادی کا نظام ہے، جو

Scanned with CamScanner

کہ پوری دنیا میں ہے، یہ کیفیت کم وبیش ضرور پائی جاتی ہے۔ تم میرا سوال نہیں سمجھے۔ میری مراد جنسی تجربے سے، اس لمحہ' خاص کے عین عروج کے وقت کی فوری کیفیت سے تھی۔"

"ہاں وہ کچھ ایسا تھا جیسے کئی دنوں کا پیاسا جی بھر کر پانی پیے۔ گویا میرے اندر کے سبھی تضادات ایک بار تو طے پا گئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ساتھ مکمل طور پر پُرامن ہونے کا احساس اجاگر ہو کر سامنے گھوم گیا۔"

"میں اس سے بھی ذرا پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ سنو، میری ایک دوست تھی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت پیار تھا، بلکہ اب بھی ہے۔ ہماری خط و کتابت چل رہی ہے۔ میں تمہیں اس کے خط دکھاؤں گا۔ میرے پاس جمع ہیں۔ میں نے اس لمحہ' خاص میں جو تاثرات روتھ کے چہرے پر نمایاں ہوئے تھے غور سے دیکھے۔ تم نے کبھی پیدائشی پاگل دیکھے ہیں؟"

"بہت دیکھے ہیں۔"

"جیسی ایک خالی خالی، بونگوں کی سی چھاپ ہر وقت ان کے چہروں پہ لگی رہتی ہے، ویسی ہی پاگل پن کی چھاپ اس وقت اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ بلا کسی اختیار کے لٹکا ہوا تھا۔ جبڑے بےقابو تھے، منہ سے لعاب بہہ کر گالوں تک آ گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ اعضا لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کی جلد سلونوں بھرے کپڑے کی طرح ہو گئی تھی۔ تیوریاں اتنی گہری تھیں کہ گنی جا سکتی تھیں۔ ننگی فطرت اپنے مقصد کی خاطر اسے تلذذ کے دھارے میں بہانے لیے جا رہی تھی اور وہ دیکھنے میں یوں لگ رہی تھی جیسے بڑے کرب سے گزر رہی ہو۔ رمیش، کیا تمہیں اپنے پہلے جنسی اختلاط کے دوران شانتی کے اور اپنے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات یاد ہیں؟"

"ہم اندھیرے میں ملے تھے، اور ہمیشہ اندھیرے میں ہی ملتے رہے۔"

"رمیش، ایسے وقت میں میرے چہرے پر بھی ویسی ہی چھاپ ہو گی، پیدائشی بونگوں جیسی۔ انسان، جو کچھ کہ بنیادی طور پر وہ ہے، انھی دو لمحات یعنی موت اور جنسی تلذذ کے عروج پر ننگا ہو کر سامنے آتا ہے۔ شاید تخلیق اور فنا دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ آئینے کے سامنے کھڑی ایک ہی چیز ہے۔ جنسی تجربہ اور لمحہ' جاں کنی دونوں کا ایک ہی خاصہ ہے، عالم جذب۔ لیکن کسی بھی ذی روح کے لیے دوسرے تجربے سے صرف ایک ہی بار گزرنا ممکن ہے، اس میں کوئی دوسری بار نہیں۔"

رمیش نے کہا، "کچھ عقوبتیں ایسی ہیں جن سے گزرتے ہوئے موت زندگی سے بہتر نظر آنے لگتی ہے۔ ناکامی کیا ہے؟ اپنی اور خاص طور پر دوسروں کی توقعات پر پورا نہ اتر سکنا۔ مجھے اس توقعات کے کھیل سے بڑی نفرت ہے۔ یہ بھی اسی قماش کی عقوبت ہے۔ میرے اور شانتی کے تعلقات میں ایک ہی چیز اچھی تھی کہ ہم دونوں کے درمیان توقعات کا کوئی ناتا نہ تھا۔"

ولیمز نے کہا، "ممکن ہے تمہارے باپ نے اپنی توقعات کی تکمیل پر ضرورت سے زیادہ

اصرار کیا ہو، لیکن جائز حد تک توقعات تو زندہ ہونے کے صحیح احساس کے لیے بہت ضروری ہیں۔ شانتی تم سے آخری ملاقات میں کیوں رو رہی تھی؟ ان توقعات کی ناکامی پر جو وہ تم سے لگائے بیٹھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے زبان سے ان کا ذکر نہیں کیا۔ ان پر کبھی اصرار نہیں کیا۔ ہندوستان کے معاشرے میں وہ بالکل غیرمعقول ہیں۔ اگر وہ روتی بھی نہیں تو شاید تم اس تعلق کو بڑی حد تک اپنے ذہن سے محو کر چکے ہوتے۔"

کیپٹن ولیمز شام کو میس میں ملنے کا پروگرام بنا کر رمیش کو خدا حافظ کہہ کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ رمیش گردن جھکائے، سوچ میں ڈوبا، آہستہ آہستہ اپنے خیمے کی طرف چلا۔ یہ بول پھر کہیں سے برآمد ہو کر اس کے ذہن میں بجنے لگے، پرا سمندر، گوپی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی۔ اس نے مغرب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر شاہ بلوط کے دیوہیکل درختوں کے پیچھے سورج کے نور کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ درختوں کے گھنے پتوں اور شاخوں کی بلند و بالا چلمن کے پیچھے سے کرنوں کی بوچھاڑیں چھن چھن کر نکلی چلی آ رہی تھیں۔ اس نظارے کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے ذہن نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ وہ حیرت کے علاوہ اس بےپایاں حسن کے تاثر پر اپنا کوئی ردعمل کسی نادر خیال یا تخیل کی اڑان یا کسی جسمانی عمل کی صورت میں کر سکے۔ اسے کچھ نہ سوجھا۔ تھک کر اسی سوچ پر قناعت کرتے ہوئے اس نے وہاں سے توجہ ہٹائی کہ چلو ایک اور بوجھل دن اپنے انجام کو پہنچا۔ قید کا ایک دن اور کم ہوا۔

ملگجا سا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ رمیش سفید قمیص پتلون پر چوڑا سیاہ ریشمی کمربند باندھے، کلکتے سے خریدے کڈ کے نئے چمکدار سیاہ بوٹ پہنے، میس کے سامنے دائرے میں بچھی کرسیوں کے قریب پہنچا تو نوجوان ویٹر نے بتایا، "سر! کرنل صاحب آج جلدی آئے تھے، اُدھر خیمے میں بار پر کھڑے ہیں۔ تین چار افسر بھی ان کے ساتھ ہیں۔" اس نے پوچھا، "ادھر کیپٹن ولیمز ہے؟"

"جی سر، ہے۔"

رمیش نے دس قدم کے فاصلے پر واقع بار کے خیمے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ دیکھا کرنل صاحب ہاتھ میں گلاس پکڑے خیمے سے باہر نکل رہے ہیں۔ اس نے ایک بار وہیں اٹن شن کھڑے ہو کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کرنل نے ہاتھ اٹھا کر اس کی تعظیمی اٹن شن کا بےنیازی سے جواب دیتے ہوئے پوچھا، "وائی آر یو لیٹ ٹوڈے؟"

رمیش نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے پیچھے سیٹی کی آواز آئی اور خالی کرسیوں کے دائرے کے درمیان میں دشمن کی توپ کا گولا پھٹا۔ رمیش گولے کے پیداکردہ چار فٹ گہرے گڑھے کے اندر تھا۔ اس سے بات کرنے والے بیرے کی لاش کے ٹکڑے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کرنل اور اس کے ساتھ کھڑے افسر زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر تیزی سے رینگتے ہوئے خندق میں جا گھسے۔ رمیش کی ایک ایک کا نام لے کر پکارتی ہوئی، گھبراہٹ بھری صدائیں ان تک پہنچ رہی تھیں۔ "کرنل صاحب، ولیمز، موہن سنگھ، حمید،

Scanned with CamScanner

مجھے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔ میں مر جاؤں گا۔" اس کی کسی صدا کا سوائے گولوں کی آوازوں کے کوئی جواب نہ آیا۔ گڑھے کے چاروں طرف پھٹتے ہوئے گولوں کی آواز کے ساتھ یکے بعد دیگرے تواتر سے کوندتی جگمگاتی روشنی بھڑک کر ابھرتی اور مٹ جاتی۔ ایک عجیب دیوالی کا سا سماں تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اڑ گئی تھیں۔ وہ گڑھے میں اس طرح جامد ہو کے رہ گیا تھا جیسے لکڑی کے تختے پر پن سے گڑی، پر ہلاتی تتلی۔ گھٹنوں سے نیچے دونوں ٹانگیں غائب تھیں، کڈ کے نئے بوٹوں سمیت۔ مگر وہ خود یہ نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود اٹھ نہیں سکتا اور اس کا پورا بدن جو کبھی لطف کا بازار رہا تھا اب درد کا بھنور ہے جو پتا نہیں کہاں سے چلتا ہے مگر اتنا معلوم ہے کہ ختم کہیں نہیں ہوتا۔ اس کے بدن کے ریشے گویا گیلا کپڑا تھے جسے دھوبی ساری نمی نچڑ جانے کے بعد بھی بل پر بل دیے جا رہا تھا۔ وہ درد کی شدت سے تازہ گڑھے کی گیلی ٹھنڈی مٹی میں لوٹ رہا تھا۔ وہ باربار ہمت کر کے کہنیوں کے بل اپنے آپ کو اونچا کر کے اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگتا۔ اس درد کے باوجود خیال کا خنجر ایک سیکنڈ میں سینکڑوں بار کی رفتار سے ذہن پر حملہ آور ہوتا، موت آ گئی، موت آ گئی۔ ایک کونا سوال دوہرائے جا رہا تھا۔ اتنی جلدی؟ اتنی جلدی؟ کہیں سےگونج اٹھ رہی تھی، قریب، قریب۔ اس کے ذہن میں بیک وقت سینکڑوں لہریں چل رہی تھیں، ایک دوسرے سے آزاد اور ہر ایک خودمختار۔ ان کو نظم میں رکھنے والا مرکز موت کی قربت سے بیکار ہو گیا تھا۔ اگرچہ درد ایک ایسی خودپسند معشوق کی مانند جو اپنے عکس سے بھی حسد کرتی ہو، ایک لحظے کے لیے اس کو توجہ بٹانے کی اجازت نہیں دیتا تھا، لیکن پھر بھی کچھ بےربط ایک دوسرے کے اوپر باربار مٹتی ابھرتی یادیں تھیں، اپنی ذات سے تاسّفات کا ریلا تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی، شانتی کی گزرتی شبیہیں تھیں۔ وہ ہر شبیہ سے لپٹتا، ٹھہرو، نہ جاؤ۔ ساتھیوں کے ماں توڑنے کا افسوس تھا۔ انھیں پھر آوازیں دینے لگتا۔ اس دنیا میں میرا کوئی سننے والا نہیں۔ خوف اس کے اندر ایک غیرمرئی درندے کی طرح تیزی سے آ جا رہا تھا۔ میں مر جاؤں گا! ابھی! وہ اپنے خون اور پسینے میں لتھڑا پڑا تڑپ رہا تھا۔ پھر اس نے ساتھیوں کو پکارنا بند کر دیا۔ تقدیر کو قبول کر لیا۔ موت کو تسلیم کر لیا۔ کہنیاں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ شاید جسم میں سکت نہ رہی تھی۔ سر زمین پر رکھ دیا۔ سامنے نکھرے آسمان پر ہنستے باتیں کرتے بچوں جیسے چنچل ستاروں کا ایک لاتعلق جمگھٹا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ درد بھی اب کچھ تھم گیا تھا۔ خوف کا درندہ سمٹ کر اب اس کے سرہانے آ بیٹھا تھا اور اس کے خونیں پنجے کی جگہ مایوسی نے اس کے دل کو اپنے سیاہ ہاتھوں میں بھینچ لیا تھا۔ پوچھنے والے نے مترنم آواز میں لہک کر پوچھا: بول میری مچھلی کتنا پانی؟ رمیش کے بےجان، بند ہونٹوں کا جواب تھا، گھٹنے گھٹنے۔

پاسپورٹ

ڈبو کی موت کا واقعہ ایک مدت تک آنے جانے والوں کو سنایا جاتا رہا۔ ایسے میں آسمان یکدم چپ سادھ لیتا، اس میں تیرتی چیلیں ساکت ہو جاتیں اور درختوں کی شاخیں جھک آتیں۔ سارے میں کچھ نارنجی مائل روشنی گھلتی محسوس ہوتی اور ایک لق ودق میدان، کہ جس کا اور نہ چھور، اس کی آنکھ سامنے کھلتا، چھپ جاتا۔ بڑا مانوس مگر گم شدہ۔ اسے اپنی باہوں کے روئیں ٹِک ٹِک اُلٹتے محسوس ہوتے۔

ڈبو بےحد ڈی کلاس کتّا تھا کہ خودبخود گیٹ پر آن بیٹھنے لگا۔ ایک بار تاؤجی نے سوکھی روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ پھر وہ اپنے مقرّرہ وقت پر آ کر وہاں بیٹھ جاتا۔ قدرے انتظار کھینچتا، پھر ایک روتی ہوئی آواز گلے سے نکالتا۔ کوئی نہ کوئی بچی کھچی روٹی لے کر دوڑتا۔ پھر اس نے ایک ایک قدم حدود کو توڑنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے اس کا اسی برآمدے کی سیڑھی ہی گیا۔ اب تاؤجی دودھ پانی میں روٹی ڈال کر دینے لگے، اور برابر کی سطح پر اس سے مکالمے کی رسم ڈالی۔

"لے، کھا لے۔ آج تیری دعوت ہے۔ اوں ہوں، یہ چیچڑ کہاں سے آیا؟ بڑا آوارہ مزاج ہے بھئی، ہیں؟" اب وہ چمٹی سے اس کی بھوری کھال صاف کرتے نظر آتے۔ ایسے میں وہ اپنا لمبوترا منھ ان کے پاؤں سے رگڑنے جاتا۔ رہ رہ کے اس کی کھال میں کپکپی دوڑتی اور دُم کا پنڈولم ہری طرح ہلتا رہتا۔ پھر وہ خانہ باغ کے انار تلے بیٹھنے لگا۔ انھی دنوں معلوم ہوا کہ آوارہ کتوں کو مارنے کی مہم زوروں پر ہے۔ میونسپلٹی کی گاڑیاں سڑک کنارے پڑے مردہ کتوں کو لاد لاد کر لے جاتی تھیں۔ تاؤجی نے اب ایک سستا سا چاکلیٹی رنگ کا پٹا ڈبو کے گلے میں ڈالا۔ دراصل اس پٹے کے بعد ہی اس کا نام ڈبو پڑا۔

اس کی آوارہ مزاجی سے تنگ آ کر تاؤجی نے اسے زنجیر کرنا شروع کیا۔ ہوتے ہوتے وہ تاؤجی کے معمولات کا حصہ ہی گیا۔ دن کا اکثر حصّہ ڈبو بندھا رہتا۔ عصر کے بعد تاؤجی مسجد سے لوٹتے تو اس کی رہائی ہوتی۔ کیسی کیسی الٹی چھلانگیں لگاتا۔ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر دستیاں ہلا ہلا تاؤجی کے گلےگلے پہنچ جاتا۔ ایسے میں ہم سب، ڈرائنگ روم کے جالی کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے۔ تاؤجی نہایت دوستانہ لہجے میں سمجھاتے۔

"او یار، یوں نہیں کرتے۔ شاباش! چل ذرا گھوم پھر آ۔ جا۔" وہ دُم ہلاتا گیٹ کی طرف

Scanned with CamScanner

چل دیتا۔ آنے جانے والوں نے سختی سے نوٹس لیا۔

"کتا پال لیا ہے۔ نجس جانور ہے۔ اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے جہاں کتا ہو۔"

"رحمت کے فرشتوں کے لیے دوسرا گیٹ ہے۔" تاؤجی نہایت سنجیدگی سے اطلاع دیتے۔

ڈبّو کے آنے سے اتنا ضرور ہوا کہ تفریحاً گھنٹی بجا کر مانگنے والے اور گھروں کے پتے پوچھنے والے بالکل غائب ہو گئے۔ اس کی سہیلیاں پہلے سے فون پر اطلاع دے دیتیں۔ "ہم آ رہے ہیں۔ وہ تمھارا ڈبّو نام تو نہیں پوچھے گا؟"

یہ انھی دنوں کی بات ہے جب وہ کمزور، ڈی کلاس ڈبّو، دودھ روٹی کھا کھا کے خوب فربہ ہو گیا تھا اور اس کی کھال سفیدے کی مانند چمکنے لگی تھی۔ اس کی سرمہ لگی آنکھیں، روشن، چمکتی، آپس میں جڑتی، بڑی سمجھ داری سے ہر ایک کو دیکھتیں، اور بات بات کی سن گن لیتیں۔ زور آور ایسا ہو گیا تھا کہ اکثر تاؤجی کے قابو میں نہ آتا۔ لاکھ زنجیر کھینچتے، اس کو بھی گھسیٹ لے جاتا۔ عجب عجیب طرح کی آوازیں نکالنا اس کا مشغلہ ہی بن چکا تھا۔ جس روز وہ زیادہ بدتمیزی کرتا، تاؤجی اس کی پابندی کے وقت میں اضافہ کر دیتے۔ وہ مالی کو حکم دیتے۔ "آج اس کو پانچ نہیں ساڑھے پانچ کھولنا!"

"لیو بھئی۔ آج تو تاؤجی کو ناراج کر دیو۔ کیوں بھئی ڈبو۔" مالی اپنے سیاہ چمکتے چہرے پر کی ذہین، لمبی لمبی آنکھوں میں ہنستا۔ جب پہلے روز فریدہ نے مالی کا نام سنا تو اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک دہک اٹھا۔ بڑی باجی مالی سلیم کو گل داؤدی کے گملے رکھنے کی ہدایات دیتی رہی تھیں۔

"یہ تمھارے مالی کا نام سلیم ہے؟" اس نے نہایت رنجیدہ، بلکہ زخم خوردہ ہو کر پوچھا۔

"کیوں؟ ہے تو سہی۔"

"اتنا اچھا نام، اور مالی! یہ آیا کہاں سے ہے؟"

"معلوم نہیں۔" اور واقعی انھیں کچھ معلوم نہ تھا۔ ان دنوں اکثر سرحد پار سے مہاجرین، کسی ٹھکانے، سرونٹ کوارٹر کی تلاش میں، گھر گھر گھنٹیاں بجاتے۔ مالی سلیم ابّاجی کے دفتر پہنچ گیا تھا، اور وہاں سے گھر۔ دفتر اور گھر دونوں جگہ مالی گیری کرتا۔ خانہ باغ کے ساتھ ساتھ کوارٹروں کی لمبی قطار تھی۔ تعداد میں کل آٹھ کوٹھریاں تھیں؛ ایک آدھ کے سوا ساری پکّی اینٹ کے فرش والی۔ ابھی تین کوارٹر خالی پڑے تھے۔ ایک میں مالی سلیم آ جما۔ وہ تنہا تھا۔ پوربی۔ تاؤجی جب موڈ میں آتے تو اسے پورب کا بھیّا کہہ کر پکارتے۔ روزانہ صبح سویرے جب اسکول بس اسٹاپ کے لیے وہ سڑک پر نکلتی، مالی سلیم، انتہائی سفید جگمگاتے کپڑے پہنے، ہاتھ میں سلور کا ٹفن کیریئر پکڑے، کام پر جا رہا ہوتا۔ تنگ مُہری کا پاجامہ، کرتا اور صدری، سر پر کالی ٹوپی، اور جگمگاتے جوتے۔ وہ ہرگز مالی نہ لگتا تھا۔ جب کوارٹروں کے آخر میں لگے، بھوری کے چھپّر میں آنا جانا ہوتا تو مالی سلیم کی کوٹھری

سب سے الگ صاف ستھری چمکتی نظر آتی۔ فرش کی سرخ اینٹیں انار کے دانوں کی طرح چمچماتیں۔ ایک طرف چارپائی پر کالا سفید ڈبّیدار کھیس بچھا ہوتا۔ سامنے دیوار میں بنے طاق پر جگر جگر کرتی ایلومینیم کی پتیلیاں اور بھوری پھولدار پیالیاں۔ اسے حیرت ہوتی، مرد بھی اتنے اچھے برتن دھوتے ہیں۔ اور جھاڑو۔ پھر وہ گھوم کر دیکھتی، مالی گھر کی دھوتی اور صدری پہنے، کھرپی لیے کیاریاں کھود رہا ہوتا یا ہاتھ مٹّی میں سنے ہیں۔ یہ پہلے مالی سے کتنا مختلف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد اور گٹھے جسم کا، پھرکی کی طرح گھومنے والا مالی، پانچ منٹ میں، ناچتے کودتے، پودوں کو گنجا کانا پانی دیا، اور سائیکل پر یہ جا وہ جا۔ بڑے بھیا نے اس کے فوارے پر سفید پینٹ سے "مالی بھمبیری" لکھ دیا تھا۔ اگلے ہی روز وہ بچوں کی بدتمیزی کا عذر کر کے چل دیا۔ مگر یہ مالی سلیم زمین پر کیسے جمے جمے قدم ڈالتا۔ اس کی ہر حرکت میں توازن کا احساس ہوتا تھا۔ اسے فریدہ کا سوال پھر یاد آ گیا۔ یہ ہے کون؟

بھری گرمیوں کی سنسان دوپہر اس کے کوارٹر سے سسکیوں کی آواز آئی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ مگر سامنے تو کھٹّے کی باڑھ آ جاتی تھی۔ سب کمرے اندھیرے کیے سو رہے تھے۔ اس نے چپکے سے دروازے کی چٹخنی گرائی۔ لان کی سوکھی گھاس پار کرتے کرتے اس کے تلوے چلچلانے لگے۔ مالی کے کوارٹر کی دہلیز پر ململ کا دھانی دوپٹا اوڑھے ایک سانولی سی عورت بیٹھی بچکیاں لے رہی تھی۔ اس کی پتلی، لمبی، چپٹا کمر پر بلکورے کے ساتھ لرز جاتی۔ بانہوں میں ہری اور بسنتی کانچ کی چوڑیاں، سیاہ لمبے بال، سیدھی مانگ۔ وہ حیرت سے کھڑی دیکھتی رہی۔ مالی غائب تھا۔

شام کو تاؤجی نے بتایا، "مالی سلیم کی بھانجی ہے۔ اس کا آدمی ہندوستان میں تھا۔ گزر گیا۔" ایک دم اس کا دل ڈھے گیا۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ کچھ لوگ ادھر، کچھ اُدھر، اتنی دور۔ اس کی آنکھوں میں لمبی چپٹا کمر اور سبز چوڑیاں گھوم گئیں۔ اب شاید یہ اپنی چوڑیاں توڑ دے گی۔ تو پھر سلیم کے لوگ کہاں ہیں؟ وہ تنہا کیوں ہے؟ شاید اس کے سب عزیز بھی اُدھر ہی ہیں۔ وہ یہاں تنہا کیا کر رہا ہے؟ اور پھر وہ اس کے نام پر ششدر رہ گئی۔ فریدہ کا سرخ چہرہ۔ ہاں کیا معلوم یہ کون ہے۔ یوں جما جما کر قدم دھرنے والا۔ شہزادہ سلیم۔ ان دنوں الحمرا میں انارکلی ڈراما اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ صاحب عالم۔ مہابلی۔ شیخو۔ دلآرام۔ دمدموں میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی۔ اے ظفر بس ہو چکی اب تیرے ہندوستان کی۔ غدر کے افسانے۔ شہزادی کی بپتا۔ اس کا تصور بھٹکتا چلا گیا۔

مالی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح سفید براق کپڑوں میں، چمکتا ٹفن کیریئر اٹھائے کام پر جاتا۔ کیاریوں میں بیج ڈالتا، فوارے سے پانی دیتا۔ اور تیسرے پہر اس کے کوارٹر سے کسیلا کسیلا دھواں بل کھاتا، کھٹے کی باڑھ کے پار اڑتا، اور گول گول لہراتا فضا میں تحلیل ہو جاتا۔ لان کے پار، کوارٹروں کے ساتھ ساتھ عجب دنیا آباد تھی۔ اب ایک

Scanned with CamScanner

جانب ڈبّو کا ٹھکانا تھا۔ اسے بیری کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ کونے میں بھوری بھینس کا چھپّر۔ ساتھ والے کوارٹر میں مرغیاں اور توڑی ملی جلی۔ اور پھر آگے سب کے ٹھکانے۔ ڈرائیور عظیم جو عرف عام میں جیم کہلاتا تھا۔ اور مالی۔ پھر خانساماں فضل دین جو تیسرے پہر اپنا پھندنوں جڑا الغوزہ بجایا کرتا۔ شام ڈھلے کوارٹروں سے چارپائیاں باہر نکالی جاتیں۔ صاف ستھرے بستر بچھتے۔ مالی ہاتھ کی چھوٹی سی حقّی پیتا۔ بند مٹھی میں وہ پُراسرار سی حقّی ہوتی۔ وہ انگلیوں کی جھونپڑی سی بنا کر منھ کے قریب لے جاتا۔ گڑگڑگڑ۔ اور پھر تھوڑا سا دھواں۔ مغرب کی اذاں درختوں ہوتی برآمدے میں اترتی۔ کوارٹروں میں لالٹینیں روشن ہو جاتیں۔ ڈبو کی عجیب کیفیت تھی۔ اذاں پر ہولے ہولے رونے لگتا۔ اس کے گلے سے درد سے لرزتی باریک آواز نکلتی۔ ایسے میں آس پاس گھروں کی منڈیریں اور بھی تنہا اور خاموش ہو جاتیں۔ درخت، سراپا سماعت، معلوم نہیں کن صداؤں کی لہریں جذب کرتے رہتے۔

وہ شدید گرمی کی شام تھی۔ درودیوار سے انچ اُٹھ رہی تھی۔ ابھی ابھی عصر کی اذاں کے ساتھ ساتھ ڈبو دھاروں‌دھار رویا تھا۔ ایسے میں اس کے پورے جسم میں جُھرجُھری اٹھتی۔ اندر فضل دین میز پر شام کی چائے لگا رہا تھا۔

"چائے۔۔ چائے۔۔" چھوٹی۔ پیالی پر چمچی کی تال بجا رہی تھی۔ کہ اچانک سڑک پر تیز گھسٹتی ہوئی بریک لگی۔ چرررررر۔۔۔ کچھ وقفہ۔۔۔ اور پھر رواں دواں سواریاں۔ گھر لبِ سڑک ہوں تو دن رات ٹریفک کا ریلا گویا گھر ہی میں بہتا ہے۔

"مگر کھلا کیسے؟ یہ تو بندھا تھا اس زنجیر کے ساتھ۔" تاؤجی ہاتھ میں ٹوٹی زنجیر لیے کھڑے تھے۔ "میں نے خود اپنے ہاتھوں سے باندھا تھا۔" انھوں نے سوچتی آنکھوں سے سڑک کے پار دیکھا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ اور آسماں کناروں کناروں سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر روز ہی کی طرح اندھیرا ہوا۔ مغرب کی اذاں گونجی۔ اندھیرا پڑے مالی حقّی گڑگڑاتا، تاؤجی کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا رہا۔

"مگر تاؤجی، میں نے کھُد دیکھا، اس جنجیر کے ساتھ بندھا تھا۔ میں ادھر درکھت تلے بیٹھا تھا۔ ایک دم جیسے کسی بلاوے پر اس نے ایسا جور لگایا، ایسا بپھر کر جور لگایا، میں دیکھتا رہ گیا۔ مانو کسی نے کھُد ہاتھ سے زنجیر کھول دی ہو۔ تیر کی طریوں بھاگا، سیدھا۔ اور اسی دم، ادھر سے وہ اینٹوں کا ٹرک چلا آ رہا تھا، مانو اسی کی کھاتر، اور سیدھا اس کے اوپر سے گجر گیا۔ پر میں کہتا ہوں اس کی جنجیر کس نے کھولی؟

"اس نیلی چھتری والے کے اشارے پر کھلی میرے بھائی۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔" تاؤجی نے ٹوپی اتار اپنے گھنے سفید بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دوبارہ ٹوپی سر پر دھری۔ "جب وہ ساعت آ گئی، تب نہ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ آدمی خودبخود اپنی جگہ پر کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہ اسی وعدہ نبھانے والے کا وعدہ ہے۔ چلو اب اس زنجیر کا کیا کرنا ہے۔"

انھوں نے زنجیر ایک طرف ڈھیر کر دی۔ پھر اٹھائی۔ اسے الٹا پلٹا۔ پھر زیرلب۔ "خودبخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل۔ تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی۔" مالی مفت میں شرمندہ، پشیماں، بیٹھا حقّی گڑگڑاتا ہے۔

اب مالی کی بھانجی اکثر آنے جانے لگی۔ اس کا سانولا، دبلا پتلا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کو کپڑے دھونے والی صابن کی ٹکیا نظر آتی، جو چپ چاپ گھلتی چلی جاتی ہے۔ سردیوں کے آغاز میں دُھنیا آتا۔ خالی کوارٹر میں روئی دُھنکی جاتی۔ اوپر چھت تک روئی کے گالے برف ایسے سفید؛ پہاڑ سا جمتا چلا جاتا۔ اور اس کی آواز۔ دھن۔۔ دھن۔۔ دھا۔۔ برابر کی چھوٹی چھوٹی آوازوں کے بعد ایک ترچھی پڑتی چوٹ۔ دُھنیا مالی کا ہم وطن پوربی تھا۔ اس کی وہ لمبی سی کماں مہارت سے چلتی رہتی۔ لحاف بھرے جاتے۔ روئی کو چھڑی سے برابر کیا جاتا۔ ہلکی ہلکی چوٹ سے کنارے کنارے روئی پھیلائی جاتی۔ اور پھر مالی کی بھانجی، اس کا نام مہروں، یقیناً مہرالنسا ہو گا، مہروں دالان میں فرش پر لحاف پھیلائے، سر جھکائے ڈورے ڈالتی رہتی۔ کبھی اماں ادھر آ نکلتیں۔ باتیں کرتے کرتے مہروں کی آنکھیں یکدم جل تھل ہو جاتیں۔

"اور مالی؟ اس کا کوئی نہیں؟" اماں نے پوچھا۔

" ماما؟ مامی ہے۔ دو بیٹے ہیں۔ نانی بھی تھی۔ مر گئی۔ ایک بیٹا تو بہت بیمار رہا۔ بہت یاد کرتا تھا ماما کو۔ سب لوگ بہت روتے ہیں۔ مامی تو بالکل۔۔۔"

"چلو، کبھی ان کو بھی یہیں لے آئے گا نا۔" اماں نے تسلی دی۔

"بہت کوشش کی مگر پاسپورٹ نہیں بنتا۔ بند ہیں۔ بالکل نہیں بنتے کی۔"

اباجی بھی بہت بُھلکّڑ تھے۔ اماں کے باربار کہنے پر بھی مالی کا پاسپورٹ نہ بنوا سکے۔ جانے سے ایک دو دن پہلے، وہ بہت سا وقت کوارٹر میں گزارنے لگا تھا۔ کبھی رات گئے اس کی گہری کھردری آواز لہر در لہر کھڑکی سے ٹکراتی۔

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے
جس کے کارن میں جوگی بھئی وہی نہ جلتا ہوئے

وہ جیسے کسی اونچان سے گرتی چلی جاتی۔ پھر ایک روز صبح سویرے مالی سلام کرنے کو پہنچا۔

"میاں تم بغیر پاسپورٹ کے کہاں جا رہے ہو؟ سرحد کیسے پار کرو گے؟ ابھی رکو، کچھ عرصے میں سلسلہ چل نکلے گا۔ بن جائے گا پاسپورٹ۔"

"جی نہیں صاب۔ میرا دل پریساں ہے۔ لگتا ہے وہاں میری جرورت ہے۔ ان سب کی آواجیں آتی ہیں کانوں میں۔ بس ان کو لے کر آ جاؤں گا اپنی اس کوٹھریا میں۔ ابھی تالا لگائے جاتا ہوں۔ تالی بیگم صاب کو تھما دی ہے۔"

یوں اس بیچ کے کوارٹر میں تالا ڈل گیا۔ زنجیردار کنڈے میں بھاری سا لوہے کا تالا،

Scanned with CamScanner

جس میں مسلسل بارش سے زنگ لگ گیا۔ چابی معلوم نہیں اماں نے کہاں ڈال دی ہو گی، کیوں کہ جب دوسری برسات میں سب کوارٹروں کی چھتیں ٹپکیں تو اس کا تالا تاؤجی نے ہتھوڑے سے توڑا۔ سامنے جگمگاتی پتیلیوں پر مٹی کی تہہ جمی تھی۔ چارپائی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے پائے کے ساتھ گیندے کا سوکھا ہار لٹک رہا تھا۔ مہری نے کانپتے کانپتے، پتیلیوں، رکابیوں، پیالیوں کے ساتھ ساتھ وہ ہار بھی بوری میں ڈالا۔ چارپائی ٹھیلے پر رکھوائی۔

"ہمارے محلّے کا لڑکا اور ماما ساتھ ہی تو گئے تھے۔ مگر بارڈر کے قریب سے وہ تو لوٹ آیا۔ ماما اندھیرے میں سرکا۔ تابڑتوڑ گولیاں برسا کیں۔ مگر وہ بھاگتا ہی گیا۔ آ رہا ہوں۔ آ رہا ہوں۔"

"وہ نیلی چھتری والا۔" ٹھیلا جانے کے بعد تاؤجی نے انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی۔ "وہی اشارے کرتا ہے۔ کبھی صدائیں دیتا ہے۔ لبیک اللھم لبیک۔ ہر جی کو وہ مزہ چکھنا ہے جو چکھنا ہے۔ حضرت سلیمان دربار کرتے تھے کہ ایک شخص نے باریابی چاہی۔ بلا کر تختِ شاہی پر بٹھایا۔ وزیر بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ نووارد اسے بہت دیر تک گھورتا رہا۔ بارے رخصت ہوا۔ وزیر نے حضرت سلیمان سے عرض کی یہ شخص کون تھا جو مجھے اس بری طرح گھورتا رہا۔ حضرت نے فرمایا یہ عزرائیل تھا کہ انسانی بھیس میں آیا۔ وزیر نے عرض کی مجھے اس کا گھورنا بہت برا لگا۔ آپ مجھے فلاں دوردراز کے جزیرے میں پہنچا دیجیے۔ حضرت نے اپنے ہوائی تخت پر اسے مذکورہ جزیرے میں پہنچا دیا۔ وہاں وہ شخص پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔ بعد میں حضرت سلیمان سے عرض کی کہ جب میں آپ کے پاس آیا، حیراں تھا کہ مجھے تو چند لمحوں میں اس جزیرے میں اس شخص کی روح قبض کرنا تھی اور یہ اب تک یہاں بیٹھا ہے!"

تاؤجی نے ڈبو کی ٹوٹی زنجیر اور کوارٹر کا تالا لپیٹ کر خالی طاق میں ڈال دیے۔

rekhta

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner

نکانور پارا

Nicanor Parra

پابلو نیرودا کے ہم وطن نکانور پارا ۱۹۱۴ میں سانتیاگو (چیلے) سے دو سو میل جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے شہر چیان میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے کئی افراد کو موسیقی کے میدان میں غیرمعمولی صلاحیت حاصل تھی، اور ان کی بہن ویولیتا پارا نے بعد میں ایک مغنیہ اور نغمہ نگار کے طور پر بین الاقوامی شہرت پائی۔ نکانور پارا کی تربیت غربت اور مذہبیت کے ماحول میں ہوئی۔ ایک تعلیمی وظیفے پر سانتیاگو منتقل ہونے پر انھیں اپنے دیہاتی طورطریقوں اور مذہبیت کے باعث ہم جماعتوں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑا، لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی خوداعتمادی سے صورت حال پر قابو پا لیا۔ ان کے لکھنے کا آغاز اسکول کے رسالے میں ہوا۔ پارا نے انجینئرنگ اور طبیعیات کے مضامین میں اعلا تعلیم حاصل کی، اور طبیعیات سے گہری دلچسپی نے شاعر کے طور پر ان کی نشوونما پر دوررس اثرات مرتّب کیے۔ نظریہ اضافیت کا قائل ہونے کے باعث انھوں نے جانا کہ کسی مظہر کی حقیقت اس کے ادراک پر بنیاد رکھتی ہے۔ پارا کی ادبی تربیت انّیسویں صدی کی ہسپانوی شاعری کی رومانی روایت کے سائے میں ہوئی تھی، اس لیے انھیں احساس تھا کہ اپنے زمانے کے موضوعات کو برتنے کے لیے موزوں زبان انھیں خود وضع کرنی ہو گی۔ والٹ وٹمین کی بول چال کی زبان اور کافکا کی تحریروں کے الم طربیے کے عناصر نے پارا کے "اینٹی پوئم" کے اسلوب کی طرح ڈالی، اور یوں لاطینی امریکی شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہر انقلابی اسلوب کی طرح پارا کی شاعری نے لوگوں کو بیک وقت مشتعل اور مسحور کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں "پرانے لوگوں کے واسطے/شاعری سامانِ تعیّش تھی/جبکہ ہمارے لیے/ یہ بنیادی ضرورت ہے"۔ اپنی شاعری کے شدید سیاسی میلان کے باوجود پارا نے اپنی آزادی کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ "میں دائیں یا بائیں بازو کی حمایت نہیں کرتا،" پارا کا کہنا ہے، "میں تو صرف بنے بنے سانچوں کو توڑتا ہوں۔"

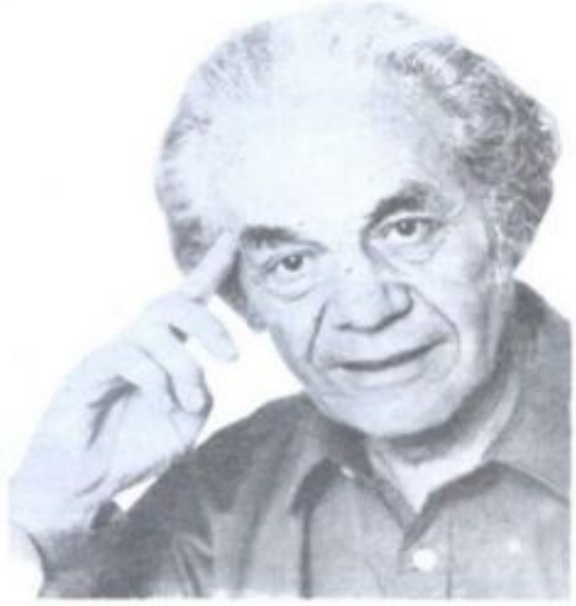

نِکانور پارا

انگریزی سے ترجمہ : فہمیدہ ریاض

قاری کو انتباہ

مصنّف اُن مسائل کی ذمےداری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں
جو اِن تحریروں سے اٹھ کھڑے ہوں۔
یہ قاری کے ساتھ زیادتی ہے
لیکن اسے یہ قبول کر کے ہی چلنا پڑے گا۔
سیپلیٹس، عظیم مزاح نگار اور عالم دین نے
تثلیث کے نظریہ مقدس کے پرزے اڑانے کے بعد
کیا اس تکفیر کی ذمےداری قبول کی تھی؟
اور اگر کی تھی تو کیا خاک!
ایک مخبوط الحواس طریقے سے،
ذمےداری، جو تضادات کے انبار پر کھڑی تھی۔

قانون کے جلادوں کا کہنا ہے،
یہ کتاب ہرگز روشنی نہ دیکھے،
اس میں کہیں لفظ "قوسِ قزح" نہیں ملتا،
لفظ "الم" کا تو ذکر ہی کیا۔
ہاں، میزوں اور کرسیوں کے دَل کے دَل موجود ہیں،
دفتری رسد کا سامان ہے! تابوت ہیں!
یہ سب سن کر
میں خوشی سے پُھولا نہیں سما رہا
کیونکہ میں صاف دیکھ سکتا ہوں
آسمان پارہ پارہ ہو کر گر رہا ہے۔
جن حضرات نے وٹگنسٹین کی کتاب "ٹریکٹس" پڑھی ہے
شوق سے چھاتی پیٹ سکتے ہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

کیونکہ یہ کتاب آسانی سے دستیاب نہیں۔
مگر حلقہ" ویانا تو برسوں پہلے منتشر ہو گیا
اس کے ارکان
اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر
غائب ہو چکے،
اور میں نے چاند کے ان دیوانوں کے خلاف
اعلانِ جنگ کا فیصلہ کر لیا ہے۔

صاحبو! ممکن ہے میری شاعری سے کچھ حاصل نہ ہو۔
میرے نقاد دلیل دے سکتے ہیں،
"اس کتاب میں ہنسی ایک ڈبے میں مہربند ہے۔"
"یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔"
"ان اوراق سے سرد آہیں نہیں، جمائیاں آتی ہیں۔"
"یہ اس طرح لاتیں چلا رہا ہے، چیخ چلا رہا ہے
جیسے دودھ پیتا بچہ چھاتی کے لیے بلبلائے۔"
"ابلاغ کے لیے چھینکیں مار رہا ہے۔"
درست!
تو میں آپ کو دعوت دیتا ہوں
اپنی کشتیاں جلا دیں۔
فونیشیائی باشندوں کی طرح
میں اپنی ابجد تخلیق کر رہا ہوں۔

"لیکن لوگوں کو اس مشکل میں کیوں ڈال رہے ہو؟"
میرا مہربان قاری پوچھے گا،
"وہ کلام کیونکر اچھا ہو سکتا ہے
مصنف جس کی خود تحقیر کرے؟"
نہیں جناب، ہوشیار،
میں نے کسی چیز کی تحقیر نہیں کی ہے،
بلکہ یوں کہیے کہ میں تو ستائش کروں گا
اپنے زاویہ" نگاہ کی۔
مجھے اپنی تمام کوتاہیوں پر فخر ہے۔

میں اپنی تخلیقات کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دوں گا۔

ارسٹوفینس کے پرندوں نے
اپنے والدین کی میتیں
اپنے سر میں دفن کر لی تھیں
(درحقیقت ہر پرندہ ایک اڑتا ہوا قبرستان تھا۔)
میرا خیال ہے
اس رسمِ قدیم کی تجدید کا وقت آ گیا ہے،
لہٰذا
میں اپنے کلک کو
دفن کر رہا ہوں
اپنے قاری کے سر میں۔

یاترا

توجّہ فرمائیے، خواتین و حضرات، ذرا توجّہ فرمائیے
بس ایک لمحے کے لیے توجہ فرمائیے
صرف ایک سیکنڈ کے لیے
اپنے چہروں کا رخ
جمہوریہ کے اس حصے کی جانب موڑ لیجیے
ایک رات کے لیے اپنے ذاتی معاملات بھلا دیجیے
آپ کی خوشیاں اور غم دروازے پر انتظار کر سکتے ہیں
جمہوریہ کے اس حصے سے ایک آواز آ رہی ہے
توجہ فرمائیے خواتین و حضرات
بس ایک منٹ کے لیے توجہ فرمائیے

ایک روح
جو برسوں سے
ایک دانش ورانہ اور جنسیاتی کنویں میں قید تھی،
ناک کے ذریعے نہایت ناکافی خوراک حاصل کرتی ہوئی،

rekhta

Scanned with CamScanner

آپ کی سماعت کی متمنّی ہے

میں کچھ چیزیں تلاش کرنا چاہتا ہوں
مجھے تھوڑی سی روشنی درکار ہے
مگر باغ میں مکھیوں کی بھرمار ہے
میری دماغی حالت بےحد بیمار ہے
رفتہ از کار ہے
نتائج تک پہنچنے کا
میرا ایک مخصوص طریقۂ کار ہے
میں یہ کہہ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں
کہ ایک سائیکل لگی کھڑی ہے اور ایک دیوار ہے
میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک پُل ہے
اور عمارتوں میں غائب ہوتی ہوئی
ایک کار ہے

آپ اپنی زلفوں میں شانہ کرتے ہیں
اور گلگشت کرتے ہیں
درستا
آپ کی جلد کے اندر
اور کئی جلدیں ہیں
اور ایک ساتویں جس، جس کے ذریعے
خودبخود
آپ اندر سے باہر
اور باہر سے اندر ہو جاتے ہیں

لیکن میں ایک بچہ ہوں
چٹان کے عقب سے ماں کو پکارتا ہوا
میں یاتری ہوں، جس کے باعث
پتھر اس کی ناک تک اچھل پڑتے ہیں
میں درخت ہوں
جو چیخ رہا ہے
پتّوں سے ڈھک جانے کے لیے

بچپن کی یادیں

اب تو یقیں کے ساتھ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں
اُن دنوں
میں کبھی آگے بڑھتا تھا، کبھی پیچھے ہٹتا تھا
کبھی میں درختوں سے ٹکرایا
کبھی فقیروں سے
کرسیوں اور میزوں کے گھنے جنگل میں
میں نے مشکل سے اپنا راستا بنایا
میں نے پت جھڑ دیکھے، جب کہ میری روح ایک دھاگے سے لٹکی ہوئی تھی
لیکن
یہ سب کچھ بےکار تھا
ہر موڑ پر
ایک لجلجے مادے میں اور گہرا دھنس جاتا تھا
لوگ مجھ پر پڑنے والے دوروں پر ہنستے تھے
سمندر کی تہہ میں لہروں سے ہلنے والے اُبی پودوں کی مانند
وہ کردار اپنی آرام کرسیوں میں کروٹ لیتے
عورتیں مجھے کراہت سے دیکھتیں
مجھے اِدھر اُدھر گھسیٹے پھرتیں
وہ مجھے میری مرضی کے خلاف
ہنساتیں اور رلاتیں
ان باتوں سے میرے اندر متلی پیدا ہوتی
اور ایک ہذیان
دھمکیاں، گالیاں، لاحاصل کوسنے
اور تھکی سے چُور کرنے والی، سرینوں کی متواتر جنبش
ایک طاغوتی رقص
جس سے میری سانس اکھڑ جاتی
میں سر نہ اٹھا پاتا
کئی دنوں تک
کئی راتوں تک

rekhta

Scanned with CamScanner

یہ سچ ہے
میں یوں ہی
آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے عمل میں گرفتار تھا
میری روح راستوں پر تیرتی رہتی
مدد کے لیے پکارتی ہوئی
ذرا سی محبت کی بھیک مانگتی ہوئی
کہیں میں بیوقوف نہ بنوں، اس لیے
میں کاغذ قلم لے کر قبرستانوں میں پہنچ جاتا
میں ایک ہی حقیقت کے بار بار پھیرے لگاتا
ہر شے کی جزئیات کا کلّی مطالعہ کرتا
جھنجھلاہٹ میں اپنے بال نوچتا

درس گاہ میں زندگی کا آغاز
اسی کیفیت میں ہوا
میں ادبی اجتماعات میں
گولی سے زخمی آدمی کی طرح
خود کو گھسیٹتا ہوا پہنچتا
غیروں کے گھروں کی دہلیزیں پھلانگتا

کوشاں رہتا کہ
میری چابک زبانی سے دیکھنے والے سمجھ جائیں
مگر وہ اخبار پڑھتے رہے
یا کسی ٹیکسی کے پیچھے غائب ہو گئے
پھر میں کہاں جاتا
اس وقت تو دکانیں بھی بند ہو جاتی تھیں
میں ایک پیاز کی قاش کے بارے میں سوچتا
جو میں نے رات کے کھانے پر دیکھی تھی
یا اس اندھے کنویں کے بارے میں
جو ہمیں جدا کرتا ہے
دوسرے اندھے کنووں سے

آخری جامِ صحت

آپ کو بھلا لگے یا برا
ہمارے سامنے تین ہی راستے ہیں
ماضی، حال اور مستقبل

اور تین بھی کہاں
فلسفیوں کا قول ہے
ماضی گزرا ہوا ہے
وہ صرف یادداشت میں ہمارا ہے
جس گلاب کی پنکھڑیاں نوچ لی گئی ہوں
اس میں نئی پتّی نہیں پھوٹتی
اب ہمارے پاس دو پتّے رہ جاتے ہیں
حال اور مستقبل

اور دو بھی کہاں
کیونکہ سب جانتے ہیں
حال وجود نہیں رکھتا
صرف ماضی ہی کر وجود میں آتا ہے
گزرا ہوا،
جوانی کی مانند

قصّہ مختصر
ہمارے پاس صرف مستقبل بچتا ہے
میں جامِ صحت تجویز کرتا ہوں
اس روز کے لیے
جو کبھی نہیں آتا
اس واحد شے کے لیے
جس پر
سچ مچ ہمارا اختیار ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

افراطِ زر

روٹی مہنگی ہو جاتی ہے
اس لیے
روٹی اور مہنگی ہو جاتی ہے

کرائے بڑھ جاتے ہیں
اس لیے
تمام کرائے فوراً دگنے ہو جاتے ہیں
کپڑے کی قیمت چڑھ جاتی ہے
اس لیے
کپڑے کی قیمت دوبارہ چڑھ جاتی ہے

کوئی راہِ فرار نہیں
ہم ایک دائرۂ شر میں قید ہیں

پنجرے میں دانے ہیں
زیادہ نہیں، مگر دانے ہیں
اور باہر
آزادی کے ویرانے ہیں

راز و نیاز

ہم گھنٹے بھر سے یہاں ہیں
لیکن تمہارے پاس ہر بار وہی پرانا جواب ہے
اپنے لطیفوں سے تم مجھے پاگل کر دینا چاہتے ہو
جو اب مجھے زبانی یاد ہو چکے ہیں
تمہیں میرے ہونٹ پسند نہیں؟ میری آنکھیں؟

مجھے تمہارے ہونٹ بالکل پسند ہیں
پھر تم انہیں چومتے کیوں نہیں؟
میں ابھی چومتا ہوں
اور میری رانیں؟ میرے پستان تمہیں اچھے نہیں لگتے؟
کیا مطلب تمہارے پستان مجھے اچھے نہیں لگتے؟
تو پھر انہیں چھوو، جب کہ موقع ہے
مجھے تمہارا یہ سب کروانا پسند نہیں
پھر میرے کپڑے کیوں اتروائے تھے؟
میں نے تو نہیں اتروائے تھے
تم خود چاہتی تھیں تو اتار دیے
چلو اب کپڑے پہن لو
شوہر کے گھر لوٹنے سے پہلے
باتیں بند کرو اور کپڑے پہن لو
اپنے شوہر کے گھر پہنچنے سے پہلے

ایمرجنسی کی نظمیں

بیماری، بڑھاپا اور موت
ہنسوں کی جھیل کے اردگرد
معصوم لڑکیوں کی مانند رقصاں ہیں
نیم عریاں
مدہوش
ان کے قرمزی ہونٹ اکساتے ہیں

× × ×

کوئی بھی دیکھ سکتا ہے
کہ چاند پر کوئی نہیں رہتا

کہ کرسیاں میزیں ہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

اور تتلیاں پھول ہیں
ہمیشہ پھڑپھڑاتے ہوئے
کہ سچائی ایک اجتماعی غلطی ہے
کہ روح بدی کے ساتھ مر جاتی ہے

کوئی بھی دیکھ سکتا ہے
کہ جھریاں زخم کے داغ نہیں ہیں

× × ×

کسی بھی وجہ سے جب کبھی
مجھے نیچے اترنا پڑا
اپنے چھوٹے سے چوبی مینار سے
میں کانپتا ہوا لوٹا ہوں سردی سے
تنہائی سے
خوف سے
درد سے

× × ×

شہد کی مکھیوں کو پت کا عرق پلا دو
انزال کا تعارف دہی سے کرا دو
خوں کی کیچڑ میں گھٹنوں کے بل جھک جاؤ
میّت کے کمروں میں چھینکو
دودھ نکالو گائے کا
اور واپس اس کے منھ پر دے مارو

× × ×

کسی نے سڑک پر کبھی
پولیس کے سپاہی کی لاش نہیں دیکھی

اس کا مطلب یہ ہے
پولیس کے سپاہی بستروں میں مرتے ہیں

یہ مطلب نہیں
کہ پولیس کے سپاہی لافانی ہوتے ہیں

آدمی

ایک آدمی کی ماں سخت بیمار ہے
وہ ڈاکٹر ڈھونڈنے نکلتا ہے
وہ رو رہا ہے
راستے میں دیکھتا ہے
کہ اس کی بیوی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ جا رہی ہے
دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے ہوئے ہیں
چند قدموں کے فاصلے سے وہ ان کا تعاقب کرتا ہے
ایک درخت سے دوسرے درخت تک
وہ رو رہا ہے
اب اسے نوجوانی کے زمانے کا ایک دوست ملتا ہے
ارے، ہم کتنے برس بعد ملے!
دونوں شراب خانے جاتے ہیں
باتیں کرتے ہیں، ہنستے ہیں
آدمی پیشاب کرنے باہر بالکنی میں آتا ہے
اسے ایک نوجوان لڑکی نظر آتی ہے
رات کا وقت ہے
لڑکی برتن دھو رہی ہے
آدمی اس کے پاس جاتا ہے
اس کی کمر میں بازو حمائل کر دیتا ہے
دونوں والز کرتے ہیں
اکٹھے باہر راستے پر آ جاتے ہیں
ہنستے ہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

ایک حادثہ ہو جاتا ہے
لڑکی بےہوش ہو جاتی ہے
آدمی ٹیلیفون کرنے جاتا ہے
وہ رو رہا ہے
وہ ایک گھر پہنچتا ہے جہاں بجلی روشن ہے
یہاں کوئی اسے جانتا ہے
ذرا رکو، کچھ کھا لو
نہیں، ٹیلیفون کہاں ہے؟
ارے کچھ کھا لو، کچھ کھا لو
پھر چلے جانا
وہ کھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے
یوں پیتا ہے جیسے سزایافتہ مجرم ہے
ہنستا ہے
اس کا اصرار ہے کہ وہ کچھ سنائے
وہ کچھ سناتا ہے
اور آخر میں ایک ڈیسک کے نیچے سو جاتا ہے

نظم

تو میں کوئی کاروبار کیوں نہیں کرتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

توہین کیے جانے پر بدلا کیوں نہیں لیتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

تمباکو نوشی کیوں نہیں کرتا؟ شراب کیوں نہیں پیتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

شادی کیوں نہیں کرتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

میں چکلے کیوں نہیں جاتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

میں ہتھیار کیوں نہیں رکھتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

میں مینڈک کا گوشت کیوں نہیں کھاتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے کم بخت!
اتنی گھناونی شے نگلنے سے تو بھوکوں مرنا بہتر ہے

نظم

تم شوہروں پر لازم ہے
بذریعہ ڈاک ہی تعلیم حاصل کرو،
یہ نفسِ نفیس حاصل کرنے کی اگر ہمّت نہیں،
نسوانی اعضائے تناسل کے بارے میں

اس سلسلے میں حددرجہ لاعلمی ہے
مثلاً تم میں سے کتنے ہیں
جو مجھے ولوا اور ویجائنا میں فرق بتائیں

اور پھر بھی تم سمجھتے ہو کہ تم کو شادی کا حق ہے
گویا تم اس موضوع کے ماہر ہو

اور نتیجہ؟ ازدواجی الجھنیں
ناجائز تعلقات، الزامات، علیحدگی
اور بےچارے بچوں کا کیا ہو گا؟

Scanned with CamScanner

نظم

خدا ہمیں بیوپاریوں سے بچائے
وہ صرف ذاتی فائدہ چاہتے ہیں

اور ہمیں رومیو جولیٹ سے بچائے
وہ صرف ذاتی خوشیاں چاہتے ہیں

شاعروں اور نثرنگاروں سے بچائے
وہ صرف ذاتی شہرت کے پیچھے دوڑتے ہیں

اکویکے کے سورماؤں سے بچائے
اور ملک کے مصنوعی باواؤں سے
ذاتی یادگاروں سے ہمیں کیا؟

خدا کے پاس اگر ابھی تک قدرت ہے
ای شیطانوں سے ہمیں محفوظ رکھے
اور محفوظ رکھے ہمیں اپنے آپ سے
ہم میں سے ہر ایک کے اندر ایک وحشی چھپا بیٹھا ہے
ہمارا بھیجا چوستا ہوا
منافعے کا لالچی بیوپاری
مخبوط العقل رومیو، بس اپنی جولیٹ کے حصول کا سودائی
ڈرامائی سورما
اپنے مجسمے سے خود سازباز کرنے والا
ای سب شیطانوں سے بچائے
اگر وہ اب بھی خدا ہے

نظم

فنونِ لطیفہ کو نجی ملکیت میں نہیں دینا چاہیے
یہ تو برابر ہے
انفراریڈ شعاؤں کو نجی ملکیت میں دینے کے
اس سے بڑھ کر مضر اور کیا ہو سکتا ہے
جمہوریہ کی سلامتی کے لیے؟
ہماری دماغی صحت
اوّلیں اہمیت کی حامل ہے
شاعری، مثال کے طور پر،
قوم کو تباہ کر سکتی ہے
شاعری کو احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے
حوزے آسنسیوں سلوا کی "نوکتورنے" یاد نہیں؟
بےشمار لوگوں نے خودکشی کر لی تھی
اس کو پڑھ کر،
یا نیرودا کی نظم نمبر بیس

شاعری فائدہ مند ہونی چاہیے
کارپوریشن برائے اقتصادی ترقی کی طرح،
یا ریلوے کے نظام جیسی، قومی ملکیت میں
آزادیِ اظہار تو افسانہ ہے

صلیب

جلد یا بدیر
اشک فشاں، میں آؤں گا
صلیب کی کشادہ بانہوں کی سمت
دیر سے نہیں، جلد ہی
صلیب کے قدموں میں

rekhta

Scanned with CamScanner

گھٹنوں کے بل جھک جاؤں گا

خود کو روکنا پڑتا ہے
صلیب سے بیاہ رچانے سے
دیکھو! وہ میرے لیے
کیسے بانہیں پھیلاتی ہے

آج نہیں
کل نہیں
پرسوں نہیں
ایک دن پھر بھی یہ ہونا ہے
فی الحال صلیب ایک طیارہ ہے
ایک عورت، جس کی ٹانگیں وا ہیں

تجویزیں

میں افسردہ ہوں، میرے پاس کچھ کھانے کو نہیں
میری کوئی پروا نہیں کرتا
گداگر نہیں ہونے چاہییں
یہ بات میں برسوں سے کہہ رہا ہوں

میں تجویز کرتا ہوں
کہ باغوں میں تتلیوں کی جگہ کیکڑے گھومیں
میرے خیال میں یہ کہیں بہتر رہے گا
ذرا سوچیے تو---
دنیا، بغیر فقیروں کے

میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم سب کیتھولک بن جائیں
یا کمیونسٹ بن جائیں، یا جو جی چاہے بن جائیں
یہ تو بس لفظوں کا پیرہیر ہے

میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم پانی کو مقطّر کر دیں
یہ عصائے گداگری مجھے جو اختیار تفویض کرتا ہے
اس کے ذریعے
میں تجویز کرتا ہوں کہ پوپ مونچھیں رکھے

بھوک سے نقاہت محسوس کر رہا ہوں میں
میں تجویز کرتا ہوں کہ مجھے ایک سینڈوچ دیا جائے
اور یکسانیت کے خاتمے کی خاطر
سورج مغرب سے نکلا کرے
ایسا
تجویز کرتا ہوں میں

نظم

تجزیے کا مطلب خود کو محروم رکھنا ہوتا ہے
ہم ایک دائرے ہی میں دلائل دے پاتے ہیں
ہمیں وہی نظر آتا ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں
کسی پیدائش سے کچھ بھی حل نہیں ہوتا
اور میں مانتا ہوں
آنسو میرے گالوں پر بہہ رہے ہیں

کسی پیدائش سے کچھ بھی حل نہیں ہوتا
صرف موت ہی سچ بتاتی ہے
شاعری بھی کسی کو قائل نہیں کرتی
اُن کا کہنا ہے کہ "فاصلہ" وجود نہیں رکھتا

وہ سکھاتے ہیں کہ وقت بھی وجود نہیں رکھتا
اور اس کے باوجود
بڑھاپا زندگی کی کڑی حقیقت ہے
سائنس جو کہتی ہے ہو گا، سو ہو گا

rekhta

Scanned with CamScanner

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

آج

شمارہ بہار ۱۹۹۱

کتاب کی صورت میں

بہت جلد شائع ہو گا

میں اپنی نظمیں پڑھ کر اونگھ جاتا ہوں
اور یہ میں نے اپنے خوں سے لکھی تھیں

میں اپنے سب قول واپس لیتا ہوں

رخصت سے قبل
آخری خواہش پوری کی جاتی ہے
دریادلِ قاری،
اس کتاب کو نذرِ آتش کر دو
یہ وہ نہیں جو میں کہنا چاہتا تھا
حالاں‌کہ یہ میرے خوں سے لکھا ہے
یہ وہ نہیں جو میں کہنا چاہتا تھا

مجھ سے بڑھ کر بدنصیب کوئی ہو گا
مجھے میرے اپنے سائے نے شکست دی ہے
میرے لفظوں نے مجھ سے انتقام لیا ہے

میرے قاری، میرے عزیز،
مجھے معاف کر دینا، میں اگر
گرم جوشی سے گلے مل کر تم سے رخصت نہ ہو پاؤں
اور جاؤں
ایک اداس، مصنوعی تبسّم کے ساتھ

شاید میری حقیقت اتنی ہی تھی
لیکن میرے آخری الفاظ سن لو
میں اپنے سب قول واپس لیتا ہوں
دنیا کی تلخی کے ساتھ
اپنے سب قول واپس لیتا ہوں

rekhta

Scanned with CamScanner

تمھاری نگاہوں کے اوجھل میں

خواب ایسے میں تمھاری ملاقاتیں جھلملاتی ہیں
ابرآلود موسموں میں ہوا کی سرگوشیاں
ہر روز یہی کہتی ہیں، کتنے اچھے تھے! ... کون؟
کوئی بھی تو نہیں، اپنے آپ سے
بات ہوتی ہے، محض لمحہ بھر کو
گماں بھی نہیں ہوتا کہ تُو جانتی ہو گی
جکڑ لیتی ہے، اناً فاناً آ لیتی ہے
موت نہیں، ایک خوشبو ... موت تلک کی
ہم کہتے ہی رہتے ہیں کہ ایسا کیسا کھٹکا
اجنبیت ہی تو ہے، تمھیں کیا خبر
قربت سے دل گداز ہوتا جاتا ہے،
آپ ہی آپ تمھاری نگاہوں کے اوجھل میں
ایک سناٹا ساتھ ساتھ چلتا ہے
محبت کی تنہائی گونجنے لگتی ہے
کوئی آنکھ اچانک دیکھتی ہے
بھائی بدھوجی، کہو کیسی رہی؟

کچرے کے ڈھیر پر

اچھا، تمھیں ایسا ہی لگتا ہے، حیرت ہے
کل میں اچانک جاگ اٹھا تھا
ایک لہر

rekhta

Scanned with CamScanner

بھگو رہی تھی، تمہارے روشن روشن ماتھے کو
سمندر سے اٹھتی، دل میں سنسناتی
آنکھوں سے لپٹ کر
گردن کی زنجیر سے جھولتی
چُھپ چُھپ جاتی، چھب دکھلاتی، گدگدی کرتی
ڈھیروں چومتے چاٹتے بوسوں کی گل پاشیاں
تیرے آمنے سامنے، دائیں بائیں، قدموں کے نیچے
کیا مانگتا؟ اتی سا وتی سا کچھ نہیں
میں بولی؛ جیوں ساگر ڈولے تیرے چلنے میں
دھرت آکاش ہلے، تیرے چلنے میں کیسی جیوتی ہے
میں بولی؛ تُو سہی سماں دھیاں سے جانے
پھر کبھی نہ آئے --- اِک کوندے موافق بےخبری میں لپک لپک رہ جائے
میں بولی؛ صدقے جاناں، تیری ٹھنڈک عرش سے اتری
کچرے کے ڈھیر پر، مقدروں کی بات ہے، پگلی! حشر دیہاڑ آباد
میں بولی، میں بولی، اور کیا بولی
اوئے گینڈے تڑی لگاتا --- باز آؤ، اجی چھوڑو بھی، شالا شاد رہو

ننگے خلاؤں کے آئینوں کی وسعتوں میں

اپنی بقیں گمانیوں اندر
شک شبہوں کی ٹریل بلیزنگ، چھیناجھپٹی، پراسنی چیوشں

چاول چُنتے، کبھی آٹا گوندھتے، کبھی کبھی سِل بٹّا چلاتے
کھانا پکنے کی گھریلو خوشبو، پوتڑے دھونا
امّاں کے سر سے جوئیں نکالتے
بخیے اُدھڑتے جاتے ہیں اس جیون کے
ہمسائیگی جھیلنا اس کے علاوہ ہے---
سیر تفریح، تواضع خاطر، کپڑے، جیولری
عینی آپا کے لٹریری میک اپ سے آراستہ باجی کی سُپرماڈ سہیلیاں

بَولا دیتے ہیں ٹائم اسپیس کے کتنی نیووم سے آڑے ترچھے
رابطوں والے فیشں
کیوٹ سا اِمی ٹیشں ہُندا جاں ہی لے لیتا ہے

ہمیں کیا لینا، اپنی تو بس مکھیاں مارتے، جوئیں نکالتے
بھیجے میں کھجلی کھاؤ --- کھرکتے کھرکتے چنڈیاں پڑ گئیں
رکا نہیں جاتا

ساس کو آیالوگ سنبھالتی ہے، وہی نوکروں والی دال دیہال
کھاتے تو ہم بھی وہی ہیں، لیکن عزّت سے --- کیوں جی امّاں؟
بہو، رُجھ گئی ہو تم، چُھپی چُھپی میں کتھم کتھا
اب کنگھی کرو

پاپولر ویسٹرن فکشں کا ڈیزائن تو آئیڈیولاگ ہے
تازہ بتازہ سائیکی ساز لباس کا
پورنو کی ہر آن بدلتی لذّتوں سے بخیے لگاتا ہے
روح کا سارا مسکیولیجر، وارفتگی میں
اپنے سامنے اپنے کپڑے اتارتا ہے، ہر پینگ ٹوم
اسٹرپ ٹیز کی پرائیویسی کو
باضی کے خودساختگی کے مصرف سے
اپنی محبوباؤں کی ماڈلنگ کرتا ہے؛
ننگے خلاؤں کے آئینوں کی وسعتوں میں

ہمزاد کے فوکس میں

گنٹر گراس کا ناول فٹ پاتھوں پہ رُلتا رہا ہے
یکدم قیمتی ہو گیا؛ پہلا حوالہ ذات کا سکرٹ سُلگاتے میں چمکا
ٹن ڈرم سے، جاناں، تمھیں پہچانا، بےمعنی جنُوں سے رُلتے ملتے
ایش ٹرے ہونے کی؟ --- بجڑے، یہیں رکھ دو

Scanned with CamScanner

پہلے پڑھا تھا، ہمزاد کی اُچکل پر
کیا بات ہے لیو ٹالسٹائی کی
ہر دوسری خواندگی اپنا کیریبنینا کی عظمت کو چاند لگاتی ہے
گھونگھٹ کے پٹ کھولتا ریشمی لمس مقدّر کی لیرنتھائی۔۔۔
گرہ کٹ پاکٹ مار۔۔۔ مصرع جڑتا نہیں ہے
ہمزاد کا نام انگیخت، مارکیز کی تنہائی کے سو سال پڑھو
ان کے آگے پیچھے دستوئفسکی۔۔۔ قوم کے گدّے پسینے سے گیلے
رشدی کی ۔۔۔ کہاں ملتی ہے؟ ۔۔۔ یہ لیں فوٹوکاپی!
بجڑے، میں کوں خبر آہے، ایذی شوق شناہی چ کھنا کیوں
سی جاناں، ہمزاد کے حکم احکام نوکیلے مانتے بیت گئی

ہم کھانا کھانے باہر گئے تھے، بہت خوش گپّیاں کیں
جب ساحل کی ریت پر پائنچے اٹھا کر دوڑے بھاگے تھے
ہماری پنڈلیاں دیکھنے لگے، اُلو کے پٹھے، ابرے غیرے
جیسے کھا ہی جائیں گے! تابڑتوڑ حقارت کے حملوں سے
مادرگاہ کمینے، ڈُبکی لگا کر بھاگ گئے تھے
بڑھکیں چھوڑ، ہمزاد، کوئی ٹھنڈا منڈا چلیں گا؟
تمہارا گھوڑسواری کا ٹھرک نہیں جاتا
کیا ساحل، کیا سنگی ساتھی، چڑھتے ہی رہنے کا ایک جنوں
پانی کے مدوجزر کی تال پہ امرالقیس کا وصل کا نغمہ
بنتی، اس پر ہو جائے ایک ڈرنک؟
بلیلوباہ! حاتم طائی۔۔۔ تھوڑا تھوڑا چکھ لیں کے چمچی
گھر چل کے لمبے لمبے نیلی فوی سنیں گے
پھر امریکی گانوں کے کیسٹ ہوں گے
پگلی گنگنائے گی؛ میں جھوموں پھروں متوالی

لمبی گردن والی نفرتیتی کے سائیڈ پوز سے
بوریس آنکھ کا جلوہ دیکھتا ہوں
کیا درجنوں وعدوں کی توقیر یہی ہے؟
ایک کتاب نہیں مل سکتی؟ ۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ یہ لیں
چوری کی، ہمزاد کی! نو، تھینک یو!

ہر چیز کہ جس پر ہمزاد کا گہرا حاشیہ ہو، وہ غیر ہے
غیرنباتی ہے، جاناں، یقین کرو، ہمزاد بریکٹ ہے،
مجتمع کرتی، بےگانگی ذاتی، کولڈبلڈڈ قتل کا آلہ
یخ بستہ منزل، مارٹن ہائیڈیگر جیسے فریم میں لانا کہتا ہے
انسانی خوں خرابے کا حربہ، ٹیکنولوجیکل ذہنیت
آدمی اپنے آپ کو اپنی بھینٹ چڑھاتا ہے
اس کی شیلف سے چوری کی، ہمزاد کی کتاب
فی الاصل فریمنگ کا فرمہ ہے، ہمزاد کے فوکس میں

بہت سجل ہیں، بیلے رینا ایسے

اس کے رقصاں قدموں کی ترتیب میں آنکھیں الجھتی ہیں
پیپ ہول کے دونوں جانب آنکھوں میں آنکھیں
بند دروازہ کھلتا ہے، آپ کون؟
افتخار جالب! یہ وہ تو نہیں
بیٹھیے تھوڑی دیر
سیمنٹ رنگ شلوار قمیص، چمکتی آنکھیں
آنکھوں میں آنکھیں، تنگ دھڑنگ کولھوں سے پار
گداز گدیلی رانوں کی رونقیں پھیلتی ہیں
کیسے آنا ہوا؟ ہنس ہنس پوچھتی ہے
لال گلال سے بھخ بھخ کرتا چہرہ، شر کی خیر شرارتی آنکھیں
رات وہ کیکٹس کے پاس لفافہ چھوڑ گیا تھا۔۔۔
کبھی لکھ کر ہی کہنا پڑتا ہے
۔۔۔ اُس میں خاوند سے کسب تماشے کے پیسے تھے
جب کبھی ملتی ہو، دہشت ناک سی بات ہی کہتی ہو
آج نہیں ہو گی، پر شرط ہے، آئندہ بھی آتے رہیں گے جالب صاحب
اُس کا ہیولا دخل اندازی کرتا گزرتا ہے
میں کہتا ہوں، بےچاری کو بلا لو
وہ کہتی ہے، جالب صاحب، چائے پییں گے؟

Scanned with CamScanner

تھوڑی سی، سنیے، میٹھے بغیر!
قامیں پہ سبک خرامی کرتے پاؤں، واللہ، اتنے سندر
نہیں جی، دیکھنے والے کا حسنِ نظر ہے
سچّی، بہت سجل ہیں، بیلےرینا ایسے
ہاں، میں جانتی ہوں، تبھی چھپاتی رہتی ہوں
شہوت سے مغلوب نگاہیں اس کو لال بھبھوکا کرتی ہیں
اندھے پن کے ٹریفک جیم میں گھنٹی بجتی ہے، کوئی اور
نہیں، کوئی اور نہیں، یہ اپنی رکاوٹیں ہیں
کوئی سنتا نہیں، گھنٹی بجتی ہے
طوفاں کناروں کو پھاند رہے گا
ٹھہرو، وقت ہوا ہے، ٹریفک جیم سے رستا دو
ٹھہراؤ کا یہ پتھراؤ کھولو، کھولو
یہ ہیں میرے لفافے، آئیے
دیر نہ کیجیے، پہلو پکیاں---
انگنائی کی تنہائی گونجے
میکائیل جی، جبرائیل جی، دیر تلک خوش گپیاں کیجے
روٹی کھائی کے اپنی واپسی ہوئے گی
ہوٹلنگ مفت نہیں ہوتی، لفافہ لیتے جائیے، خداحافظ میکائیل
افتخار جالب، گڈبائی۔ نظم ضرور بنائیے گا۔ وعدہ؟ پکّا؟

میرے کو رات نیند نہیں آئی

کرائسس کے اس دن کے حوالے سے---
قوتوں کی ماؤف حقیقت کے گھیرے میں گھر سے چلے تھے
سیڑھیوں ہی میں رقابت رستا کاٹ گئی
کیا سوچا تھا؟ یہ نتیجہ نکلا، تنہائی میں زخموں کو چاٹیں
ہائے میریا ربّا، کھیکھڑا کھوب کھرابی کا بھیدی، کس کو روئے
یوسف کا بھائی لوگ ایسا ہی تھا
ٹھیک ہے باطل باطل ہے۔ وقت اور جذبوں کی لوٹ کھسوٹ سے

دل، میرا نادار سا دل یہ سوچتا ہے، کیا پایا؟
سوزوں کے ہر غول نے گئے کے کھیت اجاڑ دیے، تاراج کیے
میری جاں کے دھندلکے خواب و خیال، اب چیں کہاں

دھینکڑ دھینکڑ میں جسے ٹالتے ہیں، وہی مانتے ہیں
اقتدار کی رسّہ کشی میں کٹی ہزیمتیں دیکھنا پڑتی ہیں
ٹکڑے لگے رہتے ہیں، سیلی میں چھپے
ترانے کی مہلت کے متلاشی
ڈی ہیومنائزنگ پیریفری کے مارے، جاناں
تیرے ابرو کے اشارے دیکھنے والوں کی
کہیں بخششیں ہوتی ہیں!
چنگھاڑتے مست قلندر ہاتھی آتے ہیں
بُل ڈوز کرو! ہڈیاں پیس دو!
انھیں پنجا لڑانے کی جرأت کیسے ہوئی

---ایسی زندگی سے---
---جاناں---
---کوئی حد ہوتی ہے---
---سُنی جاناں---
---رکھو اپنا---
---ہائے میریا ربّا---

کرائسس کے اس دن کے حوالے سے تشویش سمندر---
جیٹھابھائی گوکھل سنھ نے جگاڑ لگا کر
گلپھ کے پھڈّے کو اچھا شگن بتایا
دعا کرو کچھ لمبا چلے، وارے نیارے ہو جائیں گے
حاضر اسٹاک دبا کر رکھو
اسکائی راکٹنگ ہو گی، بھائی لوگ
کربل کتھا کا سوچتے سوچتے دیگوں پر دیگیں مانی ہیں
ادھر زیارتیں، اُدھر حرمیں شریف
میرے کو رات نیند نہیں آئی

rekhta

Scanned with CamScanner

بھائی لوک، دیں کی خاطر، انے والے دن کو دیکھو
پائی پائی کی لوڑ پڑے گی، بھیج چھپّی کروڑ کی چوتھائی
ورلڈ بینک سے ملتاجلتا
مسلم بین القومی بینک بناؤ۔ ایم ڈی وہم ڈی کی پھکر نائیں کرنا

rekhta
rekhta
Scanned with CamScanner

اوسپ ماندلستام

انگریزی سے ترجمہ : افضال احمد سیّد

جسے گھوڑے کی نعل ملتی ہے

وہ خوش نصیب ہے جو اپنے گیتوں میں کسی کا نام لیتا ہے
کسی نام سے بھرا ہوا گیت
بغیر ناموں کے گیتوں کے بعد تک زندہ رہتا ہے

وہ اپنی دوستوں میں اپنے رہن سے پہچانی جاتی ہے
جو اسے مردوں کی قربت یا طاقت ور جانور کی کھال کی بدبو سے
غش کھا کر گرنے سے بچاتا ہے

ہوا سیاہ ہے
اس میں ہر چیز مچھلی کی طرح تیر رہی ہے
آبگینے جن میں چکّے گردش کر رہے ہیں اور گھوڑے بدک رہے ہیں
اور ایک محبوبہ کی نم آلود مٹی، جو ہر رات
کدال اور سہ شاخے سے ازسرِنو الٹی پلٹی جاتی ہے

بچے جانوروں کی ریڑھ کی ہڈیوں کے ٹکڑوں سے ایک کھیل کھیل رہے ہیں
ہمارے وقت کی بےعصمت گنتی تقریباً مکمل ہو چکی ہے
جو کچھ بھی تھا اس کے لیے تمھارا شکریہ، بس اب چلی جاؤ
جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے غلطیاں کیں اور غلط ثابت ہو گیا
وقت ایک کھوکھلی، بغیر سیوں کی سونے کی گیند کی طرح،
جو کسی سے تھامی نہ گئی،
ٹھن ٹھن کرتا رہا
جب اسے چھوا گیا

rekhta

Scanned with CamScanner

اس نے "ہاں" اور "نہیں" میں جواب دیا
جیسے بچے جواب دیتے ہیں؛
"میں تمھیں ایک سیب دوں گا" یا "میں تمھیں ایک سیب نہیں دوں گا"

آواز ابھی تک گردش کر رہی ہے جب کہ بولنے والا جا چکا ہے
گھوڑا دُھول اور جھاگ میں پڑا نتھنوں سے آوازیں نکال رہا ہے
مگر اس کی گردن کی سخت محراب یاد دلاتی ہے
کہ راستے کے تمام پتھر اس کے آتشیں قدموں سے زندہ ہوتے گئے تھے

اس لیے جیسے گھوڑے کی نعل ملتی ہے
وہ اس کی دھول صاف کرتا ہے
اسے اُون سے رگڑ کر چمکاتا ہے
اور پھر اسے آرام کرنے کے لیے
دروازے سے لٹکا دیتا ہے

جس آدمی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا
اپنے کہے ہوئے آخری لفظ کی شکل اختیار کر لیتا ہے
اور اس کے ہاتھ ان لفظوں کا پورا بوجھ محسوس کرتے ہیں
اس کے بعد بھی جب پانی کے برتن نے
گھر لوٹتے وقت خود کو خالی چھلکا دیا

اب جو میں کہہ رہا ہوں، میرا کہا ہوا نہیں ہے
یہ زمیں سے پتھر ہوئے گندم کی طرح کھود کر نکالا گیا ہے
کچھ لوگ اپنے سکّوں پر شیر کی شبیہ ڈھالتے ہیں
اور کچھ ایک چہرہ

کانسی، سونے اور تانبے کے گول ٹکڑے
خاک پر یکساں اعزاز کے ساتھ پڑے ہیں
وقت نے ان پر اپنے دانتوں کے نشان چھوڑتے ہوئے
انھیں کترنا چاہا ہے

کسی شیر کی طرح
وقت مجھے چبا رہا ہے
میں اپنے لیے جو کچھ بچ گیا ہوں
بہت کم ہے

ماندلستام اسٹریٹ

یہ کون سی شاہراہ ہے؟
ماندلستام اسٹریٹ

یہ کیسا جہنّمی نام ہے
جس طرف بھی مڑیے، یہ ٹیڑھی نکلتی ہے

درحقیقت وہ سیدھی دھار کا آدمی ہی نہیں تھا
اور نہ اس کا چال چلن کسی خوشبودار نیلے پھول کی طرح تھا،
اور یہی وجہ ہے کہ اس شاہراہ (بلکہ
سچی بات تو یہ ہے کہ اس گندے نالے) کو
اُس ماندلستام کا نام دیا گیا

نظم

انسانی سروں کے ڈھیر دوریوں میں بھٹک رہے ہیں۔
میں ان کے درمیاں سِمٹتا جا رہا ہوں۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ پاتا۔ مگر بہت محبوب کتابوں اور بچوں کے کھیلوں میں مَیں مُردوں کے درمیاں سے یہ کہنے کے لیے اٹھوں گا کہ سورج جگمگا رہا ہے۔

نظم

میری ہتھیلیوں سے تھوڑا سا شہد (ایک چھوٹا سا سورج)

rekhta
Scanned with CamScanner

اپنے دل کو سکون دینے کے لیے
پرسی فونی کی مکھیوں کی اطاعت میں لے لو

تم اس کشتی کو نہیں کھول سکتیں جو کبھی ساحل سے نہیں بندھی
اور نہ پروں میں ایک پرچھائیں کی آواز سی سکتی ہو
اور نہ گھنی زندگی سے خوف کے بغیر گزر سکتی ہو

ہمارے لیے جو کچھ بچ گیا ہے، ہوسے ہیں
اُن چھوٹی چھوٹی مکھیوں کی طرح شکستہ
جو چھتے سے جدا ہو کر مر جاتی ہیں

شفاف رات کی گہرائی میں، گھنے پہاڑی جنگل کی آسودگی میں
خوشبودار نیلے پھولوں میں، اور ماضی میں
وہ شور کر رہی ہیں

مگر اپنے دل میں میرا یہ بدوضع تحفہ
اُن مردہ مکھیوں کی غیرحسیں چمپاکلی ڈال لو
جنھوں نے کبھی شہد سے سورج بنایا تھا

نظم

سر کی جلد سردی سے جھنجھنا رہی ہے
کوئی باتیں نہیں کرتا

وقت مجھے تمھارے جوتے کی ایڑی کی طرح
گھس رہا ہے

زندگی زندگی پر غالب آ جاتی ہے
آواز دب جاتی ہے
کسی ایک چیز کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے

اب اس کو یاد کرنے کا وقت نہیں رہا

تم جانتی ہو پہلے کتنا اچھا تھا
مگر کوئی موازنہ نہیں
لہو کیسے سرگوشی کرتا تھا
اور کیسے سرگوشی کرتا ہے

نظم

ساحرانہ نگاہوں والی خیّاطہ
نازک شانوں کی جانشیں

گفتگو ڈوبی ہوئی عورت کی طرح ہے جو دوبارہ لفظوں کے بغیر زندہ کی گئی

مچھلیاں جلتے ہوئے سفینوں کے درمیاں چل رہی ہیں
گلپھڑے پانی کی پھونکیں مار رہے ہیں
اپنے بےآواز حروف کا تلفّظ کرتی ہوئی، وہ تمھاری ہیں
انھیں اپنے جسم کی روئی پر زندہ رکھو

مگر ہم سونے میں لپٹی ہوئی مچھلی نہیں
ہماری دایہ کی پسلیاں نازک
اور گود گرم تھی
لالے کے زرگل کی طرح تمھارے ابرو ایک خطرناک نسل کی نشاں دہی کرتے ہیں
میں ایک ترک سپاہی کی طرح
تمھارے لبوں کے بےمدافعت ہلال کی محبّت میں گرفتار ہوں

اے ترک لڑکی
جاں، کبھی ناراض نہ ہونا
میں ایک بوری میں تمھارے ساتھ سِل جاؤں گا

rekhta
Scanned with CamScanner

تمہارے لیے میں سیاہ الفاظ نکال لوں گا
بےشکل پانی سے بھر جاؤں گا

ماریا، کچلے ہوؤں کا سہارا
کوئی مرنے کا انتظار نہیں کر سکتا، اسے ضرور سو جانا چاہیے
میں تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں... خدا کے لیے جاؤ... جاؤ
رک جاؤ

عظیم ناموں سے ابتدا

ہم بالکل نہیں جانتے
ایلس رینڈال اس وقت کہاں ہے
کل وہ ہوٹل کے سوئمنگ پُول کے مغربی کنارے پر تھی
اور گودھرا کیمپ کا ابراہیم بوڑکا
صنعتی کارپوریشن کی پانچویں منزل پر اسے
دوربین میں دیکھ رہا تھا

اگر وہ ریشم کا کیڑا ہوتا تو اُسے اپنے کوکون میں بند کر لیتا
اور دونوں ایک ساتھ کھولتے ہوئے پانی میں ڈالے جاتے

ہماری تمام ہمدردیاں اور راتیں
اُن لڑکیوں کے ساتھ ہیں
جنھوں نے اپنے بچپنے کو جلدبازی اور بدتمیزی کے ساتھ
رخصت کر دیا
اور ہماری محبت
اس لڑکی کے لیے
جس کی آنکھوں میں نیویارک کا وقت ہے
اور جس کے ناخنوں کی پالش تاریکی میں چمکتی ہے
وہ ڈولفن کی نسل کو بچانے کے لیے سرگرم ہے

سب سے اچھی رات
اُس کے پَرم کیے ہوئے بالوں میں گزری
جب ہم جرمنی کے اتحاد پر ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے تھے

rekhta

Scanned with CamScanner

پھر بھی ہم جانتے ہیں
دل ایک ٹراپیز آرٹسٹ ہے
جو کسی تماشائی کے بغیر
اپنے فن کا مظاہرہ کیے جا رہا ہے

ویلائی وانگ اِک
اپنے کمرے میں برہنہ اور خوش ہے
اور اس حالت میں کسی مہمان کا استقبال کر سکتی ہے
مگر ہمارا علم محدود ہے

ہمیں آج ہی سے
مینسفیلڈ اسٹریٹ پر
شام کو ساڑھے پانچ بجے گزرنے والی دو لڑکیوں کو
بیلی اور بیاتریچے کے نام سے پکارنا چاہیے
تاکہ ہم دو عظیم ناموں سے ابتدا کر سکیں

صرف غیر اَہم شاعر

صرف غیراہم شاعر
[illegible] رکھتے ہیں
بچپن کی غیرضروری اور سفید پھولوں والی تام چینی کی پلیٹ
جس میں روٹی ملتی تھی

صرف غیراہم شاعر
بےشرمی سے لکھ دیتے ہیں
اپنی نظموں میں
اپنی محبوبہ کا نام

صرف غیراہم شاعر
یاد رکھتے ہیں

بدتمیزی سے تلاشی لیا ہوا ایک کمرہ
باغ میں کھڑی ہوئی ایک لڑکی کی تصویر
جو پھر کبھی نہیں ملی

مجھے ایک کہانی سناؤ

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ تم مجھ سے حاملہ ہو گئی ہو
اس کے علاوہ کہ تم اُس لڑکی سے زیادہ خوبصورت ہو
جو مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے
اس کے علاوہ کہ تم ہمیشہ سفید بلاؤز کے نیچے
سفید بریزیئرز پہنتی ہو

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ آئینے نے سب سے خوبصورت کسے بتایا تھا
اس کے علاوہ کہ آئینے میں نظر آنے والی ہر شے خوبصورت ہوتی ہے
اس کے علاوہ کہ غلام لڑکیوں کے ہاتھوں سے
شاہزادیوں کے آئینے کیسے گِر جاتے تھے
اس کے علاوہ کہ شاہزادیوں کے حمل کیسے گِر جاتے تھے
اس کے علاوہ کہ شہر کیسے گِر جاتے تھے
اور فصیل،
اور علم،
اور مقابلہ کرتے ہوئے لوگ

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ ڈیٹ لائن سے گزرتے ہوئے
تم کپتان کے کیبن میں نہیں سوئیں
اس کے علاوہ کہ تم نے کبھی سمندر نہیں دیکھا
اس کے علاوہ کہ ڈوبنے والوں کی فہرست میں کچھ نام
ہمیشہ درج ہونے سے رہ جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ بچھڑی ہوئی جڑواں بہنیں بروتھل میں
ایک دوسرے سے کیسے ملیں
اس کے علاوہ کہ کوی سا پھول کس شخص کے آنسوؤں سے اگا
اس کے علاوہ کہ کوئی جلتے ہوئے تندور سے روٹیاں نہیں چراتا

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ صلح نامے کی میز عجائب گھر سے کیسے غائب ہو گئی
اس کے علاوہ کہ ایک براعظم کو غلط نام سے پکارا جاتا ہے

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ تمھیں ہونٹوں پر بوسہ دینا اچھا نہیں لگتا
اس کے علاوہ کہ میں تمھاری زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا
اس کے علاوہ کہ اس دن بارش نہیں ہو رہی تھی

فوجی ورجِل کی زمیں چھین لیتے ہیں

فوجی ورجِل کی زمیں چھین لیتے ہیں
جس کے واپس ہونے میں
دو نظموں اور روم تک سفر
کا فاصلہ ہے

کوئی نہیں جانتا
وہ وہاں کب تک رہا
اور خانہ جنگی کتنے عرصے تک
اس کو شاعری سے روکے رہی

شہنشاہ آگسٹس
اسیس کی مہم سے "اینیڈ" کا پہلا مسوّدہ
طلب کرتا ہے

جو اُسے چار سال بعد پڑھ کر سنایا گیا
بسترِ مرگ پر

ورجِل مسلسل "اینیڈ" کا مسوّدہ طلب کرتا رہا
جلا دینے کے لیے
جو اُسے فراہم نہیں کیا گیا

rekhta

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

چوہے کو کیسے مارا گیا

چوہے کو مارا نہیں گیا۔

وہ اپنی موت آپ مر گیا۔

مرنے سے پہلے وہ جانتا تھا کہ موت اس کی گھات میں ہے۔ وہ سب موت کی شکل میں اس کے اردگرد جال بُن رہے ہیں۔ وہ جب کسی کے پاؤں سے ٹکرا کر گزرتا، وہ چونک جاتے اور زور سے اپنا پاؤں زمین پر دے مارتے۔ گویا وہ ان کے پاؤں کے نیچے اب آیا کہ جب۔ لیکن وہ ہر مرتبہ بچ نکلتا۔

ایک دن وہ بڑے ہال میں گھس آیا۔ وہ اپنے خوش رنگ لباس میں جوڑوں کی شکل میں بیٹھے تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے بوس و کنار میں، اور بہت سے پینے پلانے کے شغل میں تھے۔

وہ روشندان سے داخل ہوا۔ ان کے درمیان رکھا ہوا بڑا کیک۔ وہ سمجھ گیا تھا آج یہ پہلے سے زیادہ اس کے دشمن ہو جائیں گے۔ لیکن اس نے تہیّہ کر لیا تھا ان کی مستی میں دخل ضرور دے گا۔ وہ آہستہ سے رومانہ کے لہنگے سے سرسراتا ہوا، اس کے برابر بیٹھے ہوئے اس کے کزن کے جوتے کی ایڑی سے خود کو گھسیٹتا ہوا پُھدکا، اور بڑی میز کے کونوں کونوں گھومنے لگا۔ پھر وہ اس کیک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا جو ان سب نے بڑی محنت سے بنایا تھا جو بوس وکنار میں مشغول تھے اور اب ایک دوسرے پر اپنے لعاب لتھیڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر اچانک اس پر پڑی۔ وہ اپنی زبان اسی طرح کھینچتے ہوئے جیسے اس نے اپنے ساتھی کے منہ میں دی ہوئی تھی، کھڑا ہو گیا۔

او--- اُو--- سب نے چونک کر دیکھا۔

چوہا کیک پر ٹھمک رہا تھا۔

چوہے نے چبا کر ایک گالی ان کے لیے نکالی۔ اب انھیں میرے جسم کی خوشبو سے لتھڑا ہوا یہ کیک کھانا ہو گا، یا پھر وہ اسے میرے لیے پھینک دیں گے۔

یہ مجھے مارنے کی کیسی کیسی ترکیبیں سوچیں گے۔ واہ وا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ایسی کوئی موت نہیں مرے گا جیسی انھوں نے اس کے لیے سوچ رکھی ہے۔ وہ ٹھمک رہا تھا

اور وہ سب اپنے کیک کی بربادی پر چیخ رہے تھے۔ کسی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور فائر ہوا۔ چوہا کہاں تھا؟ وہ سب کیک کی طرف دوڑ پڑے۔ چوہا خود حیران تھا۔ وہ دس انچ اونچی کریم کی تہہ میں دھنس کر حیران تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ آئیں، چوہا کیک میں ایک لمبا سوراخ کرتا ہوا مجمع میں گھبراہٹ ہوئی سنہیا کے فراک پر چڑھ کر اس کے سرخ اور سفید گھیرے کو سانتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

چوہے کی ان سب حرکتوں سے وہ نالاں تھے۔ انھوں نے اپنی اپنی کوٹھیوں کی درازوں کو چوہےدانوں سے بھر دیا۔

اور بہت سے چوہے مارے گئے، لیکن وہ اسی شان سے دندناتا رہا، اور زندہ رہا۔ آخر انھوں نے ایک اسمبلی میں یہ طے کیا کہ اس چوہے سے نجات کا کوئی طریقہ نہیں ہے لہٰذا کچھ عرصے کے لیے وہ اس علاقے سے چلے جائیں۔

پھر وہ سب چلے گئے۔

اب چوہا اکیلا تھا۔ ان کے گھروں کے چوہے دان بٹ چکے تھے۔ وہ خالی کمروں میں، دالانوں میں اُداس پھرتا۔ اس کی ساری شوخیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ سب چالاکیاں اور تمام نفرتیں، جو ان حرامزادوں کے لیے اس کے دل میں تھیں۔

پھر ایک دن وہ خود اداسی میں دب کر مر گیا۔

چوہے کو مارا نہیں گیا۔

ایک نظم آتی ہے

وہ آتی ہے
روز میرے بہت قریب
مجھے سہلاتی ہے
گدگداتی ہے
انھوں--- انھوں---
میں حیرت اور خوشی سے
اسے دیکھتی ہوں
تم کب آئیں؟
ابھی--- ابھی تو آئی ہوں---

rekhta
Scanned with CamScanner

وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیتی ہے
میرے پستانوں سے کھیلتی ہے
میرے ہونٹوں کو چوستی ہے
مری ناف کے نیچے
بہت نیچے---
میری سانس اوپر کی اوپر رہ جاتی ہے
میں کنواریوں کی طرح
تلملاتی ہوں
بل کھاتی ہوں
وہ مجھے اٹھاتی ہے
میرے کپڑے ایک ایک کر کے اتارتی ہے
وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
ہنستی ہے
اُنھو---
میں بڑبڑاتی رہتی ہوں
ایسی ہی بےسُدھ
حیرت سے اور خوشی سے
انھو---
وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر
کہتی ہے
وہ مجھے دور سے دیکھتی ہے
اور کینوس پر مری مادرزاد
تصویر بناتی ہے
میں بےسدھ پڑی رہتی ہوں
اس ڈر سے کہ کہیں وہ چلی نہ جائے
میں اسے ڈبونا چاہتی ہوں
ایک ہی وار پر اس پر چڑھ دوڑنا
اس پر بلبلا کر حملہ کرنا
میں بھی چاہتی ہوں--- اسے ایسے ہی
اپنی گرفت میں لے آؤں
لیکن اس سے پہلے کہ

میں حرکت کروں
وہ چھم چھم کرتی
کھڑکی یا دروازے سے باہر
بھاگ جاتی ہے
میں بےسدھ
حیرت اور خوف سے
اور ملامت سے
آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی
رہتی ہوں
وہ چلی جاتی ہے
روز ایسا ہی ہوتا ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

انگریزی سے ترجمہ : نیّر مسعود

شجرالموت

وہ ہمیشہ مجھ کو شام کے ٹھنڈے دھندلکے میں دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت وہ دوسری عورتوں کے ساتھ دریا پر سے واپس ہوتی تھی۔ میرے لیے وہ لمحہ بڑا قیمتی ہوا کرتا تھا جب وہ، جو دن بھر میرے دل میں رہتی تھی، آخرکار میری نظروں کے سامنے آ جاتی۔ کبھی کبھی وہ بہت جلد میری نگاہوں سے اوجھل ہو کر اپنے گھر کے اندر چلی جاتی۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک کٹھئی مکان کی دیوار کے پاس بیٹھا راوی داستان سناتا اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ مکان کے زینے پر سمٹ کر بیٹھی ہوتی، داستان سنا کرتی۔ اور میں بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا کہ داستان کا عکس اس کی آنکھوں میں یوں جھلک رہا ہے جیسے گہرے پانی میں درختوں کا عکس پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ میرے برابر برابر چلنے لگتی اور میرے ساتھ باتیں کرتی۔ سرخوشی اور مہجوری کی یہ شامیں مجھ کو بہت دنوں تک یاد آیا کرتیں۔

اور آخر ایک دن میں راوی کے پاس جا پہنچا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور اس کا تعلق ہماری نسل سے نہیں تھا۔ وہ کسی دوردراز سرزمین کا باشندہ تھا اور کئی مہینے تک دریا کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر وطن سے فرار ہوا تھا۔

"راوی!" میں نے اس سے کہا، "آج شام آ کر ہمیں کہانیاں سنانا۔" اس نے فوراً ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا۔ لیکن جب اس نے تحفے دیکھے جو میں اس کے واسطے لایا تھا تو راضی ہو گیا۔ اور میں نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ میری آنکھیں اُس کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ آج شام بھی میرے قریب سے ہو کر نکلتی چلی جائے۔

اور جب اس سیاہ رنگ راوی نے اپنے عصا کی نوک سے ریت پر لکیریں کھینچ کھینچ کر اپنے دورافتادہ وطن کے قصّے چھیڑے تو سننے والوں کے حلقے میں وہ بھی تھی، اور میں اسے تکے جا رہا تھا۔ میری حالت اُس انسان کی سی تھی جو پیاس سے بےجان ہو اور بہت دور پر

Scanned with CamScanner

اسے پانی دکھائی دے رہا ہو۔

اور اس دن راوی نے ہمیں ایک درخت کے بارے میں بتایا جسے شجرالموت کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا بیج چاندی کی طرح چمکتا ہے اور جسامت میں ایک مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ اگر اس بیج کو زمین میں دبا دیا جائے تو دو سال تک وہ یوں ہی دبا پڑا رہتا ہے۔ اور پھر عجوبے کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر آفتاب کے طلوع اور غروب کے درمیان شجرالموت پورا درخت بن جاتا ہے۔ وہ ناقابلِ یقین سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا دو قدآدم کے برابر ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ اپنی اس مختصر زندگی میں شجرالموت کسی انسان کا خون پینا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرف اپنی بوجھل خوشبو پھینکنے لگتا ہے۔ یہ خوشبو نیند لاتی ہے اور موت بھی۔ اور وہ اپنی بڑھتی ہوئی اور اینٹھتی ہوئی جٹاؤں سے اپنے شکار کو جکڑ لیتا ہے۔ اور اس کی ہر جٹا میں کتنے ہی دہانے ہوتے ہیں، اور ان میں کا ہر دہانہ اس طرح انسان کا خون چوستا ہے جس طرح جونک کا منہ خون چوستا ہے۔

اور اسی سلسلے میں اس نے ہمیں ایک بےوفا عورت، اور ایک مرد کے دیرگیر انتقام کی کہانی سنائی۔ اس مرد نے رات کے وقت چپکے سے اپنی بیوی کے عاشق کے باغ میں شجرالموت کا بیج گاڑ دیا۔ لیکن دو برس بعد جب درخت نکل آیا تو اس نے اُس دوسری عورت کا خون چوس لیا، جس کی خاطر عاشق نے بیوی کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس عورت کی سُتی ہوئی رنگ باختہ لاش باغ میں پائی گئی۔ اور یہ لاش شجرالموت کے پژمردہ اور کمھلائے ہوئے باقیات کے انبار میں دبی ہوئی تھی اور مزیدبراں یہ کہ وہیں پر تین روپہلے رنگ کے بیج ملے جو اسی شجرالموت سے نکلے تھے۔

"اور اب تمام عالم میں،" وہ سیاہ رنگ راوی بولا، "شجرالموت کے بس یہی تین بیج باقی رہ گئے ہیں۔ اور چونکہ ان میں اتنا شر پنہاں ہے، اس لیے ابھی تک انہیں بویا نہیں گیا ہے۔" یہاں پر راوی نے دو بار اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیلائیں اور سمیٹ لیں۔ "ہاں! اس کے بعد سے اب تک بیس مرتبہ دریا چڑھا اور اترا ہے، اور ابھی پانچ برس تک اور ان بیجوں کی حفاظت کرنا ہے، تب کہیں جا کر ان کی قوتِ نمو، جو قوتِ شر ہے، زائل ہو گی۔ اور تب وہ بےضرر کھلونے ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر کبھی کسی مرد، کسی عورت کو شجرالموت کا طلسم دیکھنے کو نہ ملے گا۔"

میں نے اس کی کہانی کو مختصر کر کے بیان کر دیا ہے۔ اس نے سب کچھ بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا تھا۔ اس نے اپنے الفاظ سے واقعات کی ایسی زندہ تصویریں کھینچی تھیں کہ سب کو سب کچھ اپنے سامنے ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا، اور گفتگو کا ایک ایک لفظ سنائی دے رہا تھا۔ اور اس دوران میں سارے وقت میری نظریں اُس عورت پر جمی رہیں جس سے میں بےسود محبت کرتا تھا۔ وہ کسی سحرزدہ کی طرح اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ارغوانی پھول تھا جس کو اس کی انگلیاں مسلسل نوچ نوچ کر پھینک رہی

تھیں۔ سرخ پنکھڑیاں ریت پر گرتی ہوئی خون کی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں اور اس شام ڈوبتا ہوا سورج بھی خون کی طرح سرخ تھا۔

اور جیسے ہی راوی نے قصہ ختم کیا، صحرا میں ایک گیدڑ نے چیخ ماری، اور اسی وقت ایک لڑکے نے قہقہہ لگا کر کہا کہ بڈھا جھوٹ بہت اڑاتا ہے۔

"کتّے کی اولاد! میں جھوٹ نہیں بولتا۔" راوی بھڑک کر بولا۔ "میں وہی بتا رہا ہوں جو میں نے خود دیکھا ہے اور جس کا مجھے علم ہے۔ دیکھ! اس ہاتھ میں، اسی ہاتھ میں شجرالموت کا بیج رہ چکا ہے۔ ہاں، یقیناً۔" وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

"وہ میں نہیں تو کوئی تھا،" اس نے کہا، "جس نے اپنے رقیب کے باغ میں وہ بیج بویا تھا۔"

ہم سب پر خاموشی طاری ہو گئی، اور وہ مڑا اور رخصت ہو گیا۔ اور اب اس شام پہلی بار اس عورت نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھوں نے ایک مبہم سا اشارہ کیا تو میں اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے لبِ دریا تک پہنچ گیا۔ اور وہاں ہم دیر تک بیٹھے ہوئے چاند کی روشنی میں باتیں کرتے رہے۔

"تم میری بڑی تعریفیں کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں بہت حسین ہوں،" وہ کہنے لگی۔ "ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو، لیکن یہ سب سننے میں بڑا اچھا لگتا ہے۔ تم نے میرے باپ کو بہت سے تحفے لا کر دیے، اور تحفے لینا بھی بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں تم نے بوڑھے راوی کو بھی کچھ انعام ضرور دیا ہے اس لیے کہ اس نے دوسروں کے مقابلے میں تمہارا لحاظ بہت کیا، اور یہ سب سے اچھی بات ہے۔ اس لیے کہ ہر دن دوسرے دنوں کی طرح ہوتا ہے اور ہم ایک ہی طرح چکر کاٹتے ہیں، جیسے رہٹ چلانے والا بیل آنکھوں پر پٹی بندھوائے باغ کے لیے پانی کھینچتا رہتا ہے، کھینچتا رہتا ہے، لیکن کہانیاں سنتے وقت ہم کئی کئی طرح سے جیتے ہیں اور ہر دم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر، پھر تم مجھ سے محبت جتاتے ہو، اور چاہتے ہو کہ میں بھی تم سے محبت کروں۔ مگر ایسی چیز کوئی کسی کو کیونکر دے سکتا ہے جو اس کے پاس موجود ہی نہ ہو؟ دوسرے لوگ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کی باتیں کرتے ہیں، اور انہیں بھی یہی جواب ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میری عمر کا قصور ہو، کیونکہ ابھی میں بہت چھوٹی ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی دن میرے اندر بھی یہ آگ بھڑک اٹھے۔ لیکن ابھی جب تم مجھ سے محبت کی باتیں کرتے ہو تو مجھ کو یوں لگتا ہے جیسے میں کسی ایسی لکھائی کو دیکھ رہی ہوں جسے پڑھنا مجھے نہیں آتا۔ لیکن پھر بھی، پھر بھی، میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"بولتی رہو۔ تمہاری آواز بڑی اچھی لگ رہی ہے۔"

"میں اس کہانی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ پوری کہانی جھوٹ

Scanned with CamScanner

سچی نہ ہو لیکن اس میں کچھ سچائی ضرور ہے۔ میں تمھیں اس کی وجہ بتاتی ہوں جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ دو برس ہوئے ایک بوڑھی عورت اپنے مکان میں دم توڑنے کے قریب تھی اور جن لوگوں کو اس کے سرھانے رہنا چاہیے تھا، وہ ڈر کے مارے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، تو میں اس کے لیے دریا پر سے پانی لے گئی۔ اس نے بہت تڑپ کر پانی پیا، اس لیے کہ اسے تپ چڑھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے بائیں ہاتھ کے چلّو میں پانی بھر کر اس کی آنکھوں کے قریب کروں تاکہ وہ اسے دیکھ سکے۔ اور وہ اس پانی کو اتنی دیر تک دیکھتی رہی کہ میرا ہاتھ کپکپانے لگا۔ پھر اس نے وہ بات کہی جو میں نہ کبھی بھول سکی نہ کسی کو بتا سکی۔ اس نے کہا تھا، مرتی ہوئی آنکھ نے ہونی کو دیکھ لیا، اور جو میں کہتی ہوں وہ ہو گا۔ سنا تیرا محبوب تیرے پاس یوں آئے گا کہ اس کے ہاتھ میں ایک گولا ہو گا جو چاندی کا نہ ہو گا لیکن اس کا رنگ چاندی کا سا ہو گا، اور اس گولے میں زندگی ہو گی اور موت ہو گی۔

"آج رات مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ گولا شجرالموت کا بیج ہے۔ پتا نہیں وہ بیج کہاں ہو گا۔ بوڑھے نے بتایا تھا کہ اس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بیج کو لانے کے لیے لمبا اور کٹھن سفر کرنا پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی خاطر خون بہے، اور یہ بھی کہ اس کا سودا بہت مہنگا پڑے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جس دن تم اپنے ہاتھ میں شجرالموت کا بیج لیے ہوئے آؤ گے تو میرے دل میں تمھاری محبت کی آگ بھڑک اٹھے گی، میرا سر تمھارے آگے جھک جائے گا، میری آنکھوں میں نشہ چھا جائے گا، اور میرا سب کچھ تمھارا ہو جائے گا۔"

اور جب میں بولا تو میری آواز اچانک بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا،

"یہی بات تم نے کسی اور سے تو نہیں کہی؟"

"بتایا نا کہ تم پہلے آدمی ہو جس سے میں نے یہ بات کہی ہے۔ اور اگر تم قسم کھا کر کہو کہ مجھ کو وہ روپہلا بیج لا دو گے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس وقت تک یہ بات کسی اور سے نہ کہوں گی جب تک تم کوشش کر کے ہار نہ جاؤ۔ میں نے اس کام کے لیے تم کو کئی وجہوں سے چنا ہے۔ تم شریف آدمی ہو اور جب میرا حسن جاتا رہے گا اور تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو گے، تب بھی تم مجھ پر ظلم کرنا شروع نہیں کرو گے۔ تم اتنے رئیس نہیں ہو جتنے میرے بعض دوسرے طلب گار ہیں، لیکن پھر بھی تم خرچ کرنے میں ان کی طرح کنجوسی نہیں دکھاتے۔ تم نے راوی کو انعام بھی تو میری ہی خوشی کے لیے دیا تھا نا؟"

"تمھاری خوشی کے لیے۔ اور اپنی خوشی کے لیے بھی۔ کیونکہ تمھیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوتا ہوں۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے شجرالموت کا حال کبھی معلوم

نہ ہوتا۔ اور اپنے مقدّر کے راز کا بھی پتا نہ چلتا۔ اور حالانکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے، ذرا بھی نہیں، پھر بھی میں سب سے پہلے تمھارے ہی پاس آئی۔ لیکن اگر تمھیں یہ کام مشکل یا خطرناک معلوم ہوتا ہو تو...."

"نہیں نہیں، ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "یقین کرو میرے دل میں دم بھر کے لیے بھی کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ روپہلا بیج دنیا میں کہیں بھی ہو، میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اسے ڈھونڈھ نکالوں گا اور تمھارے پاس لے آؤں گا۔ اس سے مجھے موت کے سوا کوئی شے روک نہیں سکتی۔"

"بس یہ بہت ہے۔" وہ بولی۔ "اور تم اسے کب تک لے آؤ گے؟"

"ابھی کہہ نہیں سکتا کہ اس میں کتنی دیر لگے گی۔ اگر اس میں ایک سال لگ جائے تو کیا تم اتنے تک میرا انتظار کر لو گی؟"

"ہاں، ایک سال تک۔ لیکن میں نے بہت دیکھا ہے کہ محبت پانی کی طرح اڑ جاتی ہے۔ اگر دیکھنا کہ بیج ہاتھ آ جانے کے بعد تمھیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو اسے میرے پاس مت لانا، کیونکہ اُس وقت کہیں ایسا نہ ہو کہ بیج کے ساتھ دکھ چلے آئیں۔"

میں نے پاس بہتے ہوئے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

"دریا ہمیشہ بہاکتا رہتا ہے۔" میں نے کہا، "لیکن دریا ہمیشہ اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے۔ میرے دل میں تمھاری محبت بھی دریا کی طرح ہے۔"

جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے اس سے پوچھا،

"تو تم چاہتی ہو کہ تمھیں شجرالموت کا بیج مل جائے؟"

"میرے لیے۔" اس نے کہا، "بس وہ مقدّر کی ایک نشانی ہے، اور کچھ نہیں۔ اگر تم اسے لے آئے تو میں تم سے محبت کرنے لگوں گی۔ اگر تمھارے مقدر میں اسے لانا نہیں ہے تو کوئی اور لائے گا، اور پھر میں اُسی سے محبت کروں گی۔ اور رہا خود وہ بیج، تو وہ فتنے سے بھرا ہوا ہے، اس لیے میں اسے آگ میں ڈال دوں گی۔ یا ہو سکتا ہے...." اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا، "میں اسے اپنے پاس ہی رکھے رہوں، یہاں تک کہ اس کا اثر ختم ہو جائے۔ تب میرے بچے اس سے کھیلا کریں گے۔"

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ خوشی اور غم کے درمیان میرے خیالات اس گیند کی طرح بھٹک رہے تھے جس کو کھلاڑی اِدھر سے اُدھر پھینکتے رہتے ہیں۔ خوشی اس بات کی تھی کہ آج اس نے میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیں، اور اس نے ایک راز بتانے کے لیے مجھ پر بھروسا کیا، اور اس نے خود اپنی مرضی سے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں اس کی محبت حاصل کر سکوں۔

غم اس کا تھا کہ اس کو اب بھی مجھ سے محبت نہیں تھی، اور یہ کہ اگر میں اپنی مہم میں ناکام رہا تو وہ مجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گی؛ تو وہ کسی اور سے محبت کرے گی۔

Scanned with CamScanner

بلکہ نہیں، راوی نے تو یہ بتایا تھا کہ شجرالموت کے تین بیج موجود ہیں! تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر ایک بیج میں حاصل کر لوں تو کوئی دوسرا شخص بھی ایک بیج پا جائے اور پھر زیادہ تیز رفتار سے یا کسی مختصر راستے سے سفر کر کے میری محبوبہ کو مجھ سے چھین لے جائے۔

علاوہ بریں، خواہ میں اس مہم میں اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیتا لیکن اگر میرے مقدر میں اس کی محبت نہیں تھی تو میری ناکامی یقینی تھی، اور اگر وہ میری قسمت میں تھی تو چاہے میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہتا اور کوئی خطرہ مول نہ لیتا، بہرحال مشیّت کا نادیدہ ہاتھ میرے ہاتھ میں شجرالموت کا روپہلا بیج لا کر رکھ دیتا۔ اور اس طرح سوچتے سوچتے میں اس پرانے مقولے کا قائل ہونے لگا جو سنگِ خارا کی طرح قدیم اور مضبوط اور سفّاک ہے، کہ جو لکھ دیا گیا وہ لکھ دیا گیا، اور جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔

یہ سب سہی، لیکن اگر مجھ کو وہ عورت نہ ملتی تو سونا اور جواہرات اور مویشیوں کے گلّے اور سرسبز کِشت زار میرے کس کام کے تھے۔ اس کے بغیر زندگی ہی کی کیا قیمت تھی۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا تھا کہ سب کچھ داؤں پر لگا دوں۔ آخر میں نے خود بھی دیکھا تھا، اور کتنی ہی داستانوں میں سنا تھا، کہ جو اپنی مرضی سے کوئی بڑی قربانی دیتا ہے اس کو بالآخر اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

امید کے مطابق سیاہ فام بوڑھا مجھے بستر پر لیٹا ہوا ملا، گو طلوعِ آفتاب کو کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ ہمیشہ کا کاہل تھا، حالاں کہ اب بھی اس میں کام کرنے کی سکت موجود تھی۔ جو لوگ اتفاقاً اس کی داستانیں سن لیتے تھے، وہ اس کو چھوٹے موٹے انعام دیا کرتے تھے؛ لیکن اگر کوئی میری طرح خاص طور پر اس سے داستان سنواتا تو انعام بھی زیادہ ہوتا، اور اسی طرح اس کی روزی چلتی تھی۔

اور جب میں تیز دھوپ سے ہو کر اندر داخل ہوا تو شروع میں اس کی کٹیا تاریک معلوم ہوئی، لیکن ذرا دیر بعد وہ مجھے اچھی طرح دکھائی دینے لگا، اور میں سمجھ گیا کہ جو لبادہ وہ پہنے ہوئے ہے، اسے کسی نے دیا ہو گا، اور وہ ڈھیلی چپلیں جو اس کے قریب ہی زمین پر رکھی ہوئی ہیں، اسے کسی سے ملی ہوں گی۔

اور صاحب سلامت کے بعد میں نے اس سے کہا:

"ایک بہت خاص معاملہ ہے۔ میں تمھیں اس کے بارے میں ابھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ مجھے اس میں تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم میری مدد کر سکو تو میں اس کے انعام میں تم کو بہت قیمتی تحفے دوں گا۔ ذرا میرے باغ تک چلو، وہاں اطمینان سے گفتگو ہو گی۔ وہاں سایہ بھی خوب ہے اور نارنج کے پیڑ میں ابھی کچھ پھل بھی لگے ہوئے ہیں۔"

اس پر اس نے بڑے ادب کے ساتھ میری پاکیزہ نسبی کو شکوک سے بالاتر، اور خود کو میرا خادم قرار دیا۔ اس نے بستر سے اٹھ کر چپلوں میں پاؤں ڈالے اور انھیں زمیں پر

ٹھیک ہو، میرے ساتھ ہو لے۔

نارنج کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے قہوہ تو پی لیا لیکن پھل دوسرے وقت کے لیے اپنے لبادے میں رکھ لیے۔

"کل رات،" میں نے اس سے کہا، "تم نے ہمیں شجرالموت کا حال بتایا تھا۔"

"اور اسی کی وجہ سے،" وہ بولا، "آج سویرے ایک عورت میرے لیے نان اور قہوہ لائی۔ لیکن وہ قہوہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا یہ ہے۔"

"کیا وہ خوب صورت تھی؟"

"وہ نغمۂ عشق تھی! لیکن افسوس کہ اب میں بڈھا ہو گیا۔ خیر، جب میں کھا پی چکا تو باہر نکلا اور اُس سگ زادے کو پکڑا جس نے مجھے جھوٹا کہا تھا، اور چپّل سے اس کی ایسی مرمت کی کہ وہ بلبلانے لگا۔ کس واسطے کہ میں نے تو ان چیزوں کا حال بتایا تھا جو رہ چکی ہیں اور اب بھی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میں ایسی چیزوں کی کہانیاں بھی سناتا ہوں جو ہو بھی سکتی ہیں، اور یہ کہانیاں سننے میں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نوعمر لڑکے بزرگوں کو ذلیل کریں؟ خیر چھوڑیے، براہِ کرم یہ بتائیے کہ وہ کون سا معاملہ ہے جس میں آپ کو میری مدد مطلوب ہے؟"

"میں شجرالموت کے ان تین بیجوں میں سے ایک لانے جا رہا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی، اور جو کچھ مال ومتاع میرے پاس ہے سب ہیچ ہے۔ اور یہ تم ہی بتا سکتے ہو کہ اس کے لیے مجھے کہاں جانا اور کیا کرنا ہو گا۔"

"اگر کوئی آدمی پوری رفتار سے بےمحابا سفر کرے تو وہ چار مہینے میں یہ مسافت طے کرے گا۔"

"تو پھر میں چار مہینے میں یہ سفر پورا کر لوں گا۔"

"مگر راہ کے خطرے بھی تو ہیں؛ رہزن، درندے۔"

"مجھے ان کا خوف نہیں،" اور میں نے اسے خنجر دکھایا جو میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

"لیکن آپ کو اس ملک میں جانا ہو گا جہاں اجنبیوں پر شبہ کیا جاتا ہے۔ اور جس جگہ روپہلے بیجوں کو محفوظ کیا گیا ہے، وہاں تو کوئی اجنبی قدم ہی نہیں رکھ سکتا، اور ان بیجوں کی حفاظت کے لیے تین پہرے بیٹھتے ہیں۔ پہلے تو پہرےداروں کا ایک بڑا حصار ہے، پھر اس کے اندر دوسرا، اور اس کے اندر تیسرا حصار۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے بدن کو رنگ کر میرے بدن کی طرح سیاہ کر لیں، لیکن نہ آپ ان لوگوں کی زبان بول سکتے ہیں، نہ آپ کو ان کے طورطریقے معلوم ہیں۔ اور اگر آپ زور زبردستی سے کام نکالنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو تن تنہا ایک انبوہ سے ٹکر لینا پڑے گی۔ غرض یہ کہ اگر آپ نے یہ سفر کیا تو دو باتیں یقینی ہیں؛ ایک یہ کہ آپ روپہلے بیجوں کو دیکھ بھی نہ سکیں گے؛ دوسری یہ کہ بہت جلد آپ ہلاک ہو جائیں گے۔"

"تم اس سے بہتر کسی اور طریقے سے میری مدد نہیں کر سکتے؟"

"ہو سکتا ہے اس کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔ آپ نے سچ کہا کہ بڑا خاص معاملہ ہے۔ اس میں بہت غوروفکر اور ناپ تول کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں واپس جاؤں اور اس معاملے میں غور کروں۔ کل پھر اسی وقت آپ کے پاس آؤں گا۔"

میں نے اسے انعام دے کر رخصت کیا۔ اس کے لبادے میں بہت سے پھل تھے، جن کی وجہ سے لبادہ عجیب طریقے پر پھول گیا تھا۔

اور دوسرے دن وہ میرے پاس واپس آیا اور کہنے لگا:

"ایک اور صرف ایک راستہ ہے۔ ممکن ہے اس طرح آپ کو وہ شے مل جائے جس کی آپ کو تلاش ہے، لیکن اس کا مل جانا ضروری بھی نہیں۔ اگر آپ یہ راستہ اختیار کرنے پر تیار ہوں تو اس کے لیے دو باتیں لازمی ہیں۔ اول یہ کہ آپ کو مجھ پر پورا پورا بھروسا کرنا پڑے گا، جتنا بھروسا اپنے سگے بھائی پر کیا جا سکتا ہے، اس سے بھی زیادہ۔ دوم یہ کہ اس میں خرچ بہت زیادہ بیٹھے گا، اتنا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے آپ کے لیے بہت کم بچ پائے گا۔"

"اور تمھیں یقین ہے کہ بس یہی ایک راستہ ہے؟"

"یہی ایک راستہ ہے۔"

"تو میں نے اسے چن لیا۔ اب مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"آپ تو وہاں جا نہیں سکتے، لیکن آپ کی طرف سے میں جا سکتا ہوں۔ اور میں جانا چاہتا بھی ہوں۔ بیس برس تک میں اس چھوٹی سی بستی میں ایک اجنبی کی طرح بسر کر چکا ہوں، اور اب میری زمین مجھے پکار رہی ہے۔ میں اپنے ہم وطنوں کی زبان اور ریت رواج سے واقف ہوں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں وہاں کے معبد کے سب سے اندر والے حصار کا پہریدار رہ چکا ہوں، اور بہت سے ایسے راز جانتا ہوں جو میری قوم کے دوسرے لوگوں پر ظاہر نہیں ہیں۔ اگر شجرالموت کے بیج تک کوئی انسانی ہاتھ پہنچ سکتا ہے تو میں بھی اس کو حاصل کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے مجھے کچھ آدمیوں کو اجرت پر لینا ہو گا، اور وہ آدمی معمولی اجرت کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔"

"واپس کب آؤ گے؟"

"میری روانگی کے نویں مہینے، خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ کسی معتبر قاصد کے ذریعے، آپ کو روپہلا بیج مل جائے گا۔"

"یہاں تک تو غنیمت ہے کہ میں تم پر بھروسا کر لوں، کیونکہ تم سے کم از کم میں واقف تو ہوں، لیکن کیا مجھے کسی ایسے قاصد پر بھی اعتبار کرنا پڑے گا جو میرے لیے قطعاً اجنبی ہو؟"

"آپ اس پر بلا خوف و خطر اعتبار کر سکتے ہیں، اس لیے کہ اس کی آدھی اجرت اس

وقت تک رکی رہے گی جب تک وہ آپ کے ہاتھ پر روپہلا بیج رکھ نہ دے۔ علاوہ بریں اسے یہ بھی علم ہو گا کہ اگر اس نے کسی قسم کی گھات کی تو نہ صرف اس کی جان لے لی جائے گی، بلکہ اس کی اس محبوب ترین ہستی کو بھی قتل کر دیا جائے گا جسے اس نے وطن میں ضامن کے طور پر چھوڑا ہو گا۔"

"یہ سفر بہت سخت ہو گا۔ اور تم اتنے بوڑھے ہو چکے ہو۔"

"میرے اندر ابھی کافی قوت محفوظ ہے، کیونکہ میں نے زیادہ محنت سے خود کو دور رکھا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں دو طرح کے لوگ بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں، وہ نوجوان جو اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہو، اور وہ بوڑھا جو اپنے وطن لوٹ رہا ہو۔"

"راستے میں تمھارے لٹ جانے کا اندیشہ تو نہیں ہے؟ تمھارے ساتھ اچھی خاصی دولت ہو گی۔"

"اگر میں باربردار اونٹوں کی قطار ساتھ لے کر کسی رئیس التجار کی طرح سفر کروں تو البتہ راہ میں بڑے خطرے ہیں۔ لیکن میں ساری دولت اپنی کمر میں لپیٹ لوں گا اور دیکھنے میں قلاش معلوم ہوں گا۔ اس کا خطرہ ضرور ہے کہ دورانِ سفر کسی حیلے سے مجھے موت آ جائے، لیکن آپ کو اور مجھ کو اتنا خطرہ تو مول لینا ہی ہے۔"

"تمھیں اس کا یقین کیونکر ہے کہ تم کو روپہلے بیج مل جائیں گے؟ جب یہ طے ہے کہ ان بیجوں کی نہاد میں شر ہے تو وہ ضائع نہ کر دیے گئے ہوں گے؟"

"نہیں، اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ ان کے شر کو اپنی موت مرنا چاہیے، اور جو لوگ انھیں ضائع کریں گے وہ اور بھی بدتر قسم کا شر پیدا کریں گے۔ اور اس شر کی زد خود ان کے سروں پر پڑے گی۔"

"جب تم نے وہ بیج اپنے رقیب کے باغ میں بویا تھا، کیا اُس زمانے میں بھی اسے معبد ہی میں رکھا جاتا تھا؟ تو پھر تم اسے حاصل کرنے کے لیے اتنی دولت کہاں سے لائے ہو گے؟"

"معبد پر نگہبانوں کی تہری چوکی بیٹھتی تھی، اور میں سب سے اندر والے درجے کا نگہبان تھا۔ لیکن بیج اس زمانے میں وہاں نہیں تھا، نہ کسی کو اس کی تاثیر کا علم تھا، سوائے میرے۔ جب میں نے اسے بو دیا، اس کے دو برس بعد لوگوں پر اس کی تاثیر ظاہر ہوئی۔ میں نے اسے ایک اور ہی طریقے سے حاصل کیا تھا، اور وہ طریقہ کیا تھا، براہِ مہربانی یہ مت پوچھیے گا، کیونکہ وہ طریقہ میرے لیے بڑا شرمناک تھا۔"

اور بہت سے سوال میں نے اس سے پوچھے، اور ہر سوال کا فوری جواب اس کے پاس تیار تھا۔ اور میں خود تو کوئی فیصلہ کرنے کے قابل تھا بھی نہیں، کیونکہ میرے ذہن میں اپنی مطلوبہ کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے ہر معاملے میں وہی کیا جو بوڑھے نے کہا۔

اس کے بعد کئی روز تک میں اپنے مقبوضات فروخت کرتا رہا، یہاں تک کہ اس سیاہ مرد

Scanned with CamScanner

نے کہا، "بس، اتنا کافی ہے۔" پھر میں اس کے ساتھ تیں دی کا سفر کر کے ایک قصبے میں پہنچا جہاں بڑی منڈی لگتی تھی۔ لیکن ہمارا کام منڈی میں نہیں بلکہ جوہریوں کی کوٹھی میں تھا، جہاں ہم نے الماس، زمرّد اور موتی خریدے۔ اور موتیوں میں ایک جوڑی ایسی تھی جس کے دونوں دانے جسامت اور شکل اور وزن اور آب میں ہوبہو ایک دوسرے کی نقل تھے۔ جب راوی اس خزینے کو اپنی کمر میں لپیٹنے کی پٹی میں باندھنے لگا تو اس نے ان جڑواں موتیوں میں سے ایک میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور مجھے اس کی حفاظت کی سخت تاکید کی۔

"یہ اس لیے،" اس نے کہا، "کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور زیادہ امکان اس کا ہے کہ میں اپنے آبائی وطن ہی میں مرنا پسند کروں۔ جس قاصد کے ہاتھ میں روپہلا بیج بھیجوں گا، اسے میرے قبیلے کا حلف کبیر اٹھا کر سوگند کھانی ہو گی کہ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں کوئی کوتاہی، کوئی دغابازی اور کوئی نافرمانی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص یہ حلف اٹھائے اور پھر اپنی سوگند توڑ دے تو اس کو روئےزمیں پر کہیں بھی ہمارے فوری اور بھیانک انتقام سے پناہ نہیں مل سکتی۔ اسی لیے میرے قبیلے کا کوئی شخص اس وقت تک یہ حلف کبیر نہیں اٹھاتا جب تک اسے بھاری انعام ملنے کا یقین نہ ہو۔"

"انصاف کی بات ہے،" میں نے کہا۔

"اس لیے جب وہ بیج لے کر روانہ ہو گا تو میں اس کو جوڑی میں کا ایک موتی دوں گا۔ اور جب وہ آپ کے پاس پہنچ کر روپہلا بیج آپ کے ہاتھ میں دے دے گا، اس وقت آپ دوسرا موتی دے دیجیے گا۔ تب وہ واپس آ کر مجھے دونوں موتی دکھائے گا اور یہی اس بات کی پہچان ہو گی کہ اس نے اپنی قسم پوری کی، اور تب میں اسے حلف کبیر سے آزادی کی تحریر لکھ کر دوں گا۔ تب وہ موتیوں کو فروخت کرے گا، اور اپنے لیے بیوی اور مکان حاصل کرے گا۔ اور تب میں بھی سکون کے ساتھ مر سکوں گا۔"

اور اس نے بھورے بادبانوں والی ایک کشتی سے معاملت کی۔ یہ کشتی موافق ہوا میں قریبی گاؤں تک گنّا لے کر جا رہی تھی۔ اور راوی کشتی بان کو معمولی سا معاوضہ دے کر گنّے کے انبار پر دراز ہو گیا، اور دھیرے دھیرے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دن بھر اس کو کشتی میں سونا تھا اور رات کو کشتی سے اتر کر ایک تیزرفتار اور خوش قدم خچّر خریدنا اور رات بھر اس کی پیٹھ پر سفر کرنا تھا، اور اسی طرح اس کو کسی نہ کسی طریقے سے آگے بڑھتے جانا تھا اور ہر موقع ومحل کے لحاظ سے مناسب قدم اٹھانا اور اپنی فراست کو پوری طرح بیدار رکھنا تھا، تاوقتیکہ اس کا سفر ختم نہ ہو جائے۔

جس روز سیاہ رنگ راوی رخصت ہوا، اسی روز میں نے اپنی باقی ماندہ پونجی کا تخمینہ لگایا۔ میرے پاس بس میرا مکان اور خانہ باغ بچ رہا تھا، اور مہینے بھر کی خوراک کا ذخیرہ تھا۔ اس کے سوا سب کچھ -- گلّے، کھیت اور وہ گنجینہ جو مجھے اپنے اجداد سے

ورثے میں پہنچا تھا، سب کچھ -- چھوٹے چھوٹے پتھروں میں تبدیل ہو گیا تھا اور یہ پتھر ایک ایسے سیاہ مرد کی کمر میں لپٹے ہوئے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے جسے دوبارہ دیکھنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں، جو ابھی تک دوسروں کو ملازم رکھا کرتا تھا، اب شاید ایک مہینے کے اندر اندر خود دوسروں کی ملازمت کیے بغیر نہ رہ پاؤں گا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات سے سراسیمہ ہو کر گریباں پھاڑ لیتا اور اپنی اس حماقت کو کوستا جس کی بدولت اسے یہ تباہی دیکھنا پڑی، لیکن میرے لیے یہ سب کچھ مسرّت کا سرچشمہ تھا۔ میں خود سے کہتا، "اب صحیح معنی میں میں نے اپنی خوشی سے ایک بڑی قربانی دی ہے، اور انجام کار میری مراد بر آئے گی۔"

اور اس شام اپنے معمول کے مطابق میں اپنی محبوبہ کے دریا پر سے لوٹنے کی راہ دیکھ رہا تھا اور جب وہ میرے قریب سے ہو کر گذرنے لگی تو اس نے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کو کہا، اور پانی کا مرتبان اپنے باپ کے مکان پر پہنچا کر وہ واپس میرے پاس آئی۔

جس رات ہم نے شجرالموت کی کہانی سنی تھی اور پھر دریا کے کنارے بیٹھ کر باتیں کی تھیں، اس کے بعد سے آج پہلی بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ادھر کچھ دن سے،" اس نے کہا، "میں تمہارے اور بوڑھے راوی کے بارے میں بہت سی بےوقوفی کی باتیں سن رہی ہوں۔ جن لوگوں کو ایک آدھ بات کا پتا ہے، لیکن اصل راز نہیں معلوم، وہ غلط سلط اندازے لگانے پر مجبور ہیں، مگر مجھے اصل راز معلوم ہے۔ جو میں جانتی ہوں، سنو گے؟"

"تمہاری باتیں میرے لیے شیریں ترین موسیقی کی طرح ہیں۔"

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کالا آدمی دوسری بستیوں میں کہانیاں سنانے گیا ہوا ہے، اور یہ کہ ایک ایک کہانی پر وہ خوب خوب انعام سمیٹ رہا ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ کچھ دن کے لیے اپنے وطن چلا گیا ہے، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنی جو املاک بیچ ڈالی ہے، اس کے بدلے میں دوسری زمینیں اور مکان مول لینا چاہتے ہو اور بڈھا وہی دیکھنے گیا ہے۔ اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ وہ چلا گیا ہے اور آج رات اس کی کٹیا میں کوئی اور سوئے گا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنے وطن گیا ہے۔ لیکن یہ راز مجھی کو معلوم ہے کہ وہ تمہارے لیے روپہلا بیج لینے گیا ہے، حالانکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم خود جاؤ گے، چاہے اس میں تمہاری جان ہی چلی جائے۔ تمہیں مجھ سے ایسی ہی محبت۔۔۔"

اور تب میں نے اس کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا کہ بےشک میں خود جانے پر آمادہ تھا، اور یہ کہ میرا جانا کیوں نہ ہو سکا۔ اس پر وہ بولی،

"اگر کوئی مرد کسی عورت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے تو یہ اس کی محبت کی

Scanned with CamScanner

سب سے بڑی نشانی ہے، لیکن اگر وہ کسی اور آدمی کو خرید کر اپنی جگہ اس کی جان خطرے میں ڈالے تو یہ اس کے سیانےپن کی نشانی ہے۔ تاہم کئی باتوں میں تم نے سمجھ سے کام نہیں لیا، کیونکہ ہو سکتا ہے بڈھا مر جائے، یا ہو سکتا ہے وہ چور ہو، اور اگر وہ بچ بھی جائے اور ایماندار بھی ہو، تب بھی ہو سکتا ہے کہ اسے روپہلا بیج مل ہی نہ سکے، اور اگرچہ اس کو بیج مل ہی جائے، تب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے تم تک پہنچا نہ سکے۔ اس طرح اگر یہ دیکھا جائے کہ میری خاطر تم نے کتنی بےوقوفیاں کی ہیں تو اس حساب سے بھی تمھاری چاہت کا پتا چلتا ہے، اگرچہ کچھ کم۔ تو اب اتنے دن تک کوئی نہ ہو گا جو مجھے کہانیاں سنائے اور ٹھنڈی شاموں کو میرے لیے گوارا بنائے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم نے مجھے پا لینے کے لیے جتنا خرچ کر دیا ہے، مجھے رکھنے کے لیے اتنا خرچ نہ لا سکو گے۔ اور میرے باپ نے مجھے تنبیہ بھی کی ہے، اور...."

یہاں پہنچ کر وہ رُک گئی اور اس کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں اور وہ ہنسنے لگی۔

"ان باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ اگر میرے مقدر میں تمھارا ہی ساتھ لکھا ہے تو یقیناً میں تم سے بہت محبت کرنے لگوں گی۔ اصل میں اس تیز ہوا نے مجھ پر ایسا اثر ڈالا کہ میں نے کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ اور اکیلی میں ہی ان جھکڑوں سے پریشان نہیں، دریا بھی پریشان ہے۔ دیکھو تو کیا بپھر بپھر کر لہریں لے رہا ہے۔ اور ڈوبتا ہوا سورج بھی کتنا غضب ناک معلوم ہو رہا ہے۔ آج رات کہیں نہ کہیں کہرام ضرور مچے گا اور بڑی تباہی آئے گی۔"

اور یہ اس نے سچ کہا تھا، کیونکہ اسی رات بھونچال آ گیا۔ اس کے شور نے مجھے گہری نیند سے چونکا دیا۔ بستی تک اس کا ہلکا سا جھٹکا پہنچا۔ میرے مکان میں دو مرتبان پاش پاش ہو گئے اور مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مٹی کے تین مکان منہدم ہو گئے، اور رات بھر لوگ چیختے اور دعائیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

میرا اندازہ تھا کہ زلزلے کا زیادہ زور صحرا پر صَرف ہوا ہو گا۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی میں نے اپنے خچّر کو کسا اور سوار ہو کر یہ دیکھنے کو نکل کھڑا ہوا کہ رات صحرا پر کیا گذری۔ اب ہوا صاف اور ہموار ہو چکی تھی، اس لیے یہ سفر بہت خوش گوار تھا۔ صحرا میں پہنچ کر ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ٹیلا اپنی سابق جگہ سے ذرا سرک سا گیا ہے، اور اب اس کے حدود وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ میں اس کے قریب تک چلا گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ٹیلا تڑخ گیا ہے اور اس کے تڑخنے سے ایک زمیں دوز مقبرے میں داخلے کا راستا کھل گیا ہے۔

میں خچر پر سے اتر پڑا اور اس راستے پر کچھ دور تک بڑھتا چلا گیا، لیکن اندر ایسا

گھپ اندھیرا تھا کہ کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ ناچار میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کسی سے بیان نہیں کیا کہ مبادا دوسرے لوگ پیش قدمی کر کے مجھ سے پہلے وہاں جا پہنچیں۔

اور اس رات جب ساری بستی سو گئی اور ہر طرف سنّاٹا چھا گیا تو میں پھر سوار ہوا۔ اس بار میرے ساتھ ایک پھاوڑا اور روشنی کا مناسب سامان بھی تھا، اور وہ رات میں نے مقبرے میں گذاری۔

میرا خیال ہے یہ شاہی نسل کے کسی فرد کا مقبرہ تھا۔ اس کے اندر کئی حجرے تھے جن کی دیواروں پر عجیب و غریب نقوش بنے ہوئے تھے۔ یہ حجرے داخلے کے ایوان کے اردگرد بنائے گئے تھے، اور اسی ایوان سے خوبصورت اور کشادہ کیے ہوئے زینے نیچے اترتے تھے۔ یہ زینے ریت سے اٹے ہوئے تھے اور کہیں کہیں پر ٹوٹے ہوئے ٹیلے کا ملبہ بھی حائل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا دفینہ کبھی نہ دیکھا تھا، پیالے، قابیں، گھنٹیاں، مورتیاں، سب کھرے سونے کی، اور ان کے علاوہ مرصّع زیورات بھی تھے۔

اس خزانے کا بڑا حصہ میں نے اسی رات ایک دوسری جگہ لے جا کر دفن کر دیا، اور اس جگہ کی شناخت کے لیے ایک ایسا نشان بنا دیا جس پر میرے سوا اور کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد کئی راتوں تک میں باقی خزانہ بھی وہیں منتقل کرتا رہا۔ اور اس کام میں میری مدد کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے کہ میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو میں نے دو اونٹوں پر سارا خزانہ بار کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ کر دیا کہ دیکھنے میں اونٹوں پر لدا چارا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں خوف کے عالم میں سفر کر رہا تھا۔ میرا خنجر ہمہ وقت میرے ہاتھ میں تیار تھا اور میں اونٹوں کو ایڑ پر ایڑ لگا رہا تھا۔

بہرحال نوشتہ یہی تھا کہ میں سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔ جوہریوں کی کوٹھی میں میرا پُرزور خیرمقدم ہوا، اور اس طرح میں نے اپنا خزانہ فروخت کیا۔

تو یوں ہوا کہ روپہلا بیج حاصل کرنے اور اپنی محبوبہ کا دل جیتنے کے لیے میں نے جو کچھ گنوایا تھا، وہ سب میرے پاس واپس آ گیا، اور شروع شروع میں میں اس بات سے بہت خوش تھا۔

مگر میری آنکھیں کھلیں اور میں نے بڑے کرب کے ساتھ محسوس کیا کہ مجھ پر کیا سانحہ گذر گیا ہے۔ یہ کہ میں نے بلاجبرواکراہ اپنی خوشی سے ایک قربانی پیش کی تھی، یہ قربانی قبول نہیں کی گئی، اور یہ کہ جو کچھ میں نے کھویا تھا وہ سب کچھ میرے ہاتھ پر واپس رکھا ہوا تھا، پھر اب میں کسی صلے کی کیا توقع کر سکتا تھا؟

"کوئی شک نہیں،" میں نے کہا، "کہ بھونچال بوڑھے راوی کو کھا گیا، کیونکہ اُس رات

Scanned with CamScanner

وہ سفر میں تھا۔ اب یا تو وہ اُلٹی ہوئی چٹانوں تلے دبا پڑا ہے یا دریا کی تہہ میں بیٹھ چکا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ میری آرام جاں مجھ سے چھین لی گئی۔"

لیکن اُسی رات ایک شخص سے میری گفتگو ہوئی جو زلزلے کے دوسرے دن بستی کی طرف آتے میں سیاہ مرد سے ملا تھا۔ تو یوں ہے کہ جو دروازہ دائماً مقفل رہتا ہے، ہم اس پر فضول ہی اپنی کنجیاں آزماتے رہتے ہیں۔ جو لکھ دیا گیا وہ لکھ دیا گیا، اور جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ پھر اس کے بعد سے میں نے اپنی شادکامی یا حرماں نصیبی کے متعلق کسی پیش قیاسی کی جرأت نہیں کی۔ میں نے ہاتھ باندھ لیے اور انتظار کرنے لگا۔

ایک شام پھر میری محبوبہ نے مجھ سے کہا،

"بستی میں تمہاری بابت یوں باتیں کی جا رہی ہیں۔" وہ بولی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تم نے بہت سا مال بیچ ڈالا اور اب بہت سا مال خرید رہے ہو۔ اور اس لین دین میں تم نے نفع کمایا ہے۔ یہ بےوقوفوں کی خیالی اُڑان ہے۔ ان کے پاس راز کی کنجی نہیں ہے؛ کنجی میرے پاس ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تمہاری ساری رقم کالا بوڑھا لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے یہ وہم ستانے لگا تھا کہ شاید میرا باپ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دینے پر راضی نہ ہو جو قلاش ہو چکا ہے۔ تو پھر اب تم اتنا سامان کہاں سے خرید رہے ہو؟ یا تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اور بڈھا اپنے ساتھ کوئی دولت نہیں لے گیا، یا تم نے کوئی جادو کیا ہے۔ اگر پہلی بات سچ ہے تو بڈھا تمہیں روپہلا بیج نہیں بھیجے گا، اس لیے کہ وہ کم داموں میں زیادہ کام کرنے والا آدمی نہیں ہے؛ تو پھر میرا تمہارا ساتھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر دوسری بات سچ ہے تو مجھے بھی بتاؤ کہ وہ جادو کس طرح کیا جاتا ہے تاکہ میں اپنے باپ کو خوب آرام پہنچا سکوں، اور اپنے لیے بھی نیا پیرہن اور سونے کا کنگن خرید سکوں۔"

"نہ تو میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے اور نہ میں نے کوئی جادو کیا ہے۔ چونکہ تم نے مجھے اپنا راز بتا دیا تھا، اور ابھی تک جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے تم نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے، اس لیے میں ایک بار پھر تم کو اپنے راز میں شریک کرتا ہوں۔ مقدر کا لکھا یہی تھا کہ مجھے ایک بڑا خزانہ مل جائے اور جو کچھ میں نے راوی پر خرچ کیا تھا وہ سب میرے پاس واپس آ جائے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہ پوچھو۔ البتہ یہ بتاؤ کہ تمہیں نیا پیرہن اور سونے کا کنگن کیوں چاہیے؟"

"میری ایک چچازاد بہن ہے۔ خوب صورت ہے، مگر اتنی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو میں ہوں۔ اب اس کی شادی کا وقت آ گیا ہے۔ نہ مجھے معلوم ہے نہ اسے کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہو گی، لیکن وہ بےعذر لڑکی ہے اور اپنے شوہر کا انتخاب اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ دے گی۔ ظاہر ہے وہ کسی رئیس آدمی کو چنے گا، اور شادی کے موقع پر بڑا جشن منایا جائے گا، جس میں رات بھر گانا اور ناچنا ہو گا۔ میرے نام بھی اس جشن کا بلاوا ضرور آئے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہاں مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ لیکن میرا باپ غریب

آدمی ہے اور اسے کہیں سے کچھ ملتا بھی نہیں۔۔۔"

"اسے نہیں ملتا تو تمہیں ملنا چاہیے۔"

"کیا ملنا چاہیے؟"

"ایک کیسہ جو اناروں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری میں چھپا ہو گا، اور اناروں کی یہ ٹوکری کل سورج نکلتے ہی میں تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گا۔"

"سنو،" اس نے کہا، "تمہارے دل میں میری محبت صحرا کی طرح ہے، اور میرے دل میں تمہاری محبت ریت کے ایک ذرّے کے برابر نہیں۔ پھر بھی تم مجھے یہ تحفہ بھیجو گے؟"

"پھر بھی میں تمہیں یہ تحفہ بھیجوں گا۔"

اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر یہ بات پھیل گئی تو شریسند لوگ اس پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے، لہٰذا اس کو راز رکھنا چاہیے۔ اور وہ خوش تھی، جیسے کوئی بچہ چھوٹا سا کھلونا پا کر خوش ہو جاتا ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا، واقعی وہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہتی تھی، اور اس کے دل میں میری یا کسی بھی شخص کی محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

مگر اس وقت بھی اس کی سرد آنکھوں کی گہرائی میں محبت سوئی ہوئی تھی، جیسے کنڈ کی تہہ میں سنہرے سفنوں والی مچھلی پڑی سویا کرتی ہے، اور اس کے جاگنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔

جو کوئی خوشی میں بسر کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ وقت کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے، اور جس کو کسی وقوع کا انتظار ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ رفتار کس قدر سست ہو جاتی ہے۔ لیکن بہرکیف بوڑھے راوی کی روانگی کو آٹھ مہینے گذر ہی گئے، اور اس کے کہنے کے بموجب آئندہ مہینا ماہِ مراد تھا جس میں مجھ کو شجرالموت کا روپہلا بیج ملنے والا تھا، بشرطیکہ اس کا ملنا میرے مقدر میں ہوتا۔

تو اب پیروں کی ہر چاپ کے ساتھ مجھے اپنے پاس آتے ہوئے قاصد کی آواز سنائی دیتی اور ہر آواز پر مجھے گماں گذرتا کہ کوئی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا ہے۔ میرے خوں کی حدّت بڑھ گئی جیسے تپ چڑھ آئی ہو۔ میری نیند غائب ہو گئی اور میں رات کا بیشتر حصہ اپنے باغ میں چکر کاٹ کاٹ کر گذارنے لگا۔

اس مہینے کی نویں تاریخ تمام رات مجھے دور سے آتی ہوئی طرب و سرود کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس رات میری محبوبہ کی بہن کی شادی تھی۔ یہ اسی کے جشن کی آوازیں تھیں۔ لیکن صبح ہوتے یہ آوازیں موقوف ہو گئیں۔ اور میں باغ میں دیوانہ وار گھومتا رہا، اور جب میں باغ کے باہر دروازے کے نزدیک سے ہو کر گذر رہا تھا تو اچانک میں نے ایک ہلکی سی آہٹ سنی اور کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ لیکن یہ آواز کسی قاصد کی نہ تھی۔ یہ میری محبوبہ کی آواز تھی۔

Scanned with CamScanner

میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلایا۔ وہ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر چلی آئی۔ وہ نیا پیرہن اور طلائی کنگن پہنے ہوئے تھی۔ صبحِ صادق کی پُرکیف دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر حسن کا ایک عجیب سا شعلہ لپک رہا تھا اور اس کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

"تھک گئیں؟"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"ہاں،" میں نے کہا، "شادی کا جشن بڑا طویل تھا۔ ساری رات مجھے گانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ تمہاری آنکھوں ہی سے تکان ظاہر ہو رہی ہے۔" اور میں نے اس کے آرام کرنے کے لیے ایک درخت کے نیچے ریشمی قالین بچھا دیا۔ میں اس کے اس طرح آ جانے پر حیرت زدہ بھی تھا۔

وہ قالین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کا بدن جُھکتا چلا گیا، اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"میں جشن میں نہیں تھی،" اس نے کہا۔ "آہ، مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنا ہیں، اور ان میں کی ایک بات بھی ایسی نہیں جسے تم کبھی معاف کر سکو۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں اسے آخر تک سنو گے۔ اس کے بعد، اس کے بعد مجھ سے جو برتاؤ چاہنا کرنا۔"

اس پر میرا دل بیٹھنے لگا اور مشیّت کا مہیب زمزمہ مجھے اپنے کانوں میں گونجتا محسوس ہوا۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی، تب جا کر میں کہہ سکا، "میں آخر تک سنوں گا۔"

اور اب وہ قالین پر لیٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کے نیچے تکیہ سا بنا لیا، اور اپنی بات یوں شروع کی جیسے کوئی تھکا ہوا بچہ طویل اموختہ دوہراتا ہے،

"کل سویرے،" اس نے کہا، "سورج نکلتے مَیں دریا پر نہانے گئی تھی۔ جب میں کپڑے پہن کر اوپر آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک جواں روپہلے زیوروں سے سجے ہوئے ایک خچّر پر سوار میری طرف چلا آ رہا ہے۔ قریب آ کر وہ خچر پر سے اترا اور دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ اس کی رنگت ہم لوگوں سے زیادہ کالی لیکن بوڑھے راوی سے صاف تھی۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں بھی وہی پیغام نظر آیا جو تمہاری آنکھوں میں اور دوسروں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ میرا طلب گار ہے۔ خوب صورت عورتیں آنکھوں کی اس زبان کو آئےدن پرکھا کرتی ہیں۔ لیکن مجھ پر اس زبان کا کوئی اثر نہ ہوا، اور ایسا لگتا تھا جیسے میری آنکھوں کے آگے کہرا چھایا ہوا ہو۔

"اس نے تمہارا نام لے کر پوچھا کہ تم سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ ہماری ہی زبان بول رہا تھا، لیکن اٹک اٹک کر، جیسے اس نے ابھی حال ہی میں ہماری زبان سیکھی

ہو۔

"میں نے کہا، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گی۔

"اور اس کے بعد؟ اس نے پوچھا، کیوں کہ تم دنیا کی سب سے حسین عورت ہو۔ میری محبت کو تمہارا ہی انتظار تھا۔

"میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اس لیے کہ میری آنکھوں کے آگے کہرا ابھی تک چھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بات بالکل بےدھڑک اور اچانک کہہ دی تھی۔ اس نے ابھی ابھی پہلی بار تو مجھ کو دیکھا تھا۔

"اس کے بعد، میں نے کہا، اس کے بعد جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟

"اس نے مجھ پر سے ایک دم یوں نظریں ہٹا لیں جیسے مجھے دیکھتے ہوئے ڈر رہا ہو۔

"مجھے ممانعت ہے، اس نے کہا، اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا منع ہے۔

"اور تم یقیں کرو یا نہ کرو، مگر اب جو بات میں نے اس سے کہی، وہ صرف اس کو تھوڑا سا چڑھانے کے لیے کہی تھی۔ میں نے کہا نا کہ کہرا ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اسی لیے میں کچھ سوچ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"کیا خوب، میں نے ہنستے ہوئے کہا، تم مجھ سے محبت کا دعوا کرتے ہو اور پہلی بات جو میں تم سے پوچھ رہی ہوں اسی کو بتانے سے انکار کر رہے ہو!

"اور اب اس نے پھر مجھے دیر تک نظر بھر کر دیکھا۔ وہ ہلکے ہلکے ہانپ رہا تھا، پھر اچانک اس نے اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز باہر نکالی جو چمک رہی تھی۔

"اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے، وہ بولا، تو لو دیکھ لو، میں اسے یہ دینے کے لیے آیا ہوں۔

"اور اب وہ میرے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گولا تھا، جو چاندی کا نہ تھا لیکن اس کا رنگ چاندی کا سا تھا، اور اس گولے میں زندگی تھی اور موت تھی۔ یہ تو اس وقت سے لکھا ہوا تھا جب اوپر آسمان پر ستارے نہیں جڑے گئے تھے اور نیچے زمین نہیں بچھائی گئی تھی۔ کہرا میری آنکھوں کے آگے سے ہٹ گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ کسی کا حسن اُس کے حسن کی برابری نہیں کر سکتا۔ اور جب جب وہ بولا تو اس کی آواز مجھے ہر آواز سے میٹھی معلوم ہوئی۔ اور اب محبت کی وہ آگ مجھ کو پھونکے ڈالتی تھی جو اس سے پہلے کبھی مجھے محسوس بھی نہ ہوئی تھی۔

"دیکھ، وہ چلّایا، میں نے حلفِ کبیر توڑ دیا، اور اس کی سزا میں عنقریب موت آ دبوچے گی۔ میری زندگی کی گھڑیاں گِنی چُنی رہ گئی ہیں، لیکن اگر یہ گھڑیاں محبت کی گھڑیاں ہی جائیں تو جاں کے مول بھی سستی پڑیں گی۔ سن، مجھ کو تجھی سے تو محبت ہے، میں تیرا ہی تو پرستار ہوں۔

"میرا سر جھک گیا، اور میری آنکھوں میں نشہ چھا گیا، اور میں اس کے سامنے دوزانو

Scanned with CamScanner

ہو گئی۔ میرے دل کے مالک، میں نے کہا، میری زندگی کے مالک۔۔۔"

اور اب وہ قالین پر اوندھی ہو کر اتنا روئی کہ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔

کچھ دیر تک میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر میں نے کہا،

"تمھیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں؟"

"نہیں نہیں،" وہ چلائی، "نہیں نہیں۔"

"تو بولتی رہو،" میں نے کہا، "اور مہربانی کر کے جلدی کہہ چکو۔"

اب وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اور اس کے بعد کی ساری گفتگو اس نے کھڑے ہی کھڑے کی، البتہ اس نے سہارے کے لیے درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی تھی۔

"وہ صحرا کے راستے سے آیا تھا اور پچھلی رات ایک بڑے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہاں اسے ایک پرانا مقبرہ نظر آیا، تو رات اس نے مقبرے ہی میں بسر کی۔ اس نے اپنا سارا اسباب وہیں چھوڑ دیا تھا اور خود سفید خچر پر سوار ہو کر تمھاری تلاش میں نکلا تھا تاکہ اپنا فرض ادا کر سکے۔

"لیکن اب اس کے دل میں اپنے فرض کا خیال بھی کم تھا اور چونکہ بستی کے لوگ ابھی سے ہوشیار ہو گئے تھے، اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ اسی ٹیلے والے مقبرے میں لے گیا۔ میں خچر پر سوار تھی اور وہ میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور کچھ دیر بعد مقبرے کی ٹھنڈی اور دھندلی روشنی میں ہم تھے اور ہماری محبت۔

"اب جب شام ہونے لگی تو میں ڈری کہ کہیں میرے باپ نے میری تلاش میں ہر طرف آدمی نہ دوڑا دیے ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس مقبرے میں اپنے عاشق کے ساتھ دیکھ لی جاؤں۔ تو میں اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئی اور جب میرے باپ نے اتنی دیر تک گھر سے غائب رہنے کا سبب پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں بہن کی شادی کے انتظاموں میں لگی ہوئی تھی۔ اور پھر میں نے یہ کیا کہ نیا پیرہن اور سونے کا کنگن پہن لیا اور اس سے کہا کہ اب میں شادی میں جا رہی ہوں۔ اسے اطمینان ہو گیا اور وہ پڑ کر سو رہا، اس لیے کہ وہ بوڑھا اور کمزور ہے اور رات رات بھر جشن میں شریک رہنے کے قابل نہیں ہے۔

"اور پھر میں لپکتی ہوئی واپس اپنے محبوب کے پاس پہنچی۔ مجھے معلوم تھا نا کہ ہمارے پاس محبت کی بس چند گھڑیاں ہیں، اور یہ کہ ہماری محبت ایسی ہے کہ اگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم ساتھ ساتھ رہیں تو بھی محبت سے ہمارا دل نہ بھرے گا۔ ابھی کچھ پہلے تک میں اسی کے پاس تھی۔ لیکن اب تم سے ملنا ضرور تھا، اور میں تمھارے باغ کے جالی دار دروازے کے پاس آئی، اور تمھارے قدموں کی آواز سن کر میں نے تمھیں پکارا۔ اور اب مجھے وہ بات کہنا ہے جس کے لیے میں تمھارے پاس آئی ہوں۔"

اور یہاں پر رک کر اس نے لجاجت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا،

"تمھاری آنکھوں میں نہ غصہ نظر آ رہا ہے، نہ رحم۔ تمھاری آنکھیں پتھر کے بتوں کی آنکھیں ہو گئی ہیں، کہ نہ جھپکتی ہیں نہ دیکھتی ہیں۔ مگر میری پوری بات سن لینا۔ اس نے حلفِ کبیر کو توڑا ہے، اور اسے اس کی سزا مل کر رہے گی۔ کوئی اس تک آ پہنچے گا۔ اسے معلوم نہیں کب، لیکن بہت جلد یہ آنے والا اس سے کہے گا، لا مجھے ان موتیوں کی جوڑی دکھا جو ہر طرح ایک سے ہیں، کہ یہی ثبوت ہے اس کا کہ تو نے اپنی سوگند پوری کر دی، اور اگر اس کے پاس موتیوں کی جوڑی نہ نکلی تو وہیں اور اُسی وقت اسے قتل کر دیا جائے گا، اور اس کے بعد جہاں سے وہ آیا ہے وہاں اس کی ماں کو بھی قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ حلفِ کبیر میں وہی اس کی ضامن تھی۔ اور جب وہ مار ڈالا جائے گا تو کیا میں زندہ رہ سکوں گی؟

"اس کے پاس جوڑی میں کا صرف ایک موتی ہے، دوسرا تمھارے پاس ہے۔ تو اس طرح اب تمھارے اختیار میں تین جانیں ہیں۔

"تم سمجھ سکتے ہو کہ میں نے اپنے بھولے‌پن میں اس کو قسم توڑنے پر اکسایا، اور مجھے پتا بھی نہ تھا کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔ اور پھر تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ تمھارا جھگڑا مشیّت سے ہے، ان ننّھی ننّھی فاختاؤں سے نہیں جن کو مشیّت کی ہوا نے اڑا کر ایک جگہ پہنچا دیا ہے۔ اگر تم یہی خیال کر کے مجھے وہ دوسرا موتی دے دو اور اس کے ساتھ اس کے وطن چلا جانے دو، تو یہ تمھارا اتنا بڑا احسان ہو گا کہ اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہ مل سکیں گے۔

"لیکن شاید میں تم سے جو کچھ مانگ رہی ہوں، وہ اتنا زیادہ ہے کہ کوئی دے نہیں سکتا۔ تب، اگر تمھیں اب بھی میری ضرورت ہو تو میں یہیں رہ جاؤں گی، اور تم چاہے مجھے اپنی بیوی بناؤ چاہے کنیز، میں ہمیشہ تمھاری فرمانبردار اور وفادار رہوں گی۔ اس کے لیے میں تم سے اس کے سوا اور کچھ نہیں مانگتی کہ فوراً کسی آدمی کو دوڑا کر میرے محبوب کے پاس دوسرا موتی بھجوا دو تاکہ وہ خیریت کے ساتھ واپس جا سکے۔ اور میں اب اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ میرے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو، لیکن اس کا خون میری گردن پر نہ آنے دو۔ غلطی تو میری ہی تھی، اور پھر ایک طرح سے اس نے اپنی سوگند پوری بھی کر دی ہے، اس لیے کہ اس نے میرے ہاتھ تمھارے پاس شجرالموت کا بیج بھجوایا ہے۔ بتاؤ، اب تمھارا جواب کیا ہے؟"

سچ یہ ہے کہ اس وقت تک مجھے خود بھی پتا نہ تھا کہ میرا جواب کیا ہو گا۔ لیکن اپنی بات ختم کرتے کرتے اس نے اپنے پیرہن کے اندر سے وہ دمکتا ہوا روپہلا گولا نکال کر میری طرف بڑھا دیا، اور میں نے اسے ہاتھ میں تھام لیا، اور یہ گولا اس کے نازنیں بدن کی حرارت سے اب تک گرم تھا۔

ایک لمحے کے اندر میں نے اپنا خنجر اس کے جسم میں قبضے تک اتار دیا۔ وہ میرے

Scanned with CamScanner

پیروں کے پاس گری، ایک بار سر سے پاؤں تک تھرتھرائی، اور ختم ہو گئی۔

اب میں پھر بالکل پُرسکون تھا۔ میرا دماغ پانی کی طرح صاف تھا۔ میرا دل اعتدال اور خاموشی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے اپنے باغ کے ایک گوشے میں اس کے لیے ایک گہری قبر کھودی۔ پھر میں نے اس کے جسم سے خنجر کھینچ کر نکال لیا۔ میں نے اس کی لاش کو ریشمی قالین میں لپیٹ دیا اور اس طرح میں نے اس کو زمین میں دفن کر دیا۔ میں نے روپہلے بیج کو بھی اسی کے ساتھ دفن کر دیا۔

میں نے اوپر سے مٹی ہموار کر دی اور اپنا خنجر صاف کر لیا۔ اور آخر یہ سارا انتظام اتنا مکمل ہو گیا کہ باغ بالکل ویسا ہی نظر آنے لگا جیسا گذشتہ صبح نظر آ رہا تھا۔ اور وہاں جو کچھ ہوا تھا اس کا کوئی سراغ باقی نہ رہا اور نہ کسی آنکھ نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔

اور تب میں سوار ہو کر اسی مقبرے کی طرف روانہ ہوا جو میں نے بڑے ٹیلے کے نیچے دریافت کیا تھا، اور جہاں عورت کا عاشق بھی پہنچ گیا تھا۔ لیکن، جیسا کہ مجھے اندیشہ بھی تھا، مجھ کو مقبرے تک پہنچنے میں دیر ہو گئی، اس لیے کہ میرا کام میری جانب سے انجام دیا جا چکا تھا۔

وہ مقبرے کے دروازے پر مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کے گلے میں ایک چُھرا پیوست تھا۔ اس کے خنجر کے چارے کا گٹھا کھل کر بستر کی طرح پھیل گیا تھا۔ اس کے برابر ہی پانی کا ایک مشکیزہ اور پیتل کا ایک پیالا پڑا تھا۔ لیکن روپہلے زیورات سے آراستہ سفید خچر کا اب وہاں کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ جس شخص نے قاصد کو قتل کیا ہے، وہی خچر کو لے گیا ہو گا۔ لیکن جوڑی کا دوسرا موتی قاتل اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا، کیونکہ وہ موتی اب بھی لاش کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے یوں ہی رہنے دیا۔ میں نے لاش کو بھی کرگسوں اور گیدڑوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جس وقت وہ اپنے دورافتادہ ملک سے چلا تھا، اسی وقت ایک اور شخص بھی یہ دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا تھا کہ وہ اپنی سوگند پوری کرتا ہے یا نہیں، اور اس نامعلوم شخص کو یہ اختیار حاصل تھا کہ سوگند توڑنے کی صورت میں قاصد کو قتل کر دے۔

اور اس کے بعد میں گھر واپس پہنچا اور اپنی آخری نیند کا بندوبست کر کے بستر پر لیٹ رہا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی نیند موت میں ضم ہو جائے گی، لیکن جو زہر میں نے استعمال کیا تھا وہ مجھے مار نہ سکا۔ نیند البتہ مجھے آ گئی لیکن دوسرے دن عصر کے وقت میں پھر بیدار ہو گیا۔ اور اسی نیند میں مجھے یہ مکاشفہ ہوا کہ مجھے ابھی اور اس طرح موت نہ آئے گی۔ ابھی مجھے دو برس انتظار کرنا تھا، تاوقتیکہ روپہلا بیج وہاں، جہاں میں نے اسے دفن کیا تھا، شجرالموت میں زندہ ہو کر آنکھ نہ کھول دے۔

بستی میں یہ خبریں گشت کر رہی تھیں کہ میری محبوبہ ایک غیر نسل کے آدمی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ وہ دونوں ساتھ دیکھے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ دریا اسے نگل گیا، کیونکہ وہ دریا میں نہانے کی عادی تھی۔ غرض کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا، لیکن جو ہوا تھا وہ کوئی نہ بتا سکا، نہ کسی نے مجھے مجرم سمجھا۔

اور جوں جوں دن گذرتے گئے، مجھ میں عجیب عجیب تغیّر پیدا ہوتے گئے۔ اب کسی عورت کا حسن مجھے متاثر نہیں کرتا تھا، کوئی تمنا میرے دل کو اپنی طرف کھینچتی نہ تھی۔ اگر کنج سلیماں بھی میری دست رس میں ہوتا تو میں اسے ہاتھ نہ لگاتا۔ اب تنہا رہنے کی خواہش کے سوا مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔ اب میرے گھر میں کوئی مہماں نہ آتا تھا، کوئی نغمہ کوئی قہقہہ نہ بکھرتا تھا۔ رات کی طویل خوش گوار نیند مجھ سے منہ موڑ چکی تھی۔ میں ہمیشہ ناوقت کٹی کٹی نیند سوتا تھا۔ اور سوتے میں ایسے ایسے خوابوں کے اسیب مجھے آ گھیرتے کہ جاگنے کے بعد بھی میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ جاگ گیا ہوں یا ہنوز خواب میں ہوں۔ اب میں وہم کو حقیقت سے اور سائے کو پیکر سے الگ نہیں دیکھ پاتا تھا۔

سوتے جاگتے ہر وقت اُس کا تصور مجھ پر مسلّط رہتا جس سے میں نے محبت کی تھی۔ میں اس کو موت کی وادی سے بلا کر یہ بتانے کے لیے تڑپ رہا تھا کہ کس طرح میں اسے قریب قریب معاف کر چکا تھا، اور کس طرح آخر میں ایک چھوٹی سی چیز نے مجھے جنوں میں مبتلا کر دیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر تلملاتا تھا کہ اسے یہ سب کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ اب میرے دل میں اس کے خلاف کوئی بدگمانی، کوئی عداوت نہ تھی۔ واقعی، جیسا کہ اس نے خود اپنے بارے میں کہا تھا، وہ ایک ننھی سی فاختہ تھی جو طوفانِ مشیّت کے ریلے میں آ گئی۔

انتظار کا ایک سال پورا ہونے کے بعد کبھی کبھی، جب میں خُنک شام کے دھندلکے میں اپنے باغ میں گھومتا ہوتا، تو وہ مجھے دکھائی دیتی۔ وہ اچانک ظاہر ہوتی اور ہوا میں دھویں کی طرح تحلیل ہو جاتی۔ اور جوں جوں دوسرا سال آگے بڑھتا گیا، اس کا ہیولا زیادہ جلدی جلدی نمودار ہونے لگا، اور اب وہ ہیولا زیادہ دیر تک قائم رہتا، بلکہ اب تو میں اس کی آواز بھی سن لیتا تھا۔ وہ نارنج کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوتی، اور پیرہن ہٹا کر اپنے سینے کا زخم دکھاتی۔

"تم نے میرے اوپر وار کیا،" وہ کہتی، "تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے، پھر تم نے کس دل سے مجھ پر وار کیا؟"

اور آخرکار... آخر کار وہ دن آ گیا جب شجرالموت کو پودا ہونا اور دو قدآدم کے برابر پہنچنا تھا، جب شجرالموت کو میرا خون چُوسنا اور پھر خود بھی مر جانا تھا۔ اور یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان ہونا تھا۔

Scanned with CamScanner

ابھی سورج پوری طرح نکلا نہ تھا کہ میں نے اس کی قبر کے اوپر کی مٹی کا غور سے جائزہ لیا۔ باغ کے اس حصے میں میرے سوا کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی، اور میں خود اپنے ہاتھ سے اس حصے کو خس و خاشاک سے صاف رکھتا تھا۔ اور اب میں نے دیکھا کہ قبر کے اوپر زمین میں بہت سے رخنے پڑ گئے ہیں۔ ان کی شکل ایسی تھی جیسی سورج کی کرنوں کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ اور ان رخنوں کے بیچوں بیچ میں کوئی سخت سی چیز اُبھر رہی تھی۔ یہ چیز اوپر سے مدوّر تھی اور اس کا رنگ قرمزی اور کاہی ملاجلا تھا۔ اور اس کی سطح پر رطوبت کے ننھے ننھے قطرے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین پھاڑ کر باہر نکلنے کی جدوجہد میں اسے پسینا آ گیا ہو۔

تب میں اس اُجڑے ہوئے چمن سے نکل کر اپنے سنسان مکان میں واپس چلا گیا، کیونکہ ایک دن پہلے میں اپنے تمام ملازموں کو رخصت کر چکا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور سفید پیرہن پہن لیا۔ میں نے گھر کے سارے دروازے مضبوطی کے ساتھ بند کیے اور پھر واپس شجرالموت کے پاس پہنچا۔ اب وہ میرے گھٹنوں تک آ گیا تھا، اور ابھی اس کی شکل ایک کھُردرے مخروطی ڈنٹھل کی سی تھی۔ وہ عمودی شکل میں اوپر پتلا ہوتا چلا جا رہا تھا، اور اس میں سے ہلکے ہلکے ابخرات اٹھ رہے تھے۔ میں وہیں پر بیٹھ گیا اور اس عجوبے کو دیکھتا رہا۔

جب وہ ایک قدآدم کے برابر ہو گیا تو اس میں سے کئی تنے پھوٹ کر الگ ہو گئے، اور یہ سب جڑ کے پاس مرکزی تنے میں جُڑے ہوئے تھے۔ یہ نئے تنے باہر کی طرف ڈھلک گئے، اور ان کا بڑھنا موقوف ہو گیا، لیکن ان میں سے سانپوں کی طرح فضا میں لہریں لیتی ہوئی جٹائیں جھنڈ کی جھنڈ نیچے اترنا شروع ہوئیں۔ ان جٹاؤں پر تشنّج طاری تھا، اور بغور نظر کرنے پر میں نے دیکھا کہ یہ جٹائیں چھوٹے چھوٹے دہانوں سے لپی ہوئی ہیں اور یہ دہانے مسلسل کھل رہے ہیں اور بند ہو رہے ہیں۔ لیکن مرکزی تنا اب بھی عمودی شکل میں اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے سرے پر ایک عجب طرح کا گچھا سا تھا، جو تنے کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ یہ گچھا بڑا ہوتا جا رہا تھا، اور میں سمجھ گیا کہ اسی میں سے شجرالموت کا پھول برآمد ہو گا۔

یہ ظہر کا وقت تھا۔ میں درخت سے ذرا ہٹ گیا اور نظریں گاڑے اسے دیکھتا رہا۔ بغلی تنوں میں سے جٹائیں مستقل امڈ کر نیچے اترتی چلی آ رہی تھیں۔ اور یہ جٹائیں زمین پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ جہاں پر میں نے اسے دفن کیا تھا وہاں اب کاہی اور قرمزی رنگ کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔

ظہر کے کچھ دیر بعد تنے کے سرے پر کا بڑا گچھا تین بیضوں کی شکل میں بٹ گیا۔ ان بیضوں پر شفاف باریک ریشم کی سی جھلّی منڈھی ہوئی تھی۔ اور اس جھلّی پر نسیں ابھری ہوئی تھیں جو انسانی رگوں سے مشابہ تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ نسیں پھولتی چلی

جا رہی ہیں، اور ایسا لگتا تھا کہ کوئی سفید سفید چیز ان نسوں کے اندر سے زور مار رہی ہے۔ اور تنے کا سرا ہلکے ہلکے داہنے بائیں یوں جنبش کر رہا تھا جیسے اذیّت میں مبتلا ہو۔

ابھی تک یہ سب کچھ کامل خاموشی کے ساتھ ہو رہا تھا، لیکن اب اچانک ان میں سے ایک بیضے کی جھلّی اس سرے سے اُس سرے تک چاک ہوتی چلی گئی، اور اس کے چاک ہوتے سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کسی عورت پر وار کیا گیا ہو۔ اس بیضے میں سے اچھل کر ایک نہایت دلکش سفید پھول برآمد ہوا۔ اتنا بڑا پھول میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اس پھول میں سے روپہلے رنگ کے غبار کا ایک بادل سا کرا اور دھوپ میں چمکنے لگا۔ اور اس غبار میں سے ایک خوشبو پھیلی، اور خوشبو، جہاں پر میں کھڑا تھا، وہاں پر بھی اتنی تیز تھی کہ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

تب میں نے بلند آواز سے وہ کہا جو میرے دل میں تھا،

"شجر الموت،" میں چیخا، "تیری جڑوں نے میرے سرمایہ محبت کو جذب کر کے اپنے وجود کا جز بنا لیا ہے۔ لے مجھے بھی لے، کہ انجام کار ہم ایک ہو جائیں، کہ زندگی کی مکروہ اذیّتوں کے بعد انجام کار سکوں کی نوبت آئے۔ شجرالموت، شجر المحبت، میں تیرے پاس آ رہا ہوں۔"

اور میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اور درخت کے پاس پہنچ کر میں جھکا، اور میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ اور دو مرتبہ پھر میں نے مضروب عورت کی سی آواز سنی۔ یہ شجر لموت کا دوسرا اور تیسرا پھول کھلا تھا۔

روپہلے غبار کے بادل نے میری آنکھوں میں گھس کر مجھے اندھا کر دیا اور بوجھل خوشبو میرا دم گھونٹنے لگی۔ میں ان کپکپاتی ہوئی جٹاؤں پر گر پڑا، جن کے بےشمار دہانے میرا لہو ڈھونڈھ رہے تھے، اور مجھے آخر نیند آ گئی۔

Scanned with CamScanner

قنوطینیا کا زوال

آج سے کئی ہزار سال پہلے کا ذکر ہے کہ ہمارے ملک کی طرح بہت سے چھوٹے، چند بڑے اور کچھ بہت بڑے ممالک کے بیچ میں گھرا ہوا ایک بہت عجیب وغریب ملک آباد تھا۔ اس ملک کا نام قنوطینیا تھا۔ وہاں کے رہنے والے اچھے بھلے لوگ تھے۔ وہ لوگ نہ قنوطی تھے اور نہ اپنے آپ کو قنوطی کہلوانا پسند کرتے تھے، بلکہ خود کو ہمیشہ قنوطینی کہتے اور کہلواتے تھے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی، یعنی وہ تمام ملک جن کے سفارتی تعلقات قنوطینیا سے قائم تھے یا نہیں تھے، ان کو عام بول چال میں آسانی اور تعلقات میں روانی کی وجہ سے قنوطینی ہی کہتے تھے۔ "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" کے مطابق پاس پڑوس کے سارے ملکوں کے لوگ قنوطینی عوام کے مثالی دوست یا بدترین دشمن تھے۔ قنوطینی حکمراں بھی سارے جان پہچان کے ممالک کے فرمانرواؤں کو موقعے اور مرتبے کے لحاظ سے "میرے عزیز دوست" یا "ہمارے ازلی دشمن" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ قنوطینی حاکم اپنی روزمرہ تقاریر، خفیہ مراسلوں اور سرکاری احکامات میں ایسے الفاظ اور تراکیب عام طور پر استعمال کرتے تھے جن کے کئی کئی معانی ایک ساتھ نکالے جا سکیں۔ یہ مشکل باتیں ہیں، شاید سمجھ میں نہ آئیں؛ ہمیں تو آپ کو قنوطینیا کے بارے میں کچھ آسان باتیں بتانی ہیں، لیکن ابتدائی معلومات کے حاصل کرنے میں کیا برائی ہے۔ کسی بھی ملک کو جاننے اور اچھی طرح پہچاننے کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کی تاریخ سے (اگر کوئی ہو) واقفیت حاصل کی جائے اور اس کے جغرافیے کو (چاہے وہ کیسا بھی رہ چکا ہو) پوری طرح سمجھا جائے، اور فی الحال ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔

"انسائیکلوپیڈیا قنوطینیک" (آخری ایڈیشن) کے مطابق قنوطینیا اب سے کئی ہزار سال پہلے بھی ایک آزاد جمہوری مملکت تھا اور قنوطینی خود کو آزادی اور جمہوریت کی دولت سے مالامال تصور کرتے تھے، لیکن حکمراں آزادی کے خیال ہی کو ہر برائی کی جڑ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہر نیا حکمراں اپنے حساب سے اس جڑ کو کاٹنے اور کھوکھلا کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک آخری قنوطینی حکمراں کے سر پر زوال کے سائے نہ منڈلانے لگے۔ خیر یہ سب بعد میں، پہلے قنوطینیا کے بارے میں کچھ اہم باتیں۔

قنوطینی عوام بہت ہی بھولے‌بھالے، ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ ان کے جمہوری اور خوشحال ہونے پر اب تک سب کو شبہ ہے، اس لیے ہم بھی یقین سے‌کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسری زبان بولتے تھے، اس لیے قنوطینی زبان پوری طرح پروان نہ چڑھ سکی اور آج ناپید ہے۔ قنوطینی لوگوں کے رسم ورواج بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئے۔ اس کی بہت معمولی مثال ان کا کھانا پینا تھا۔ قنوطینی کبھی بیٹھ کے، کبھی کھڑے ہو کے اور اکثر لیٹ کے کھانا کھاتے تھے۔ لباس اور روزمرہ کی نشست و برخواست میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ہر شام سبز رنگ کا نیا لباس پہننے کی جدّت کے علاوہ آنے والے موسم میں گزرے ہوئے موسم کا لباس پہنے رہنا ان کا خاصہ تھا۔ کسی اجنبی یا دوست سے ملنے پر زانو پیٹنا، سر پر دن رات سرخ رومال باندھے رہنا اور ہمیشہ دوڑتے ہوئے اپنے اور دوسروں کے گھر میں داخل ہونا وہ خصوصیات ہیں جو اب ڈھونڈے سے بھی قوموں میں نہیں ملتیں۔ قنوطینی خواتین اور جانوروں میں مساوات کے قائل نہ تھے اور جانوروں کو گھر کی حدود سے باہر رکھنا پسند کرتے تھے۔ آج کے بچے کس قدر ذہین ہیں، پڑھتے لکھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، ہنستے کھیلتے ہیں۔ قنوطینی بچے ایسے نہ تھے۔ وہ تو بس ہر وقت ہر بات میں اپنے ماں باپ کی نقل کرتے رہتے تھے۔

قنوطینیا میں ایک سمندر بھی تھا جس کے کنارے پر تین یا چار تفریح گاہیں، ایک بڑی بندرگاہ اور کچھ ملکی فوجی اڈے تھے۔ دراصل یہ فوجی اڈے نہیں تھے۔ قنوطینی حکمرانوں کے پاس امدادی سامان رکھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی، اس لیے سمندر کے ساتھ ساتھ یہ سامان حفاظت سے رکھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اپنے عجیب وغریب جغرافیے کے باعث قنوطینی عوام اور حکمراں اکثر الجھن میں گرفتار رہتے تھے۔ خشکی کی جانب سے قنوطینیا کی ہر سمت میں کئی ملک تھے، اور کسی کسی سمت میں تو لاتعداد ملک اور براعظم آباد تھے۔ جس کے باعث قنوطینیا کی سالمیت بیشتر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ کسی ممکنہ بیرونی مداخلت کے اس مستقل خطرے کے پیشِ نظر قنوطینی حکمرانوں نے اکثر قیمتی سازوسامان، امدادی اسلحہ اور اہم دستاویزات سمندر کے کنارے رکھ چھوڑی تھیں، کیونکہ ان کے‌خیال میں یہی حصہ ہر طرف سے محفوظ تھا۔ ایک زمانے میں قنوطینیا کی سرحدیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، مگر عوام اور حکمرانوں نے حفاظتی نقطۂ نظر سے ان میں خاطرخواہ کمی کر لی۔

یہ بات بھی "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں بار بار زور دے کر کہی گئی ہے کہ ایسے ملک صدیوں میں وجود میں آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ قنوطینیا کا خاص فلاحی نظام تھا۔ اس نظام کی زرّیں اصول غریب کو امیر اور امیر کو غریب تصور کرنا اور کرتے رہنا تھا۔ غریب لوگوں کو امیر تصور کرنے سے عام آدمی کی سماجی حیثیت کے تعیّن اور نظریاتی سوجھ بوجھ میں بےحد مدد ملی اور معاشرتی زندگی کا معیار بلند سے بلندتر ہوتا چلا گیا۔

Scanned with CamScanner

دوسری جانب امیر کو غریب سمجھنے سے حکومت اور اراکینِ حکومت مالی اور سیاسی استحکام سے ہمکنار ہوئے۔ صنعت و تجارت میں امداد کے لیے حکومت نے امیر لوگوں کو بھاری مالیت کے ناقابلِ واپسی قرضے جاری کیے اور ناگزیر حالتوں میں دونوں فریقین میں باہمی لین دین کو رواج دیا گیا۔ ان انقلابی اقدامات سے قنوطینیا آناًفاناً اقتصادی طور پر خودکفیل ہو گیا۔ لوگوں کی زندگی میں نمایاں تبدیلی آنے سے ہر کسی کو سیاسی جماعتیں (مسلح یا غیرمسلح) بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ سیاست میں فروغ کے نتیجے کے طور پر ہر پارٹی میں کئی کئی خاندانوں کے افراد شامل ہو گئے، بلکہ زیادہ باشعور لوگ بیک وقت یا وقتاًفوقتاً کئی جماعتوں کے رکن بنے اور عزت شہرت دولت حاصل کر کے جمہوری عمل کے پاسدار ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد سیاسی جماعتوں میں مساوات قائم رکھنے کے لیے سرکاری طور پر ہر جماعت کو یکساں مسلح کر دیا گیا۔ یہ اقدام ہر سطح پر اچھی نظر سے دیکھا گیا اور ہر مسئلے پر لاحاصل اور طولانی بحث سے نجات کے آثار نظر آنے لگے۔ ہر سیاسی جماعت کے نظریاتی استدلال میں پختگی اور پائیداری کا اندازہ اس کے مسلح اراکین اور حمایتیوں کی تعداد سے لگایا جانے لگا، لیکن (شاید آتشیں اسلحہ ایجاد نہ ہونے کی وجہ سے) ہزاروں سال پہلے قائم ہونے والا یہ نظام زیادہ عرصے نہ چل سکا اور عام قنوطینی سو سال ہی میں بور ہو کر اپنے سیاسی رہنماؤں پر چڑھ دوڑے۔ خدا بھلا کرے فوجی سپہ سالاروں اور حکمرانوں کا کہ بیچ میں پڑ کے معاملہ ٹھنڈا کیا اور عوام کے مشورے سے سارے سیاسی رہنماؤں کو دشمن ممالک میں سفیر یا جاسوس بنا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا۔ قنوطینیا کے لوگ اس سو سالہ سیاسی دور کو "سیاہ صدی" کہا کرتے تھے۔ "انسائیکلوپیڈیا قنوطینیک" (آخری ایڈیشن) کے بموجب تمام نامور سیاسی رہنما معزز، تعلیم یافتہ اور اصول پسند شہری تھے۔ قنوطینی عوام کی شدید ناراضگی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ یہ سارے ہی رہنما ملک وقوم کی محبت کا ہمیشہ سرِعام اقرار کرتے رہتے تھے۔ قنوطینی سیاسی رہنما قانون پسند اور زندگی بھر قانون کا احترام کرنے والے بڑے لوگ تھے۔ قانون کی ایک یا دو کتابیں چھوٹے سے چھوٹے سیاسی رہنما کی میز پر ہر وقت نظر آتی تھیں۔ بعض نسبتاً بڑے رہنماؤں کے گھر میں قانون کی کتابوں کی پوری کی پوری لائبریری موجود تھی۔ ملک میں قانون کی کتابوں کی سب سے بڑی اور واحد دکان بھی ایک عظیم سیاسی رہنما کی ملکیت تھی۔ حیف، قنوطینی عوام نے اپنے بیش قدر سیاسی رہنماؤں کی ذرا بھی قدر نہ کی اور ان کو ملک سے نکلوا کے دم لیا۔

قنوطینیا پر ایک ہزار سال میں ایک ہزار سے زائد حکمرانوں، یا یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ خاندانوں نے حکومت کی۔ اصل میں ہر ملک کی طرح وہاں بھی بےشمار اور لاتعداد خاندان آباد تھے اور سب ہی کی خواہش تھی کہ ہمارے خاندان کی بھی جلد حکومت ہو۔ اسی لیے قنوطینیا پر وہیں کے آئین کے مطابق ہر سال ایک نیا خاندان حکومت کرتا تھا۔ اگر

کبھی کبھار کوئی خاندان خنّاق، کالی کھانسی، ہڑتال، مبیّنہ قاتلانہ حملوں یا مالی مشکلات کے باعث حلف اٹھانے سے رہ جاتا تو پھر کسی ایسے خاندان کو حکومت کرنے کی دعوت دی جاتی جس کے باقی ماندہ یا کل افراد کی تعداد سال کے جملہ مہینوں یا ہفتوں کی تعداد کے برابر ہو۔ ایسا کیوں ہوتا تھا، اس کا تعلق قنوطینی آئین کی پیچیدگیوں سے ہے اور ہم ان کے ذکر سے آپ کو بور نہیں کریں گے۔ اور پھر قنوطینیا میں ایک آئین تھوڑا ہی تھا! ہم تو اس آئین کی بات کر رہے ہیں جو سب سے آخر میں آیا اور تاریخ میں دیر تک محفوظ رہا۔ قنوطینیا کی تاریخ میں بہت سے آئین، حکمران، سیلاب، زلزلے، غیرملکی مہمان اور حملے آور آئے اور گئے۔ اسی آخری آئین کے ایک حصے میں بادشاہ اور بڑے وزیر کے تعلق سے بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور اگر اسے مستند سمجھا جائے تو بادشاہ سلامت سے شفا خانۂ حیوانات، کھیتوں سے گودام تک کی سڑک، اور گندے پانی کی نکاسی کے منصوبے کے افتتاح کے علاوہ بھی بہت سے اہم کام کبھی کبھی کرنے کو کہا جائے گا، مثلاً سرکاری کاغذات پر انگوٹھا یا مہر لگانا وغیرہ۔ بڑے وزیر کے لیے خواندہ اور بالغ ہونا لازمی تھا، مگر بادشاہ کے لیے نہیں۔ اس قسم کے آئین سے جب قنوطینی عوام اور حکمران مطمئن تھے تو ہمیں کیا اعتراض ہو گا۔ آئینی پیچیدگی کے باوجود قنوطینیا میں چند خوش قسمت خاندان ایسے بھی تھے جنھوں نے دو سے زائد بار حکومت کر کے سرکاری خزانے سے حسبِ توفیق استفادہ کیا۔ سیکنڈ لاسٹ قنوطینی آئین میں یہ شق شامل تھی کہ کبھی کبھی حکومت کرنے لیے لاٹری ہو گی یا کسی کی ٹوپی میں پرچیاں ڈال کر نام نکالا جائے گا اور اس میں شامل ہونے کے لیے بائیس یا چوالیس نامور خاندانوں کے نام کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیے جائیں گے۔

ہزار سالہ قنوطینی تاریخ زیادہ تر ایک ہی دور پر مشتمل ہے، یعنی افراتفری کا دور۔

قنوطینیا میں، نام کی مناسبت سے، ہر طرف سب سے زیادہ قانون کا دوردورہ تھا۔ ہمیشہ نئے نئے قانون بنائے جاتے اور ان پر عملدرآمد کرانے کی کوشش کی جاتی۔ قنوطینی عدالتوں کی عجیب حالت تھی۔ بارہا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ملزم وکیل کو، گواہ ملزم کو اور جج گواہ کو بات بےبات مختلف قوانین کے حوالے دیتے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی پتا نہ چلتا کہ مقدمہ کس قانون کے تحت چل رہا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ گواہ جج بن گئے، ملزم وکیل بن گئے اور وکیل گواہ بن کے عدالت سے باہر آئے اور آئندہ کہیں نظر ہی نہ آئے۔ ہزار سالہ قنوطینی تاریخ میں شاید ہی کوئی لمحہ ایسا آیا ہو جب عوام کو قانون کی عدم موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ محکمۂ قانون و انصاف کی تیارکردہ تلواریں جگ جگ لوگوں کے سروں پر جھولتی نظر آتیں اور کسی کو ان سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ قانون کی محبت قنوطینی عوام کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ کمسن بچوں کے لیے ترازو اور پھانسی گھاٹ نامی کھلونے سب سے زیادہ خریدے جاتے، اور لوگ اپنے گھر محکمۂ قانون و انصاف، بڑی عدالتوں اور حوالات سے نزدیک تر بنوانے کی کوشش کرتے۔

Scanned with CamScanner

قنوطینی طرزِتعمیر میں بھی اس بات کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے کہ وہاں کے عوام اور خواص قانون سے کس درجہ لگاؤ رکھتے تھے۔ عام لوگوں کے گھروں اور دکانوں کی بناوٹ میں قیدخانوں سے مشابہت کا خاص خیال رکھا جاتا۔ عوامی مکان اور بازار آج کی جدید جیلوں کی مانند اونچی دیواروں اور حفاظتی بُرجوں کے ہالے میں ساتھ ساتھ بنائے جاتے اور پوری کوشش کی جاتی کہ ان آرام دہ اور محفوظ مقامات پر ہوا، روشنی، پانی، خوراک اور ہر ایرے غیرے کا گزر ممکن نہ ہو۔ قنوطینی عوام کے گھروں کی سب سے نمایاں خصوصیت صحن، روشندان اور بعض حالات میں الگ الگ کمروں کا سرے سے نہ ہونا ہے۔ دوسری جانب طبقۂ امراء، حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے گھر (جنھیں محل قرار دینا قرارِواقعی سزا پانے کے باعث متروک تھا) اعلا عدالتوں کی پُرشکوہ اور عظیم الشان عمارات کی شکل کے ہوتے۔ قیمتی معدنیات سے تیارکردہ وسیع زینے، بلندوبالا دیواریں، طویل راہداریاں، آفتابی غسل (ایجاد ہو چکا تھا) کی غرض وغایت سے آراستہ وسیع برامدے، لاتعداد خالی اور سامان سے بھرے ہوئے کمرے ان محلات کی شان وشوکت کا منھ بولتا ثبوت مانے جاتے تھے۔ قنوطینی محلات کی تعمیر اور آرائش و زیبائش میں استعمال ہونے والے سازوسامان میں ملکی اور غیرملکی کی تفریق روا نہیں رکھتے تھے۔ محلات کی شکل وصورت کی اعلا عدالتوں کی عمارات سے مشابہت کا فائدہ حکمرانوں نے خوب اٹھایا اور بیشتر حکمرانوں نے اپنی حکومت کا عرصہ محل میں رہتے ہوئے اپنی قانونی ذمےداریاں پوری کر کے گزارا۔ آج کے تہذیب یافتہ دور میں قنوطینیا کے قانونی مراحل اور سہولیات کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ اگر کہیں ایسا ہو جائے جیسا وہاں تھا تو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پنجے جھاڑ کے پیچھے ہی پڑے رہیں، چین نہ لینے دیں۔

قنوطینی عوام اور حکمرانوں کو آفریں کہ ہزار برس تک باہمی امن وانصاف اور اصول و قانون کی عملی پاسداری کرتے رہے اور کسی نے ایک بار بھی شکایت تک نہ کی۔ قنوطینی عدالتی نظام اور قوانین کے بارے میں کوئی الگ دستاویز تو دستیاب نہیں البتہ "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں درج ہے کہ مقدمات کا فیصلہ ہر روز کیا جاتا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ لوگ عدالتوں سے بےتحاشا ہنستے یا زاروقطار روتے ہوئے باہر نہ آتے ہوں۔ الجھے ہوئے، پیچیدہ، تصفیہ طلب اور متنازعہ مقدمات نمٹانے کے سلسلے میں ان اعلا عدالتوں کا آج ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی کوئی مدِمقابل نہیں۔ عموماً اس طرح کے مقدمات کے فیصلے آدھے گھنٹے میں کر دیے جاتے۔ کبھی کبھی گواہان، وکلا یا ملزم کے اصرار پر مقدمے کی کاروائی کو طول دیا جاتا، مگر یہ مدت بھی تین دن سے زیادہ نہ ہوتی۔ زیادہ تر مقدمات گمان ہے کہ دیوانی، فوجداری اور سرسری نوعیت کے ہوتے تھے۔ خواتین کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ قنوطینی دور کی سب سے اہم اور مفید ایجاد شاید قانون ہی ہے جسے "انسائیکلوپیڈیا قنوطینیک" (آخری ایڈیشن) کے مطابق قنوطینی زبان میں

"کنوط" کہتے تھے۔

(قنوطینی) تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی کہ ہم اب تک اس کے اہم ترین حصے کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ چلیے یہ ذکر بھی ہو جائے اور قنوطینی سپاہ کی بات کی جائے۔ یہ افواج اپنے محبِ وطن اور باکردار سپہ سالاروں اور جانباز اور جری سپاہیوں کے باعث دور دور تک شہرت رکھتی تھیں۔ قنوطینی تاریخ کے ایک ہزار سال میں سے ساڑھے نو سو سال، یا اس سے کچھ کم، سپاہِ قنوطینیا کی شاندار روایات، مثالی نظم ونسق، حسنِ تدبر اور جذبۂ ایثار کے تذکروں سے عبارت ہیں۔ "انسائیکلوپیڈیا قنوطینیک" (آخری ایڈیشن) اور "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں ایسی عبارات جابجا ملتی ہیں۔ تاریخ انسانی کی ان نایاب دستاویزات کے اکثروبیشتر حوالہ جات اور ابواب قنوطینی سپہ سالاروں کی بذلہ سنجی، سخن فہمی، سخاوت، شجاعت، صبر، استقامت، قناعت، فقروغنا کی داستانوں سے معمور ہیں۔ سپاہیوں کی ملک وقوم، دوست احباب، مال ومتاع اور سپہ سالاروں سے محبت اور وفاداری کی ایسی ایسی حکایات سامنے آتی ہیں کہ دل بےاختیار ہو کے دین و دنیا سے اچاٹ ہونے لگتے ہیں۔ صوفیا کرام اور اولیاءاللہ کی حق گوئی اور راست بازی کی طرف بار بار دھیان جانے لگتا ہے اور اسے زبردستی واپس لانا پڑتا ہے۔ افسوس ہزارہا افسوس کہ "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" کے مستند حوالوں اور کئی دوسری روایات کے مطابق سلطنت کی حدود میں صنعت شاعری کو ایک ہزار سال میں کبھی بھی عروج نصیب نہ ہو سکا، ورنہ آج ان مردانِ صفا، مجسمہ ہائے جودوسخا کے قصیدے اور سپاہِ وفا کے رجز زبانِ خلق کے واسطے سے نقارۂ خدا تصور کیے جا رہے ہوتے۔ دل چاہتا ہے کہ وقت تھم جائے اور قنوطینی تاریخ کے یہ ایمان افروز اور روح پرور مناظر چشمِ انسانی میں گردش کرتے رہیں۔ مومنینِ جانباز کی یہ کثیررکنی جماعت زندگی اور حکومت کے ہر موڑ اور ہر مرحلے پر قنوطینی عوام اور حکمرانوں کی رہنمائی، تادیب و تفسیر اور زجروتوبیخ کرتی نظر آتی ہے۔ قنوطینی تاریخ کے ہزار سالہ دور میں متعدد مقامات پر اس نیکوکار اور حق پرست گروہ نے راست اقدام کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا، اور عوام اور حکمرانوں کو آئین اور امورِ مملکت کی پیچیدگی سے الگ رکھ کر اپنے طور پر ملک وقوم اور سلطنت کی فلاح وبہبود اور جمہوریت کی بحالی کے لیے انقلابی اور دوررس اقدامات کیے مگر افسوس کہ قنوطینی عوام اور حکمرانوں کی کوتاہ بینی، ناعاقبت اندیشی، منفی سوچ اور جلدبازی کے باعث ان سے خاطرخواہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا، اور خوشحالی اور فلاح وبہبود کا عمل ہمیشہ سپاہ اور سپہ سالاروں تک ہی محدود رہا۔ اس بات کا بھی مثبت پہلو دیکھنے کے بجائے قنوطینی عوام اور حکمران سارے وقت نعرےبازی اور ہاہاکار میں لگے رہے جس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

قنوطینی افواج اور فوجی جرنیل محض امورِ مملکت نمٹانے اور اندرونی شورشیں رفع کرنے ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ جنگی اور سیاسی حکمتِ عملی، ملکی اور غیرملکی اسلحے

Scanned with CamScanner

کی خریداری، تیاری اور دیکھ بھال میں بھی بےمثل اور بےنظیر تھے۔ قنوطینی تاریخ میں ان سپہ سالاروں کی میدانِ جنگ میں مہارت، بُردباری، دوراندیشی، قوتِ فیصلہ اور امن پسندی کی مثالیں بآسانی دستیاب ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے ایسی بلندحوصلہ اور باتدبیر سپاہ اور سپہ سالاروں کے وجود پر عقلِ انسانی ششدر اور روحِ حیات پریشان ہے۔ سپہ سالاروں کی حکمت اور بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ حکمرانوں اور عوام کی مسلسل قیادت اور رہنمائی، اور ساتھ ہی ساتھ امورِ مملکت میں بلاغیرے شرکت کے باوجود، اکثر اوقات افواج کے انتظام، اسلحے کی خریداری اور جنگی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے جس کی وجہ سے بیشتر دشمن ممالک جنگ کے خیال تک سے باز رہتے۔ قائدانہ صلاحیت اور جذبۂ شجاعت سے مالامال یہ سپہ سالار جنگ کی صورت میں پہلے سے طاق اعداد میں دنوں کی تعداد طے کر لیتے کہ سات، سترہ یا ستائیس دن سے زیادہ یا کم نہ لڑیں گے۔ بردباری اور امن پسندی ایسی کہ ہمیشہ جنگ وجدال سے پرہیز کرتے اور جنگ کی حالت میں انسانی جانوں کی ہلاکت اور خونریزی کے پیشِ نظر دست بدست لڑائی کو ترجیح دیتے۔ اپنے سارے ہتھیار کہیں چھپا دیتے یا طویل جنگ کے آخر میں دشمن کے سپرد کر دیتے۔ قناعت ایسی کہ ہمیشہ مالِ غنیمت ایک حد سے زیادہ جمع کرنے اور فتوحات سے یکسر گریز کرتے۔ انسانیت کا جذبہ ایسا کہ کبھی دشمن سپاہیوں کو قید وبند کی صعوبت میں نہ ڈالا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے قنوطینی سلطنت کی حدبندی یعنی سرحدوں کا اختصار بھی دراصل انھی قناعت پسند جرنیلوں کی مسلسل کاوش کا نتیجہ تھا۔ یہ کشادہ دل سپہ سالار دشمنی افواج کو کوفت اور خفّت سے بچانے کے لیے جنگ کے جبری خاتمے پر اپنی سپاہ کا ایک بڑا حصہ غیرمسلح کر کے وطن واپس جاتے ہوئے ان کے ہمراہ کر دیتے اور بھول جاتے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ سپاہ سرفرازی کے تذکرے کو محدودومختصر کیا جائے، لیکن قنوطینی طرزِمعاشرت کی کچھ اور دلفریبیاں بھی اپنا بیان چاہتی ہیں، اس لیے آخری اور اہم بات سپاہِ قنوطینیا اور سپہ سالاروں کے حوالے سے یہ کہ مومنیں کی اس جماعت کی زندگی بہت سادہ اور درویشانہ گزری۔ غیرملکی مال اسباب سے کبھی دریغ نہ رکھا۔ لباس، خوراک، روپیہ پیسہ اور اسلحہ ہمیشہ ملکی اور فقرا کی مانند بلاتکلف استعمال کیا۔ کبھی اپنا گھر بنانے کی فکر نہ کی اور خود کو مع خاندان کے سرکاری محلات میں رکھ کر ساری زندگی مسافروں کی طرح جیے جانے کا درس دیتے رہے۔ کاش ہم بھی اس دور میں ہوتے اور ان برگزیدہ سپہ سالاروں یا ان کے مقلّدین کی صحبت سے فیض اٹھا کے دنیاوآخرت میں سرخرو ہوتے۔

بحیرۂ قنوطینیا کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اب قنوطینیا کے جغرافیائی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کا مزید جائزہ بھی لے لیا جائے تاکہ قنوطینی زندگی کے دیگر پہلو سامنے آ سکیں۔ اب سے ہزاروں برس پہلے اس ملکِ خداداد میں چھ دریا بالترتیب بہتے تھے، اور کچھ صحرا اور بہت سارے پہاڑ بےترتیبی کی حالت میں اِدھر اُدھر پائے جاتے تھے۔ کچھ پہاڑوں پر

سردیوں میں خوب برف پڑتی اور گرمی آتے ہی پگھلنا شروع ہو جاتی۔ ان پہاڑوں پر مہم جُو قنوطینی اور غیرملکی سیاح بارہا چڑھتے اترتے تھے۔ ہمارے دریاؤں کی طرح قنوطینی دریا بھی سارا سال سمندر ہی کی طرف بہتے رہتے تھے اور کوئی پوچھ گچھ نہ ہوتی تھی۔ شرحِ خواندگی اعشاریہ صفر درجے ہونے کی وجہ سے ہر طرف ذہنی پسماندگی کو بالادستی حاصل تھی اور اسی باعث پانی کے خرچ اور بہاؤ وغیرہ کا حساب رکھنے کا کوئی دستور نہیں تھا۔ شکر ہے ہم اُس دور میں نہ ہوئے ورنہ آج اپنے سارے دریاؤں کے پانی کے حساب کتاب کے معاہدے کی اہمیت اور افادیت پر عش عش کرنے سے یکسر محروم رہ جاتے۔ پانی کی تقسیم کے سلسلے میں یہ ملک یعنی قنوطینیا بڑا بدنصیب تھا۔ قنوطینی عوام دن میں تین تین دفعہ نہاتے، صبح شام گھر بھر کے میلے اجلے کپڑے دھوتے، نئے پودوں کو بھی بالٹی بھر بھر کے پانی دیتے، کھیتوں میں پانی کھول کے بھول جاتے۔ ناہنجار قنوطینی بچے گھر بھر کے برتن کھنگالتے رہتے یا ان میں پانی بھر کے سارا دن ایک دوسرے کی طرف پھینکتے رہتے۔ شہر شہر گاؤں گاؤں سرکاری خرچ پر گھروں کے باہر اور سڑکوں بازاروں میں پانی کا اتنا چھڑکاؤ کیا جاتا کہ اکثر اوقات کیچڑ ہی رہا کرتی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک ہائیڈل پاور یعنی پانی کی طاقت سے بجلی بنانا شروع نہیں ہوا تھا ورنہ قنوطینی سارے کا سارا پانی استعمال کر کے دریا خالی چھوڑ جاتے۔ انسانی تاریخ میں پانی کا اتنا زیادہ بےجا اسراف آج تک نہیں ہوا اور شاید اسی کا خمیازہ ہمیں بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ سچ ہے کرے داڑھی والا پکڑا جائے مونچھ والا (یہ ایک قنوطینی محاورے کا اردو ورژن ہے)۔ قنوطینی دریا سے یعنی دریاؤں سے کہیں کم اور کہیں زیادہ فاصلے پر صحرا بھی تھے لیکن عوام نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی اور وہ آخر وقت تک خالی پڑے رہے۔ کھجور کے درخت لگانے یا اونٹ پالنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ قنوطینی جنگلات گھنے، سرسبز، ہوادار اور درختوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لکڑبگھے، لدّھڑ، اودبلاؤ اور گرگٹ وغیرہ ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے۔ قنوطینی شکار کا نشانہ لیتے وقت اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ شاید وہ ویجی نیریں تھے۔ ان جنگلات میں باقی جانور اور پرندے بھی پائے جاتے تھے مگر اس بات سے عوام کو کوئی سروکار نہ تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ لدّھڑ یا لکڑبگھا قنوطینیوں کا محبوب جانور تھا، اگرچہ "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں اس کا ثبوت نہیں ملا۔ بعض جنگل دریاؤں کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے لیکن اس زمانے میں یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ قنوطینیا کی زمینیں کہیں کہیں نرم اور کہیں کہیں بہت زیادہ سخت تھی۔ صحرا میں اور سمندر کے کنارے ریت بھی پائی جاتی تھی۔ درخت لگانے کا شوق قنوطینی عوام کے پاس سے بھی نہیں گزرا تھا، البتہ پانی ضائع کرنے کی خاطر مشغلے کے طور پر وہ پیڑ لگا لیا کرتے تھے۔ کیکر، ببول اور جنگل جلیبی کے درخت ہر گھر کے آگے پیچھے اور اندر نظر آتے تھے۔ پانی اور پودوں کی مقدار کی لحاظ سے اور قنوطینیوں کے مزاج کے شایانِ شان نہ ہونے کی وجہ سے گملے کی

Scanned with CamScanner

ایجاد اس دور میں ممکن نہ ہو سکی۔ عام لوگوں کے لیے فرنیچر بنانے کا فیشن عام نہ تھا، اس لیے درختوں کی لکڑی منجی، چوکی، دروازے وغیرہ بنانے، جلانے اور سرپھری خواتین سے ہاتھاپائی میں مدد کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

"قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں شامل مختلف معیار کی تصاویر اور دیگر حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ قنوطینی سیرسپاٹے کے دلدادہ تھے اور فنونِ لطیفہ سے بھی کسی نہ کسی طور لگاؤ رکھتے تھے۔ اکثر قنوطینی صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکلتے تو ہفتوں واپس نہ آتے۔ اس زمانے میں ذرائع آمدورفت اتنے زیادہ نہیں تھے۔ عام لوگ پیدل یا پھر ہاتھی اور شترمرغ پر سوار ہو کے ایک چک سے دوسری چک جاتے آتے تھے۔ دیگر جانوروں اور پہیوں کا استعمال حکمرانوں امرا اور سپاہِ قنوطینیا کے لیے مخصوص تھا۔ قنوطینی حکمراں سیرسپاٹے کے معاملے میں اپنے سادہ دل عوام سے کسی طرح پیچھے نہ تھے بلکہ سچ پوچھیے تو بہت زیادہ آگے تھے۔ وہ اپنا یہ شوق غیرملکی دورے کر کے پورا کرتے تھے۔ حکمراں خاندان کے زیادہ تر افراد سال کا اکثر حصہ دوست ملکوں میں خیرسگالی اور دشمن ممالک میں جاسوسی کر کے گزارا کرتے تھے، اس طرح خارجہ پالیسی بھی مستحکم رہتی تھی۔

فنِ موسیقی اور آرٹ عوام اور خواص میں یکساں مقبول تھے۔ سبزیوں پھلوں اور چرند پرند کی تصاویر بغور دیکھنا اور بنانا اسی دور میں شروع ہوا۔ قنوطینی فرمانرواؤں اور سپہ سالاروں کی قدآدم تصاویر آرٹ کی انتہا سمجھی جاتی تھیں۔ ایسی تصاویر بنانے والوں کو اس قدر انعام اکرام دے دیا جاتا کہ مصور کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا تھا اور باقی ماندہ زندگی اپنے شاہکار کے سایہ عاطفت میں گزار دیتا تھا۔ موسیقی کی تاریخ میں ڈھول اور طبلے کو جو عروج قنوطینی دور میں نصیب ہوا اب تک کسی دوسرے ساز کے حصے میں نہیں آیا۔ ڈھول بجانے کے مقابلے اور طبلے پر سنگت کی محفلیں دن رات سرکاری سرپرستی میں جاری رہتیں۔ عوام کے ذوق وشوق اور انہماک کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب منادی کرنے والے نقارہ پیٹنا شروع کرتے تو لوگ جوق درجوق کھنچے چلے آتے اور ان کی کمال مہارت اور مشاقی پر بےاختیار ہو کے مرحبا مرحبا کے نعرے لگانے لگتے۔ ہر نئے حکمراں یا سپہ سالار کی دارالحکومت آمد پر ڈھول پیٹنے اور نقارہ بجانے کے انفرادی اور اجتماعی مظاہرے جگہ جگہ ہوتے اور استادانِ فن اپنے کمالِ ہنر اور جاں سوزی کی حسب توفیق داد اور انعام پاتے۔ مصوری میں تیز رنگوں کا بےتحاشا استعمال اور موسیقی میں مسلسل اونچے اونچے سُر لگانا قنوطینی دور ہی کی یادگار ہے۔ جیسا کہ سرسری طور پر بتایا جا چکا ہے، قنوطینی زبان کی خاطرخواہ ترویج نہ ہونے کی وجہ سے قنوطینی ادب میں قابلِ ذکر تخلیقات وجود میں نہ آ سکیں۔ قنوطینی سپہ سالاروں اور فرمانرواؤں کی تقاریر اور سرکاری مکاتیب میں مستعمل زبان روانی، سہلِ ممتنع اور فصاحت و بلاغت کے باعث مستند اور بےعیب سمجھی جاتی تھی۔ سپہ سالارِ اعظم کی خودنوشت "بےروزگار فقیر کی

ڈائری"، آخری قنوطینی حکمراں کی تخلیق "دیوانِ خوردوکلاں"، اور ایک گمنام قنوطینی سپاہی کا مزاحیہ ناول "میری قنوطینی فاختہ" وہ انمول جواہر ہیں جن کی بروقت دریافت نے دنیائے ادب کو تہی دامنی رہنے سے بال بال بچا لیا۔ آج بھی سارے کا سارا قنوطینی ادب انھی تین بےنظیر ادب پاروں پر مشتمل ہے۔ شاید کسی نے چوری چھپے کچھ اور بھی لکھنے کی کوشش کی ہو مگر "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ قنوطینیا میں کاغذ کی تیاری اور استعمال کے باوجود اخبار شائع نہیں ہوتے تھے، نہ صبح کے اور نہ شام کے۔ رسالوں اور کتابوں کا بہت زیادہ شائع ہونا بھی کسی طرح ظاہر نہیں۔ قنوطینیا کی حدود میں شائع ہونے والا واحد رسالہ "گزٹ قنوطینی" تھا جو ہر ہفتے پابندی کے ساتھ سرکاری اہلکاروں کے ہاتھوں میں نظر آتا تھا۔ افسوس کہ فی الوقت اس نایاب دستاویز کی کوئی نقل یا قلمی نسخہ موجود نہیں ورنہ اس دور کے علمی، ادبی اور دفتری رجحانات پر مزید روشنی پڑ سکتی تھی۔ تین لاقانی ادب پاروں اور قانون کی کتابوں کی افراط سے موجودگی کی شہادت پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ ہماری ناقص رائے میں پرنٹ میڈیا کا نہ ہونا ہی قنوطینی سلطنت کے زوال کا اصل سبب ہے۔ صحت مند اور باشعور میڈیا کی موجودگی کی ضرورت اور فوائد پر قنوطینی عوام اور حکمرانوں کی نظر نہیں جا سکی جس کا خمیازہ ان کو بالآخر ایک ہزار سال بعد بھگتنا پڑا۔ الیکٹرانک میڈیا بھی آج کی ایجاد ہے ورنہ شاید قنوطینیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

قنوطینی عوام کھیل کود کے بھی بہت رسیا تھے۔ کوئی بھی کھیل ہوتا مگر ایک سی لگن اور جانفشانی کا مظاہرہ کرتے۔ چور سپاہی، اندھا بھینسا، آنکھ مچولی، چمچادوڑ اور کوڑا جمال شاہی دراصل قنوطینیا ہی میں ایجاد ہوئے اور قبولِ عام کی حدود سے آگے جا پہنچے۔ ان کھیلوں میں قنوطینی کھلاڑیوں کی مہارت اور مثالی کارکردگی آج بھی ایک ریکارڈ ہے۔ قنوطینی کئی صدیوں تک ان کھیلوں کے ناقابلِ شکست چیمپئن تھے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور اسکواش سے ملتے جلتے کھیل ہمیشہ طبقۂ امرا تک ہی محدود رہے۔ اسی طرح گولف، پولو اور شطرنج سے حیرت انگیز طور پر مماثل کھیل قنوطینی سپاہ کے لیے مخصوص تھے۔ عوام ابتدا میں مذکور کھیلوں کے علاوہ کبھی کبھی کبڈی اور رسّاکشی کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے، مگر قنوطینیا میں عوام الناس کے آؤٹ ڈور کھیلوں کے لیے کبھی بھی فضا سازگار نہیں ہوئی اور غریب قنوطینی ہمیشہ کے لیے ان ڈور کھیلوں کے بےتاج بادشاہ ہی کے رہ گئے۔ حکمراں اپنی جانب سے مہنگے اور ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتے تھے جن کا خاتمہ عموماً جھگڑے فساد اور دھینگامشتی پر ہوا کرتا۔

قنوطینی خواتین کو امورِ خانہ داری اور جنسِ مخالف کی جانب سے بلاناغہ زدوکوب نے کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ وہ چین سے کوئی ان ڈور کھیل ہی کھیل سکیں۔ قنوطینی خواتین اپنے فاضل وقت میں اپنے مردوں کی جُرابیں رفو کرتیں اور رومال کاڑھتیں یا آئینے کے سامنے

Scanned with CamScanner

کھڑی ہو جاتیں اور اسی آخری عادت کے باعث جنسِ مخالف کے ہاتھوں مرمّت کے عمل سے گزر کر باقی وقت اپنے زخموں پر مرہم رکھتیں یا اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی رہتیں۔ قنوطینی بچے، جیسا کہ پہلے بتایا گیا، ہر کام میں اپنے ماں باپ کی نقل کرتے رہتے تھے اس لیے ان کا دوبارہ ذکر بے‌سود ہے۔

قنوطینی لوگ میل ملاپ، حسنِ اخلاق، رواداری اور باہمی ایثار کی موجودہ روایات کے اصل امین تھے۔ شادی بیاہ، غمی خوشی، مرنے جینے میں ایک دوسرے سے بڑھ کے حصہ لیتے، یہاں تک کہ ڈھول دھپے، مارپیٹ اورلپاڈگی میں بھی اسی خندہ پیشانی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے جیسا آج ہزاروں سال بعد دیکھنے میں آ رہا ہے۔

قنوطینی عوام بنیادی طور پر کسان یعنی ہاری تھے اور زراعت کے پیشے پر گزربسر کرتے تھے۔ حکمراں اور ریاستی اہلکار بھی اسی سبب سے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرف دھیان نہ دے سکے اور ایک ہزار برس تک عوام کی زرعی مصروفیات کی نگرانی اور فصلوں کی پیداوار کا حساب کرتے رہے۔ مشینی کاشتکاری کا آغاز نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر کام مثلاً فصل کی گنتی وغیرہ بھی ہاتھ سے کیے جانے پر زور تھا۔

قنوطینی کھیتوں میں شرشوں (ایک قنوطینی سبزی)، بینگن، پیاز اور بھنڈی وسیع رقبے میں کاشت کیے جاتے اور بہار کے موسم میں عجیب منظر پیش کرتے۔ ملک کی اسّی فیصد آبادی زراعت سے وابستہ تھی، یوں کھیتوں سے کچھ فاصلے پر ہی رہا کرتی اور آمدورفت کے بےجا مسائل بھی پیدا نہ ہوتے تھے۔ قنوطینیا کی باقی آبادی آج کی طرح شہری تھی اور شہروں ہی میں رہنا پسند کرتی تھی۔ قنوطینی زراعت میں چاول، گندم، گنّا، مکئی، کپاس اور سورج مکھی وغیرہ اگانا دیہی آبادی کے نزدیک غیر منافع بخش سمجھا جاتا تھا، کیونکہ مخبری ہونے پر عمائدینِ سرکار اور اہلکار تیار حالت میں فصل اٹھا کر لے جاتے اور آنے والے دنوں کے لیے سرکاری مقامات پر جمع کرا دیتے تھے۔ شہری علاقوں میں امن وامان کے زمانے میں آلو پالک کی کاشت کی جاتی تھی۔

صحت وتعلیم کے شعبے میں عوامی سطح پر کوئی نمایاں پیش رفت نہ ہو سکی۔ اتنا ضرور تھا کہ شہری لوگ ایک سے دس تک گن لیتے تھے اور ابتدائی حروفِ تہجی دقت کے بغیر پہچان لیتے تھے۔ عمائدینِ سرکار، قنوطینی سپاہ اور قانون پڑھنے والوں کے لیے کچھ سہولت موجود تھی۔ صحت کے میدان میں بھی ایسے ہی حالات تھے۔ سرجری، میڈیسن، ہومیوپیتھی وغیرہ تو آج کی اختراعات ہیں، اس زمانے میں تو قنوطینی حکما اور طبیب بیماروں اور تیمارداروں پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ ان مسیحانفس اور شفابخش اطبا کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد اور دواخوار گلی گلی محلے محلے مریضوں کی ٹوہ لیتے پھرتے تھے، ہر آئے گئے کو مفت چیرا لگاتے، زخموں پر پھاہے رکھتے، جلاب دیتے اور کالے نمک کے پانی سے غرارے کرواتے۔ طبِ قنوطینی کے یہ نادرِ روزگار گشتی شفاخانے عوام الناس کی

دماغی اور جسمانی صحت کا اصل راز تھے۔ خوراک کے ساتھ چُوری کا بلاناغہ استعمال قنوطینی عوام ہی نےشروع کیا۔ نیز "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" کے مطابق اچھے اور خراب دانت نکالنے کے لیے غیرملکی دندان سازوں کو ملک میں کام کرنے کی اجازت دینا بھی ایک قنوطینی روایت ہے۔

صنعت اور تجارت کی قنوطینی دنیا میں بھی ہمیشہ خسارے اور افراطِ زر کے باعث انحطاط کا رجحان برقرار رہا۔ درآمدات پر پابندی کا یہ عالم تھا کہ قنوطینی عمائدین معمولی موزے بنیان اور مچھردانیاں تک چوری چھپے منگواتے اور سرکے کی بوتلوں میں غیرملکی عطر بھر بھر کے ذخیرہ کر لیتے۔ زرمبادلہ کی ملکی ضروریات کی خاطر قنوطینی حکما کے استعمال شدہ نشتر، گڈولنے، تنّامرچ، دنداسا اور پانی کا اچار برآمد کیا جاتا تھا۔ عوام میں بچت کی عادت اور فضول خرچی سے پرہیز کی خاطر کرنسی کا استعمال ممنوع تھا اور عمائدینِ سلطنت اور سرکاری اہلکار خریداری کی صورت میں نقد ادائیگی سے اجتناب کرتے تھے۔ قنوطینی صنعت کاروں نے بھی ایک ہزار سال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزارے اور اُف تک نہ کی۔ شہروں کی بلدیاتی حدود کے اندر یا باہر ایک درجن سے زیادہ کارخانے یعنی صنعتیں لگانے پر پابندی عائد تھی۔ ان کارخانوں میں مختلف دھاتوں سے توے، چمٹے اور قرولیاں تیار ہوتی تھیں۔ معدنیات سے سرمہ، منجن اور ہاون دستے بنائے جاتے۔ زرعی اجناس سے کھانڈ اور ستّو تیار کیا جاتا تھا۔ تنور لگانا سب سے منافع بخش کاروبار تھا لیکن مورخین اینٹوں کے بھٹوں اور چکنی مٹی سے برتن سازی کو قنوطینی صنعت وتجارت کا اہم ستون قرار دیتے رہے۔ واضح رہے کہ اچار ڈالنا اور کھڈیوں پر کپڑا اور فرشی دریاں بننا عام گھریلو صنعت شمار ہوتے تھے۔ قنوطینی حکمراں امورِمملکت اور عوام کی فلاح وبہبود میں ایک ہزار سال تک اتنے الجھے رہے کہ اپنے ہم عصر بیرونی حکمرانوں کی طرح فنِ تعمیر میں کمال حاصل نہ کر سکے۔ یہ عاقل اور بالغ فرماں‌روا ایسے کاموں کو فضول اور وقت کا ضیاع قرار دیتے تھے، لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ تعمیری ورثہ چھوڑنے پر رضامند تھے۔ قنوطینی عہد کی تعمیرات کا کچھ ذکر تو قانون کے باب میں ہو چکا، بس تھوڑا سا بیان اور؛ دریاؤں پر کشتیوں سے پل بنانا دراصل قنوطینی تخلیق ہے۔ یہ پل موسلادھار بارش اور سیلاب میں بہہ جاتے، مگر ان کا دوبارہ بنا لینا قنوطینوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ آئےدن کی مرمّت اور کھڑاؤں کی آواز کے خیال سے وہ پختہ سڑکیں نہیں بناتے تھے۔ کشادہ اور ہموار کچے راستے، کھرے کھرے کنویں اور لق ودق میدان ماہرین کی موثر منصوبہ سازی کا جیتاجاگتا ثبوت تھے۔ دیہی اور شہری آبادی اپنی مدد آپ کے قنوطینی اصول کے تحت میٹھے پانی کے تالاب، دھوبی گھاٹ، چوبارے اور اپنے گھر خود بنا لیتے تھے، بلکہ سرکاری عمارات اور عمائدین کے محلات کی تعمیر میں بھی بلامعاوضہ ہاتھ بٹاتے رہتے۔ عوام الناس اپنے گھروں کی تیاری میں بالو ریت اور نباتات کا خوب استعمال کرتے جبکہ دوسری طرف عمائدین اور

Scanned with CamScanner

اہلکار مختلف دفاتر اور محلات کی تعمیر مخصوص نباتات اور معدنیات کے ملےجلے آمیزے سے عمل میں لاتے۔ دیوہیکل دروازے، دبیز دیواریں اور نیم وا کھڑکیاں قنوطینی طرزِتعمیر کی زیبائش اور دلآویزی میں چار چاند لگا دیتی تھیں۔

قنوطینی امرا اور عمائدین باغبانی سے والہانہ لگاؤ کے باعث اپنا کثیر وقت گلشنی کے کاروبار میں گزارتے تھے۔ پودوں کی قلم کاری، تراش خراش، آلاتِ باغبانی، بھڑوں اور تتّے کے کاٹے کے فوری علاج کے بارے میں وہ خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ قنوطینی دور کا مقبول ترین سلوگن "جہاں درخت ہے وہاں باغ ہے" تھا۔

قنوطینی باغبانی کی نمایاں خصوصیت سبزیوں اور پھلوں کے وہ لہلہاتے باغ تھے جو ہرَیل توتوں، دھوبن چڑیوں اور ہدہدوں کی چہکار سے ہمیشہ آباد رہتے تھے۔ ککرونڈے، لسوڑے، جھڑبیری اور مکو کے باغات عام تھے۔ٹِرنی اور کریلے کی مخروطی بیلیں قنوطینی طرزِآرائش کا لازمی جز تھیں۔ "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں گیندے کے علاوہ کسی اور پھولدار پودے کے باغیچے کا ذکر نہیں۔

غرض کہ اب سے ہزاروں سال پہلے قنوطینی اور قنوطینیا اپنی عظیم اور شاندار روایات، جداگانہ طرزِحیات، اور منفرد تہذیب و تمدن کے باعث ہم عصر قوموں پر واضح برتری حاصل کیے ہوئے تھے، اور شاید اسی لیے باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قنوطینی سلطنت کا بتدریج خاتمہ عمل میں لایا گیا، اور وہ ایک ہزار سال کے بعد رفتہ رفتہ زوال کو پہنچی۔

قنوطینی تاریخ نگار اپنی سلطنت کے خاتمے کے اسباب بہت زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کرتے مگر "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" میں جو خفیف اشارے کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال کا بہت اہم سبب قنوطینی سلطنت کے ہزار سالہ دور کی واحد ملکہ کا مختصر عرصۂ اقتدار ہے۔ اس اکلوتی ملکہ کے تعلقات قنوطینی سپہ سالاروں اور گزشتہ حکمرانوں سے بوجوہ خوشگوار نہیں رہے تھے اور یہ مشترکہ بدخواہ ساری خرابیوں کی جڑ موقع بےموقع اس کے واحد شوہرِ نامدار کو قرار دیتے رہتے تھے۔ قنوطینی زبان میں کباب میں ہڈی سے مماثل محاورہ اسی بدنصیب کی وجہ سے اسی دوران وجود میں آیا۔ یہ نیک مرد سرکاری خزانے سے لے کے نقدی، فصلوں اور جنسِ مخالف تک کو عوام کی ملکہ کی اور اسی تعلق سے اپنی ملکیت سمجھتا اور بلاکھٹکے استعمال کرتا۔ بس اتنی ذرا سی بات پر ہر کس و ناکس نے بتنگڑ بنانے شروع کر دیے اور طوماربازی کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ دکھیاری ملکہ کو روہانسی کر کے شاہی محل سے نکالا نہ مل گیا۔ ملکۂ قنوطینیا میں بہ لحاظ حسن ودانش، عقل وجمال، دانائی و دنیاداری بےشمار صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، مگر حیف قسمت کہ عقل وخرد سے عاری قنوطینی ان سے فیض یاب نہ ہو سکے۔

ملکہ کے قنوطینی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کی مختصر داستان بھی دلچسپی

سےخالی نہیں۔ آئینِ قنوطینیا کے تحت حکمرانی کے لیے ہونے والی قرعہ اندازی کے موقعے پر حکومتِ وقت کے کسی بدخواہ نے ایک بدنام اور مرحوم سیاسی رہنما کی بڑی پوتی کا نام بھی پرچے پر جلی حروف میں لکھ کے باقی ناموں کے ساتھ پٹارے میں ڈال دیا۔ قرعہ اندازی پر معمور سپہ سالارِ اعظم نے پٹارے سے جب نام نکالا تو حسنِ اتفاق یا شومیِ قسمت سے سیاسی رہنما کی بڑی پوتی کی تو جیسے لاٹری نکل آئی، مگر بیشتر عمائدین اور اہلکار خون کا گھونٹ پی کے رہ گئے۔ اب تقدیر کے لکھے کو کون تھا جو ٹالتا، اور ویسے بھی بنیادی طور پر قنوطینی شہری آئین کی بالادستی اور قانون کااحترام ہر حال میں ملحوظِ خاطر رکھتے تھے، اس لیے فوراً دوسری قرعہ اندازی کو بعیدازقیاس اور خلافِ اخلاق خیال کرتے ہوئے ملکہ کو سال بھر کے لیے نیا حکمراں بنا لیا گیا۔ "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" کے مطابق یہ غلطی پہلی اور آخری بار ہوئی۔

اس یتیم ومظلوم کی گزشتہ زندگی چونکہ چادر، چاردیواری اور امورِ خانہ داری کے دکھ سہتے گویا قید میں گزری تھی اس لیے اقتدار سنبھالتے ہی ملکہ نے اپنے شوہر سمیت ہر چھوٹے بڑے، کھوٹے کھرے، خاص وعام کو اندرون اور بیرونِ ملک سیرسپاٹے کرنے اور امورِ مملکت و عمائدینِ سلطنت کے بارے میں بےدھڑک اور سرِعام بولنے چالنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ طبقۂ امرا اور بعض عام اہلکاروں کو بھی یہ اقدام ناگوار گزرا مگر اب کچھ نہ کچھ تو برداشت کرنا ہی تھا۔ قنوطینی ملکہ کا اپنے نکھٹو میاں کو فی الفور اتنی زیادہ آزادی دینا بہت مہنگا پڑا اور بائیس ہفتوں کے اندر اس کی آئینی حکومت کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے اور اقتدار ڈانواڈول ہونے لگا۔ ملکہ کی تین چوتھائی ذہانت اپنے مجازی خدا کی خرچ کردہ رقم کی جمع تفریق اور بدخواہوں کو رام کرنے میں صرف ہو گئی۔ باقی ماندہ ذہانت سے کام لیتے ہوئے ملکہ نے اپنے بچوں کی مثالی تعلیم و تربیت اور حفاظت کا بندوبست کیا؛ سپاہِ قنوطینا کو نئی وردی بنوا کے دی؛ برساتی، چھتری اور جاڑے کے لیے جوتے لے کے دیے؛ سپہ سالاروں کو غیرملکی اشیا کے تاحیات استعمال کی اجازت دی؛ شہتوت اور چھوئی موئی کے باغات لگائے۔ ملکہ کے بہترین باغ کے مالک کو خلعتِ فاخرہ کے ساتھ باغبان الملک کا خطاب عطا ہونے لگا؛ کاجل اور اچارسازی کی زبوں حال صنعت حکومت نے اپنی سرپرستی میں لے لی۔ عوام کے لیے پہلی بار ٹھنڈے پانی کی سبیلیں اور مفت چورن تقسیم کرنے کے مراکز قائم کیے گئے۔ مگر افسوس اس سنہری دور کو اپنوں ہی کی نظر کھا گئی۔ ملکہ کو کھیل کود کا شوق بھی تھا؛ کھوکھو اور کِل کِل کلتا نامی کھیل ملکہ ہی کے دور میں پہلی بار منظرِعام پر آئے اور عوام نے ان میں خوب دلچسپی لی، لیکن عوام کو یوں بغیر فیس کے چورن کھاتا اور ہنستا کھیلتا دیکھ کر قنوطینی سپاہ، عمائدین اور آئندہ اور گزشتہ حکمرانوں کے سینے پر آئےدن سانپ لوٹتے رہتے اور وہ دانت پیس پیس کر رہ جاتے۔ ملکۂ قنوطینیا نے بیرونی دورے بھی کیے، مگر وفادار شوہر سائے کی طرح ساتھ رہا اور کہیں پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں ملکہ

Scanned with CamScanner

جاتی یہ وفا کا پُتلا احتیاطاً پہلے ہی سے وہاں پہنچ جاتا کہ غریب بھاری بھرکم اور قیمتی تحائف اکیلی کیسے لائے گی۔ یہ معصوم شکل شوہر سرکاری ملازمیں پر بھروسا کرنے کا قطعی قائل نہ تھا اور اکثر جائز کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ قنوطینی رسم و رواج کے مطابق میاں بیوی میں اس درجہ محبت اور وفاداری تقلیدوتحسین کی حق دار تھی، مگر بدخواہوں کے باعث اس کا الٹا اثر ہوا اور لوگ پیٹھ پیچھے اور سامنے باتیں بنانے لگے۔ قنوطینی ملکہ کا شوہر ملکہ کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا اور بدخواہ شوہر کے۔ جہاں وہ جاتا یہ سازشی عناصر اس سے پہلے موجود ہوتے۔ جو چیز اسے پسند آ جاتی یہ فریبی سو گنا مہنگی قیمت پر اس کے ہاتھ فروخت کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس کی جیبیں خالی ہو گئیں۔ وہ بےچارہ ملکہ کے خزانے سے (اپنا سمجھ کے) سرکاری رقوم نکالنے لگا، اور کبھی کبھی تو یہ خوددار مرد سرکاری گھر کی فالتو اور قیمتی چیزیں گروی رکھ کے اپنا کام چلاتا۔ آخر کب تک اس طرح گزارا ہوتا۔ ملکہ بےچاری خود بدخواہ سازشی ٹولے، امورِ مملکت اور موذی شوہر کی حرکتوں سے یکساں تنگ تھی، مگر چاہتی تھی کہ آئین کی رو سے سال پورا ہو تو یہ ذمےداری کسی اور کو سونپ کر آرام سے اپنے باقی دن ہنڈیاچولہا کرتے ہوئے گزارے، لیکن دکھیا کے نصیب۔ سازشی عناصر نے سال پورا ہونے کا بھی انتظار نہ کیا۔ جیسے ہی خزانے کے آدھے رہ جانے اور سرکاری مال واسباب کے رہن رکھے جانے کی اطلاعات مع ثبوت ملیں، فوراً ہی ان بدطینت اور شریر لوگوں نے ملکہ کو مع اس کے نامی شوہر اور چار چھوٹے بڑے بچوں کے ڈھول دھپّے اورشورشرابے کے بعد ڈنڈاڈولی کر کے محل تو محل دارالخلافے کی مملکتہ حدود سے باہر نکلوا دیا۔ اس غیرآئینی حرکت پر دیکھنے والوں اور غریب جاں شوہر نے خوب واویلا کیا اور ہاتھ پاؤں چلائے، مگر کسی نے اس کی داد فریاد پر کان نہ دھرے۔ بےیارومددگار ملکہ روتی پیٹتی، کوستے دیتی اپنے کنبہ سمیت جنگل بیابان کی طرف نکل گئی۔ جب ذرا ان آپادھاپیوں کی دھول جمی اور لوگ اس کی اور اس کے بھونچو میاں کی شکل بھول بھال گئے تو ایک رات وہ جنم جلی اپنے معصوم بچوں اور اُسی شوہر کے ساتھ اپنی متروکہ جائیداد یعنی پشتینی ڈھنڈارخانے میں لوٹ آئی اور پُھکنی چمٹا سونت کے ایک نئے عزم کے ساتھ گھرگرہستی کے جھمیلوں میں غرق ہو گئی۔

ہزار سالہ دور کے آخری برسوں میں سرکاری خزانے اور سرکاری مال و اسباب کو اپنا سمجھ کے مسلسل استعمال کی روایت اور اکلوتی قنوطینی ملکہ کے پُرتاثیر اور ناگہانی کوسنوں نے سلطنتِ قنوطینیا کو بالآخر کوڑی کوڑی کا محتاج یعنی بالفاظِ دیگر کنگال کر دیا۔ اقتصادی اور ذہنی طور پر دیوالیہ حکمرانوں کے ساتھ خالی پیٹ عوام کب تک گزارا کرتے، تنگ آ گئے، اور رفتہ رفتہ تمام قنوطینی مختلف ملکوں کو ہجرت کر گئے۔ عوام کے اچانک چلے جانے سے سپاہِ قنوطینیا بھی خالی جیب ہو گئی اور سپاہی بددل رہنے لگے۔ آخر وہ بھی کچھ عرصے بعد دوسرے ممالک جا کے دشمن سپاہ میں جزوقتی ملازم ہو گئے۔

قنوطینی عوام اور افواج کے یوں بتدریج چلے جانے سے قنوطینی سپہ سالار اور حکمران بھی بُجھ کے رہ گئے اور چپ چپ رہنے لگے۔ بےچارے بیٹھے بیٹھے آسماں کو تکتے رہتے، ایک دوسرے کو گھورتے رہتے یا اپنی جمع پونجی کا حساب کتاب کرتے رہتے۔ لاحاصل تخمینے کے بعد وہ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ فوج اور عوام کے بغیر زیادہ عرصے تک گزارا ہونا مشکل ہے۔ ایک دن یہ "ناس پیٹے" حکمراں اور "جھاڑو پھرے" سپہ سالار (بحوالہ ملکہ کے آنجہانی کوسنے) اپنے ازلی ٹٹوؤں کو ایڑ لگا، ان ملکوں کی طرف نکل گئے جہاں قنوطینی عوام اور سابق فوجی خواب میں بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ قنوطینیا ایک عرصے تک خالی پڑا رہا اور وہاں خوب جھاڑجھنکاڑ اُگ آیا۔ پھر نہیں معلوم کیا ہوا، اسے زمیں کھا گئی یا آسماں نگل گیا۔ کچھ پتا نہ چل سکا بےچارے قنوطینیا کا۔ تاریخ کے اس موڑ پر آ کر "قنوطینی تاریخ مفصل باتصویر" اور "انسائیکلوپیڈیا قنوطینیکہ" (آخری ایڈیشن) بھی دفعتاً خاموش ہو جاتے ہیں۔

rekhta
Scanned with CamScanner

گریگور فان ریزوری

Gregor von Rezori

گریگور فان ریزوری ۱۹۱۴ میں بوکووینا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ویانا یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور زندگی کا کچھ حصہ بخارسٹ (رومانیا) میں بسر کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے جرمنی میں فان ریزوری نے ادب، ریڈیو اور فلم کے میدانوں میں عملی سرگرمیاں شروع کیں۔ ان کی پہلی کتابوں میں *Tales from Maghrebinia* اور *Oedipus Triumphs at Stalingrad* شامل ہیں۔ ان کے ایک اور ناول کا انگریزی ترجمہ ۱۹۶۰ میں *The Hussar* کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن انگریزی پڑھنے والوں میں ان کی مقبولیت کا آغاز ۱۹۶۹ میں Memoirs of an Anti-Semite نامی کہانی کی "نیویارکر" میں اشاعت سے ہوا۔ یہ ان پانچ کہانیوں میں سے ایک ہے جو مل کر اسی نام کے ایک منفرد انداز کے ناول کی تشکیل کرتی ہیں، اور جن میں ایک کہانی SKUSHNO کا ترجمہ آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔

پانچ کہانیوں سے مل کر بننے والا یہ ناول نہ صرف ایک انسان کی زندگی کی داستان بیان کرتا ہے بلکہ وسطی یوروپ کے ساٹھ سالہ سفر کا روحانی سفرنامہ بھی ہے۔ تاریخی معنویت سے قطع نظر، ان کہانیوں کو انسان کی اجتماعی حماقتوں کی روداد کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے، جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہیں اور جن کے خدوخال ہمیں اپنے آس پاس بھی نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ ناول تکنیک کے ایک جرأت مندانہ اور پرمسرّت تجربے کے طور پر قابل قدر ہے۔

فان ریزوری کی تازہ تصنیف ان کا ناول *Death of My Brother Abel* ہے جس کا انگریزی ترجمہ کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا ہے۔

انتخاب

گریگور فان ریزوری

Scanned with CamScanner

گریگور فان ریزوری

اسکشنو

انگریزی سے ترجمہ : فہمیدہ ریاض

اسکشنو روسی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جس کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ اس کا مطلب صرف خشک و بےرس بوریت نہیں۔ اسکشنو تو ایک ایسی غیرواضح، مگر شدید آرزو کی سی کیفیت کا نام ہے جو ایک اندرونی روحانی خلا کی مانند آپ کے سارے وجود کو چُوس کر رکھ دے۔ تیرہ سال کی عمر میں، جو بقولِ ماہرینِ تعلیم ایک بےذھب عمر ہوتی ہے، مَیں اپنے والدین کے لیے دردِ سر بن گیا تھا۔ ہم لوگ بُوکووینا میں رہتے تھے جو اب جنوب مشرقی یوروپ کا ایسا دورافتادہ صوبہ ہے جو ستاروں کے فاصلوں سے بھی پرے معلوم ہوتا ہے۔ میری کہانی بھی وقت اور مقام دونوں لحاظ سے اسی قدر دور محسوس ہوتی ہے، جیسے وہ سب کچھ میں نے کسی خواب میں دیکھا ہو۔ حالاں‌کہ اس کا آغاز بالکل عام انداز سے ہوا تھا۔

جس وقوعے نے میرے والدین کو شدید تردّد سے دوچار کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ نالائق طلبا کو نااہل قرار دینے کے مجاز تعلیمی مشاورتی بورڈ نے مجھے شاہی مملکتِ رومانیا کے مدرسہ جات سے خارج کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آسٹروہنگیرین سلطنت کے خاتمے پر ہم لوگوں نے اپنے آپ کو شاہی مملکتِ رومانیا کا شہری پایا تھا۔ میرے والدین بہرحال آسٹریا ہی کو اپنا روحانی وطن گمان کرتے تھے، مگر استیریا کے بورڈنگ اسکول کی سخت پابندیوں کے ذریعے میری شخصیت کے عدم توازن کو کسی اَپنک میں لانے کی کاوشیں بھی اسی قدر اندوہناک نتیجے سے دوچار ہوئی تھیں، اور وہاں سے میں بہ رضاورغبت خود علیحدہ ہونے کا بہانہ کر کے ہی اس کلنک سے بال بال بچ سکا تھا کہ مجھے مستقبل میں اعلا تعلیم کے لیے باقاعدہ نااہل قرار دے دیا جائے۔ پرورشِ نونہالاں کے ماہرین کو میرے وجود میں امید کی ہلکی سی رمق بھی نظر نہیں آتی تھی۔ رہے میرے والدین تو وہ اس حقیقت سے سرتاسر روگردانی کر کے کہ میرے تضادات خود ان دونوں کے اچھے خاصے برق فشاں اختلافات ہی کے پیداکردہ ہیں، ماہرین کی رائے سے کلّی اتفاق کرنے پر مائل رہتے، یعنی یہ کہ وہ مرکبِ تضادات، جس پر میرا وجود مشتمل تھا، جس میں شدید حسّاسیت اور پُرتشدّد رجحانات، بیدارمغزی اور سیکھنے کی عدم اہلیت، ستائش اور مدد کی خواہش اور عدم مفاہمت وغیرہ کی دھماکہ خیز آمیزش تھی، مستقبل قریب و بعید میں صرف کسی مجرمانہ

نوعیت کے فرد ہی کی صورت میں ظاہر ہو سکتے تھے۔

میری نسل کی کہاوتوں میں سے ایک یہ بھی تھی (جو دراصل ولہلم بوش کی تصنیف "نیک ببلی" کے اوراق سے نکل کر زبان زدِ عام ہوئی) کہ "بدنام ہو جاؤ اور عیش کی گزارو"۔ تاہم میری حد تک تو اس کہاوت کی حیثیت اتنی ہی تھی کہ اے بسا آرزو۔ مجھ سے کوئی میری کیفیت پوچھتا تو میں سرد آہ کھینچ کر کہتا، "اسکشنو!" کبھی کبھار بغاوت کا خیال ذہن میں سر ضرور اٹھاتا لیکن زیادہ تر کچھوے کی سی سست رفتاری سے رینگتے اُس دور میں میں گھسٹتے ہوئے زندگی گزار رہا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میرے نیم جاں وجود کو شب وروز خود گھسیٹ رہے تھے۔ ایک احساسِ جرم میری جاں سے چمٹا رہتا جس سے مجھے کسی صورت نجات نصیب نہ ہوتی۔ یہ احساسِ جرم مجھ پر دوسروں نے یوں ہی نہیں تھوپ دیا تھا؛ اس کی گہری وجوہات تھیں جن کا میں اس وقت تجزیہ نہیں کر پاتا تھا۔ اگر کر سکتا تو شاید زندگی کچھ آسان ہو جاتی۔

دور دراز ماضی کی اس دھند میں مجھے اپنی ایک تصویر نظر آتی ہے، اس دور کے بنے ہوئے، پیچیدہ کلوں والے کسی اوّلیں کیمرے سے اتاری ہوئی تصویر، جس میں ان گنت پیچ اور ٹیکنیں ہوتی تھیں اور بڑے بڑے لینس؛ اس کی چنّٹ دار سیاہ چمڑے کی دھونکنی کو چمک دار پلکی دھات کی چمٹیوں اور قینچیوں سے ارگن باجے کی طرح کھینچا جاتا تھا۔ اس ایجاد اور صنعت میں اس دور کی جرمن سوچ کی روح نظر آتی تھی، وہ "زائٹ گیسٹ" (ذوقِ عمل)، جو اس دور میں بنائی ہوئی اوّلیں موٹرگاڑیوں کے اونچے پہیوں اور نوکیلے زاویوں میں منعکس ہوتا تھا، اور جو میرے لڑکپن کے تخیّل کو مہمیز دیتا تھا، جب کہ زندگی ابھی گھوڑوں اور بگھیوں کے زمانے سے بہت دور نہیں نکلی تھی۔ میرے ہم جماعت لڑکوں کو کرسمس کے موقعے پر یا ان کی سالگرہوں پر یہ تصویر اتارنے والے آلات تحفتاً ملتے تو میں رشک سے بےچین ہو جاتا۔ حالاں‌کہ جو تصویریں وہ اتارتے تھے اور گاہے بگاہے مجھے دیتے تھے انھیں مَیں خاص خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مدرسہ چھوٹنے کے ساتھ بہرحال ان ہم جماعتوں کا ساتھ بھی چھوٹ چکا تھا۔

اس تصویر میں مجھے ایک لڑکے کا مدوّر، سرکش چہرہ دکھائی دیتا ہے جس کا پامال بچپن جلد ہی ہلاک کر دیا جانے والا ہو۔ اس چہرے پر ایک بیزار اور اداس عزم ہے جس کا مرکز اس کی اپنی ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے یہ کچھ قابلِ رحم اور کچھ حماقت آمیز تاثر ہے۔ لیکن اس سے یہ غلط اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ آغازِ بلوغت کی ابتلا درحقیقت محض خیالی تھی۔ ایسا نہ تھا؛ وہ ابتلا ایک سنگین حقیقت تھی اور اس لحاظ سے اور بھی بےڈھنگی تھی کہ اپنی شدید اذیّت کا کسی دوسری طرح اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایک ابرآلود دن کی تصویر ہے، میں ایک کٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا ہوں، اور میں نے کلف دار، پانی سے بچانے والی لنن کا ڈھیلا کوٹ پہن رکھا ہے جس کو فوجی پیٹی نے باندھ

Scanned with CamScanner

رکھا ہے اور جس میں کشادہ جیبیں ہیں۔ اس طرح کا کوٹ ۱۹۲۰ کے اواخر میں انتہاپسند دائیں یا بائیں بازو کی نظریاتی انجمنوں کے ارکان پہنا کرتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو کسی قسم کے فلسفے سے میرا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ جیکٹ تو میں بس یوں ہی چرنووچ کے دیہی نواح میں تنہا، بلامقصد آوارہ گردی کرتے ہوئے پہن لیا کرتا تھا۔ دھوپیلے موسموں میں یہ دیہات بےکراں افق کے نیچے، نرم ہموار سبزے سے ڈھکی ایک لامتناہی سبرگاہ کا سا منظر پیش کرتے تھے۔ مگر زمستاں میں، جب آسماں پر صرف سیاہ کوّوں کے دل کے دل منڈلاتے پھرتے، وہاں میلوں صرف افسردہ، تاریک کھیتیاں نظر آتیں جن کی زمیں گوڑائی کے بعد مٹی کے سیاہ ڈھیلوں میں بدل چکی ہوتی۔ کپڑے کے تھان کی طرح کھلتے چلے جانے والے اس غلطاں خطّے پر دور، برف کی دھاریوں سے پرے جو اس علاقے کے نشیبوں کی نشاں دہی کرتی تھیں، سیاہ جنگلوں کی لکیر کوہساروں تک کشیدہ نظر آتی۔ ان اداس، بوجھل شاموں میں، آسماں کے گیند کی دودھ کے گلاس جیسی ککر میں جُھٹ پٹے کی نیلی روشنی بمشکل دکھائی پڑتی۔ ان دنوں میری روح کا اندرونی منظر اواخر سرما کے کسی ایسے ہی دن جیسا تھا، اور یہی تھا اسکشنو۔

اس تصویر میں میں ننگے سر بیٹھا ہوں۔ ہوا نے میرے بالوں کو منتشر کر دیا ہے۔ میرے قدموں میں میرا سپیل مچھلی کی طرح چکنا، پھسلواں ڈیش ہاؤنڈ بیٹھا پرستش بھری نگاہوں سے منہ اوپر اٹھائے مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ میرے کھیل کا واحد ساتھی ہے اور وہی میرا دوست ہے، یار، غمخوار، جو چاہیں کہہ لیں۔ غالباً ہر بات پر مجھ سے متفق نہیں ہوتا، لیکن میرے لیے اس کی محبت غیرمشروط ہے، اور میرے ہر عمل پر اس کی پسندیدگی میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں۔

ایسی کوئی تصویر، یہاں میں واضح کر دوں، حقیقت میں وجود نہیں رکھتی۔ میں اس قدر تنہائی پسند تھا کہ یہ تصویر کوئی کھینچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جی اسکول کے ساتھیوں کا میں نے ذکر کیا وہ تو اب مجھ سے علیحدہ کر دیے جانے والے ماضی کا حصہ بن گئے تھے۔ میکس اور میں چرنووچ کے نواحی دیہات میں کسی آوارہ گرد جوڑے کی مانند رلتے پھرتے۔ اخلاقی لحاظ سے بھی تھوڑی سی آوارگی ہمارا شعار تھا۔ ہم دونوں کے درمیاں اس بات پر ایک خاموش اتفاق رائے تھا کہ کوئی بھی پالتو مرغ جو اپنے گھر کے کابک سے کچھ دور تک چلے جانے کی جرأت کرے، شکار کے لیے عین مناسب ہے۔ اسی طرح جوتی ہوئی زمیں کی سلوٹوں میں چوہوں کے پیچھے دوڑتی بلّی پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ بلّیوں سے میری شدید دشمنی تھی۔ کیوں‌کہ، جس بات کا مجھے بہت قلق تھا، میکس، دوسرے قابلِ ستائش اوصاف کے باوجود، خونخوار کتا نہیں تھا۔ وہ اپنے شکار پر دبوچ وار حملہ تو کرتا لیکن اگر شکار مقابلے پر آمادہ ہو جاتا تو ناک پر ذرا سا کھرونچا کھا کر ہی وہ دم دبا کر واپس دوڑ پڑتا اور میری ایڑیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہوا کمال بےہمتی سے چیاؤں

چیاؤں کرنے لگتا۔ میں خود کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتا تھا کہ غالباً وہ ابھی پورے سِن کا نہیں، اور اس سے میری توقعات غیرحقیقی ہیں۔ ویسے میرے "غیرسیاسی کوٹ" کی جیب میں ہمیشہ ایک غلیل اور سیسے کی گولیاں ہوتی تھیں۔ میرا نشانہ میلوں میں تماشا دکھانے والے پیشہ ور نشانچیوں کی طرح بےخطا تھا۔ کیسا ہی طنطنے کا بلاؤ ہو، جب اس کی کھوپڑی میں پہلی کے دانے کے برابر سیسے کی کنکری لگتی تو چکرا کر گر جاتا۔ میکس کو پھر آسانی رہتی۔

اب میرے گھر میں کتے اور بلیاں پُرسکوں بقائے باہمی سے رہتے ہیں۔ لیکن زندگی کے اس دور میں ان دونوں کی دشمنی کو میں فطرت کا قانون سمجھتا تھا، اور کتوں سے محبت کرنے کا شاخسانہ تھا کہ بلیوں سے نفرت کی جائے۔ میں ایک ایسے شخص کا بیٹا تھا جس کی زندگی کا مرکزی نقطہ ہی شکار تھا۔ شکار کی جان نکالنا میرے نزدیک اسکول کے مدرّس کے لیے ریاضی کے اصول جیسی عام، منطقی بات تھی۔ پھر یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ شکارگاہوں میں بلّیاں محض درد سر ہوتی ہیں۔ مگر پالتو مرغوں کو میں دانستہ، ایک ضد سے مارتا۔ میں، جس کی تربیت کھیل میں شرافت کے سخت ترین اصولوں کے مطابق ہوئی تھی، مرغی چور بننے میں ایک پُرلذّت لطف محسوس کرتا۔ شکار کے اصولوں کی خلاف ورزی کر کے ایک طرح سے میں اپنے باپ کے نام میں بٹّا لگاتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے ناکارہ ہونے کا احساس دلانے کے لیے جو سزائیں کافی غوروخوض کے بعد مجھے دی جا رہی تھیں، ان میں یہ بھی شامل تھا کہ مجھے اپنے باپ کے ساتھ شکار پر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ لڑکپن کے اوائل ہی سے میں گرمیوں اور بہار میں موسمی گردشوں کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تفریحی تقریبات کی سرخوشی میں ہمیشہ شامل رہا تھا۔ یہ شکاری مہمّات ہوتی تھیں جن کی ہر موسم کی اپنی خصوصیت تھی۔ ایسٹرنائیڈ پر جنگلی مرغوں کی تلاش اور گرمیوں کی تعطیلات میں ہرنوٹوں کا تعاقب۔ بعد میں ذرا بڑا ہو جانے پر مجھے سالانہ شکاری مہم کے اہم ترین حصے میں ساتھ لے جایا جانے لگا تھا۔ گرمیوں میں ہرنوں کی جُفتی کا زمانہ ہوتا یا سرما میں جنگلی سؤر کے شکار کا، اس تفریح کے دروازے مجھ پر بند کر دیے گئے تھے۔ اب میں صرف دوڑتا ہوا سیدھا چرنووچ پہنچ سکتا تھا جہاں دیہات کے آرپار بےمقصد گھوموں۔ گھر پر اس گم گشتہ لطف کی یاد میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ میں اس یاد سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا جو شکار کے موقعے پر جنگل کے مناظر کی تصویریں بن کر پوری قوّت سے میرے جی جاں کو کھینچتی رہتی۔ کسی طرح جنگل میں ہر چیز دوبارہ سبز ہو جاتی تھی، مرغِ سیہ کی جُفتی کی پکاروں سے جنگل کیسے گونجتا تھا۔ گرمیوں کی اوّلیں حرارت میں جنگلی بکروں کی کلیلیں، اور ہر طرف پتنگوں کی زن زنابٹ سے جنگل کی فضا میں تھرّاہٹ، اس برس یہ سب لطف میرے لیے ممنوع تھے۔

تازہ پگھلی ہوئی برف سے میرے قدموں تلے نرائی کی زمیں ابھی نم ہوتی۔ چشمے کے

Scanned with CamScanner

سارے پیڑ پھلوں کے درختوں میں شگوفے دمکنے اور انگلیوں پر گنا جا سکتا کہ بہار میں اب کتنے دن رہتے ہیں۔ جلد ہی ان کلیوں کے رویں‌دار نرم پھول بن جانے والے ہوتے، میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ آسمان پھر نیلا پڑ جائے گا، اور بہار کے بادل اس پر سپید، گیلی دھاریاں ڈال دیں گے۔ ہر جگہ کوئل کوکے گی، جب کہ میں اپنے احساسِ جرم کی بھاری زنجیر سے بندھا رہوں گا۔ یہ بھاری زنجیر صرف نفسیاتی نہ تھی کہ میں اچھا لڑکا نہیں ہوں؛ اپنے ساتھ مَیں نصاب کی کتابیں بھی قیدی کے ٹخنوں سے منسلک بھاری لوہے کے گولوں کی طرح اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ وہ نصاب تھا جس کا مطالعہ مجھ سے رہ گیا تھا۔ ہر روز میرے کانوں کو وہی یکساں راگنی سنائی جاتی تھی کہ اگر میں خزاں میں ہونے والے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو میری گزشتہ کوتاہی کو معاف کر دیا جائے گا، اور یہ کہ دنیائےعلم میں میرے امکانات کی بحالی کا یہ آخری موقع ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس کامیابی کا اصل نتیجہ یہی نکلے گا کہ مجھے تعلیم کے لیے دور بھیج دیا جائے گا۔ میں گھر سے، اپنے من پسند دیہات سے، شکار سے اور اپنے شکاری کتے میکس سے جدا کر دیا جاؤں گا۔ اس کے باوجود میں اپنی عزم کر چکا تھا کہ امتحان میں ہر حال میں کامیابی حاصل کرنی ہے خواہ اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔

"کچھ بھی کرنا پڑے!" لیکن افسوس، آخر بندہ بشر کیا کر سکتا ہے؟ مطالعے کے لیے کمرے میں بیٹھے ہوئے مَیں آمدِ بہار کی ہوا کی آواز سن سکتا تھا جو درختوں کی بےبرگ، شیشے کی طرح شفاف برف میں بلّور بنی شاخوں میں کھل کھلاتی پھرتی اور کبھی سرمئی آسمان کے ریشم میں کستی ہوئی سی ٹہنیوں میں سرسراتی۔ مجھے غروبِ آفتاب پر کوئل کے بوکھلانے کی کوک بھی صاف سنائی دیتی۔ گرتے ہوئے قطروں کی ٹپ ٹپ، درختوں تلے جنگلی جھاڑیوں میں سوکھے پتّوں میں چوہوں کی کھٹ پٹ، یہ سب آوازیں میرے کانوں سے ٹکراتیں۔ یہ وہی تو آوازیں اور آہٹیں تھیں جو جنگل میں گھات لگائے شکاری کو چونکا دیتی تھیں۔ میں نصاب کی کتابوں کے سامنے بیٹھا رہتا اور ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آتا؛ سادہ ترین عبارت میرے سر پر سے صاف گزر جاتی۔ شکاری مہمّات کے نعم البدل کے طور پر میں نے اپنے پیاسے تخیل کے سارے اشتیاق اور تن دہی سے شکار کے موضوع پر ادب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی بغیر کسی شعوری کوشش کے میں نے فرانسیسی میں گاستاں دفوا کی طبع زاد کتابیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن اس کارنامے پر میری تعریف نہیں کی گئی، بلکہ یہ سمجھا گیا کہ میں کندذہنی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض بدنیتی کے باعث نصابی کتابیں پڑھنے کا فرض ادا نہیں کرتا۔ اس بات نے میرا ایسا جی کھٹا کیا کہ میں نے قدیم فرانسیسی عبارتوں کو سمجھ کر مطلب نکالنے کا کام ترک کر دیا۔ پھر میں کچھ بھی نہیں کرتا تھا، بس دن بھر کھلی ہوا میں آوارہ پھرتا۔ میرے دل کی گہرائیوں میں اُفسکشنو تھا۔

یہ میری اپنی اصل صورتِ حال سے جنگ تھی، اور اس قسم کی نظریاتی، تقریباً کتابی

اختلافات کی جنگ کا آغاز و انجام اور دیگر تفصیلات کس قسم کی ہوتی ہیں، اس بات کو سب ہی جانتے ہیں، اس لیے اس سلسلے میں مزید کچھ بتانا غیرضروری ہے۔ قصہ مختصر، اس صورتِ حال سے نجات کا دروازہ مجھ پر کچھ رشتےداروں کے ذریعے وا ہوا۔ یہ ایک پختہ عمر کا بےاولاد جوڑا تھا جس نے میرے بارے میں گلےشکووں کو وقتی طور پر اختتام پذیر کر دیا۔ انھوں نے موسمِ گرما کے دوران اس نزاعی لڑکے کو اپنے پاس رکھنے کی پیش کش کر دی۔

میرا سارا کچاچٹھا چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی کے گوش گزار کر دیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ میرے والدین کا مقصد کچھ اور بھی ہو۔ یہ لوگ صاحبِ حیثیت تھے اور ہم لوگوں سے زیادہ قریبی ان کا کوئی دوسرا رشتےدار نہیں تھا۔ یہ لوگ دیہات میں رہتے تھے۔ جنوب مشرقی یوروپ کے دریائی خطّوں کے یہ دورافتادہ قصبہ جات اسی طرح کی چند جاگیروں کے باعث تہذیب سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ حالاںکہ یہ بات بھی اہم تھی کہ اس وسیع وعریض علاقے میں جو تہذیب و تمدن تھا وہ کس "قسم" کا تھا۔ اس تہذیب میں ہمیشہ کوئی قابلِ ذکر ہم آہنگی نہیں ملتی تھی اور نہ ہی اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ یہاں کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں تک کی زبان، فنِ تعمیر اور طرزِ بودوباش میں مشرق اور مغرب کی گرہ بندی سی تھی۔ مگر میں تو وہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا، اس لیے مجھے اس قسم کی کوئی توقع نہیں تھی کہ جہاں میرے یہ رشتےدار رہتے ہیں وہاں شہرپناہ کی بلند دیوار کے عقب میں مدوّر طاقچوں اور نوک دار برجھیوں سے مزیّن نادرِ روزگار عمارتیں ہوں گی اور ناؤں بال کی چورنگی پر قطعات کے چوگرد سنگِ خارا کی دائرہ دار محرابیں تعمیر ہوں گی۔ نہ میں اپنے چچا اور چچی کو ایسا نوابی جوڑا سمجھتا تھا جو مشرقی یوروپ کے ممتاز فنِ تعمیر کی تصویروں جیسے کسی علاقے پر چھا جانے والے، عشق پیچاں کی بیلوں سے ڈھکے کسی محل میں رہائش پذیر ہو۔

میرے رشتےدار جس قصباتی آبادی میں رہتے تھے، اور جہاں وہ، بر سبیلِ تذکرہ، دوسرے باسیوں کو ملازمت فراہم کرنے والوں کی صفِ اول میں تھے، براعظم یوروپ کی نوآبادیاتی سرحدوں پر ایک بستی تھی، ایک ایسی آبادی جسے گویا مختلف تہذیبوں کی اڑتی ہوئی دُھول نے جنم دیا تھا اور اسی طرح ایک دن اسے مٹ جانا تھا۔ خصوصاً رات کے وقت اس بستی کی جانب بڑھتے ہوئے، تاروں کی چھاؤں میں اس کی تنہائی جی محسوس دیتی تھی۔ ایک ہموار سطح والی پہاڑی پر، جہاں دریا خم کھاتا تھا، اس کی اکادکا روشنیاں ٹمٹماتیں۔ بکری کے پتلے دودھ جیسی ہلکی چاندنی میں جھلملاتی ریل کی پٹریاں جنھوں نے اسے باقی دنیا سے باندھ رکھا تھا؛ اوپر وسیع آسمان اور نیچے بےکراں زمین کی اتھاہ تاریکی کے مدمقابل انسانی وجود کی یہ علامت ایسی بےجگری سے اپنے اثبات کے لیے کوشاں رہتی جسے دانش مندانہ نہیں کہا جا سکتا۔ منظر شگال کی کسی پینٹنگ کی مانند تھا، جذباتی اور تکلیف دہ اور

Scanned with CamScanner

جب کسی کی روح میں اسکشنو سمایا ہوا ہو تو یہ منظر دل شکنی حد تک خوبصورت دکھائی دے سکتا تھا۔

دن کے اوقات میں یہ قصباتی شہر اس قسم کی شعریت سے زیادہ تر محروم رہتا۔ قصبے میں ایک گنوارُو صدرعمارت تھی، اور چند آڑے ترچھے راستے جو چلنے والوں کے قدموں سے زمین کی چکنی مٹی پر بن گئے تھے اور جن کے دوطرفہ سادہ مکانات کھڑے تھے۔ ان میں چند ایک گھروں میں باغیچے تھے جیسے کہ گاؤں میں ہوتے ہیں، اور بعض ننگے بچے تھے۔ ان کی دیواریں دھات کی چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اِدھر اُدھر گڑھوں کے کناروں پر گوکھرو اور بابونے کی جھاڑیوں کی افراط تھی۔ ببول کی جھاڑیوں میں، باڑھوں سے اوپر چڑیوں کے چہچہاتے جھنڈ کھیتوں کے کیتوں اور اصطبلوں کے سامنے پڑے گوبر کے ڈھیر پر بھوسے کے گچھوں میں ایک دوسرے کتھ جاتے۔ بیلوں کے ذریعے کھینچی جانے والی گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات، موسم کی مطابقت سے، دھول یا کیچڑ میں گہرے گہرے کٹے ہوتے۔ جہاں یہ نشانات ایک دوسرے سے جا ملتے تھے وہاں مرکزی شاہراہ پر ٹاؤن ہال کی عمارت شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑی تھی، جس کے سامنے والی دیوار پہلی سیڑھی سے لے کر چھت کے پرنالوں تک اشتہاروں اور اعلانات سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ٹاؤن ہال بلدیہ کی انتظامی عمارتوں کا نمائندہ نمونہ تھا۔ اس کی نوک دار پرچھتی پر ایک چپٹا سا منارہ تھا جس کے روشن دان سے قومی تعطیلات کے موقعوں پر ایک جھنڈا لٹکا دیا جاتا تھا۔ پاس دیہاتی بازار کی زمین پر اُتھلی بجری بچھی تھی۔ چوراہے پر گاہکوں کی منتظر تین دکانیں آنکھ مچولی سی کرتی دکھائی پڑتیں۔ بازار لگنے کے دنوں میں تندور اور اس سے ملحق چھوٹا سا کلال خانہ کسانوں سے کھچاکھچ بھر جاتا، جو گاڑیوں میں بھر بھر کر دیہاتوں سے سؤر، بچھڑے، مرغیاں اور سبزیاں فروخت کے لیے لاتے تھے۔ سڑک کے چھوکروں سے ذرا سے فاصلے پر سرخ شیشے کی ایک صلیب دواساز کی دکان کی نشان دہی کرتی۔

قصبے کی مرکزی شاہراہ کے اختتام پر، جہاں اس کا مختصر پس منظر کھلے میدانوں میں گھل مل جاتا تھا، باڑھوں سے گھرا زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ یہاں برسوں سے رکھ کر فراموش کی ہوئی چوبی صندوقچہ نما ٹوکریوں میں درجنوں آوارہ بلّیاں سوتی رہتی تھیں۔ اس کے عقب میں سرخ اینٹوں سے بڑی نزاکت کے ساتھ جوڑی ہوئی ایک نہایت دلچسپ عمارت نظر آ سکتی تھی، چونکا دینے والی، دیوانی سی، بُرجیوں اور کنگروں، چھجوں اور طاقچوں سے مزیّن۔ اس کی چھت دھات کی چادر کی تھی جسے ایسے بنایا گیا تھا گویا کسی نیپکن کو نوک دار پتّوں والے پھول کی شکل میں تہہ کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ ہر تہہ کی سلوٹ پر اژدہوں کے سروں والے گارگوایل (قدیم چرچوں پر بنائے جانے والے عفریت اور بھوت پریتوں کی شبیہیں) کندہ تھے۔ چھت چھوٹے چھوٹے متعدد مرغابی بادنما اور دوسرے پُتلوں سے سجی تھی۔ یہ ڈاکٹر گولڈمین کا "وِلا" تھا، اور ۱۸۹۰ کے لگ بھگ مروّج تعمیراتی

رومانیت کا ایک دلچسپ نمونہ تھا۔ اپنے گھر پہلی بار آنے والے مہمانوں کو چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی اس عمارت کا دیدار بطور کسی عجوبے کے کراتے تھے۔ قصبے میں ایک آرمینیائی کیتھولک کلیسا کی عمارت تھی جو بچوں کے کھلونوں کے ڈبّے کی طرح سادہ تھی۔ یہودیوں کا ایک گنبددار معبد تھا۔ ان کے علاوہ قصبے میں واحد قابلِ دید عمارت اورتھوڈوکس چرچ کی تھی جس کے مینار پر پیاز کی ساخت کا حسین گنبد تھا اور جو صنوبروں کے جھنڈ میں واقع تھی۔ قصبے میں یہ سب عمارتیں اپنے عدم آہنگ سے بےخبر تقریباً بےشرمی سے ایک دوسرے کے منہ سے منہ بھڑائے کھڑی تھیں اور ان سب پر تنا ہوا آسمان انسان کی اُتھلی خودنمائیوں سے بےنیاز مشرق میں کوٹھڑی اسٹیپوں، اور اس سے بھی وَرے تبّت تک کشیدہ تھا۔ عام دنوں میں یہ جگہ بالکل ویران رہتی تھی۔ صرف جوؤں بھرے یہودی بچوں کی چند ٹولیاں غبارآلود سڑکوں پر چڑیوں کے پیچھے ماری ماری پھرتیں۔

موسم گرما میں سورج بےرحمی سے چھتوں کو جلاتا اور فضا میں تھرّاتی ہوئی دھندلاہٹ چھائی رہتی۔ سردیوں میں تن بدن میں کانٹوں کی طرح چبھنے والا پالا اس کائنات کو اپنے سپید چمنےکی گرفت میں لے لیتا۔ برف کی قلمیں گھروں کے چھوٹے چھوٹے دریچوں پر سلاخوں کی صورت جمی رہتیں، اور ساحلی مرغزاروں کے درخت بلّور میں ڈھلے نظر آتے۔ کبھی کبھی اس سادہ ورق پر اچانک کوئی رنگ برنگی تصویر ابھر آتی، مثلاً کسی یہودی کا جنازہ جاتا ہوا دکھائی دیتا اور حیران کن تاریک پھولوں کی مانند سیاہ چوغوں میں ملبوس یہودی لومڑ کی سرخ سمّور کی ٹوپیاں اوڑھے، اپنے ہم مذہبوں کے لیے مخصوص قبرستان میں بیدِ مجنوں اور صنوبر کے درختوں کے نیچے، قبروں کے ترچھے دھنسے ہوئے کتبوں کے درمیان نمودار ہو جاتے۔ ان میں بعض خمیدہ کمر ہوتے اور ایسی تیجی بھرّائی ہوئی آواز میں بولتے جیسے ابھی گلا صاف کرنے والے ہوں۔ ان کے بالوں کے لمبے پٹھے ہوتے اور سفید یا گہری گتھی داڑھیاں۔ بعض کی آنکھیں پھٹی پھٹی ہوتیں۔ جب وہ سر کو پیچھے کی جانب خم کر کے گفتگو کرتے تو ٹوپیوں کا سرخ، شعلہ رنگ سمور ان کے چہروں کے گرد حاشیہ سا بناتا۔ توندیں آگے کو نکالے، وہ اونچی اونچی آوازوں میں گفتگو کرتے۔ یا کبھی اورتھوڈوکس خانقاہ میں چاندی کے اُبھرواں نقش ونگار والے تابوت میں ابدی نیند سوتے سینٹ کی برسی کے موقعے پر عمارت کا احاطہ شوخ کشیدہ کاری سے مزیّن بلاؤز، بھیڑ کی کھال کی صدریاں اور ڈوری دار جوتے پہنے کسان مردوں اور عورتوں سے بھر جاتا۔ گلنار کے پھول ان کسانوں کے کانوں کے پیچھے آویزاں ہوتے یا ان کے سپید دانتوں میں دبے رہتے۔ راہبوں کے درود کی ملی جلی آوازیں، اور نزدیک ہی یہودیوں کے معبد میں طالب علموں کی بلند آواز میں تلمود کی تلاوت وقفے وقفے سے سنائی دیتی۔

چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی کا گھر قصبے کے کنارے کسی نوابی جاگیردارانہ اقامت گاہ کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کا اندرونی دروازہ تو مقفّل ہو سکتا تھا مگر صدرداخلے کا بھاری

بھرکم، کوٹے ہوئے لوہے سے ساختہ گیٹ اور اس کے اندر داخل ہونے کے بعد بوڑھے کیکروں کی چھاؤں میں گاڑیوں کے لیے کشادہ راستا ہمیشہ ہر آنے جانے والے کے لیے کھلا رہتا۔ اصل رہائش گاہ کی عمارت کو ایک وسیع صحن اصطبلوں، گوداموں، کھیتی باڑی سے متعلق کمروں اور کوٹھریوں سے، اور ایک چھوٹی سی شراب کشید کرنے والی بھٹّی سے جدا کرتا تھا۔ عمارت کی پشت پر درختوں کے جھنڈ دور تک پھیلے تھے جن کی سرسراہٹ دن بھر فضا میں چھائی رہتی۔ اس سے پرے یہ مرغزار بتدریج دیہات کے کھلے میدانوں میں مدغم ہو جاتا تھا۔

میں اس جاگیر سے بچپن سے آشنا تھا۔ یہاں میں بالکل اسی طرح آرام سے رہتا جس طرح خود اپنے گھر میں یا کارپیتھیا کی شکارگاہوں کے بنگلوں میں (جہاں اب مجھے اپنے باپ کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی!) اجنبیت محسوس نہ کرتا تھا۔ اس سے قبل کئی بار میں اپنے والدین کے ساتھ یہاں مہمان رہ چکا تھا۔ اُس زمانے میں میرا قیام اتنا مختصر ہوتا تھا کہ میرے میزبان غالباً صرف اس سے لطف اندوز ہی ہو سکتے تھے۔ میرے یہ رشتےدار مجھے کافی پسند کرتے تھے۔ جب میری تربیت کی ناکامی کا سوال اٹھا تو انھوں نے نہ صرف میری ناکامی پر تعجّب کا اظہار کیا، بلکہ یہ امکان بھی پیش کیا کہ عین ممکن ہے میری نامرادی میں قصور اس فرسودہ طرزِ تعلیم کا ہو جو اب بالکل ازکاررفتہ ہو چکا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ بھاری بھاری چھاتیوں اور نرم گرم بلاؤز اور جیکٹ پہننے والی چچی سوفی میں مجھے اپنی ماں سے زیادہ مادرانہ گرمی نظر آتی۔ میری اپنی ماں کی وضع قطع میں نفاست اور شاعرانہ جذباتی شدّت کا ایسا امتزاج تھا کہ انھیں چھُونے کا خیال بھی گھبرا دیتا تھا۔ زندگی کے اس اوّلیں دور میں اپنے باپ کی روزافزوں رنجیدہ طبعی اور شکستہ دل روزخوابیوں اور شکار کے لیے دن بدن بڑھتے ہوئے سودائی پن کے مقابلے میں چچا ہیوبرٹ کی شخصیت مجھے ایک مخصوص توازن اور ٹھوس پن کی علامت کے طور پر نظر آتی، اس لیے ان کی شخصیت بھی میرے لیے اپنے باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ سکون بخش تھی۔

دوسری طرف یہ بھی سچ تھا کہ چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی جس مخصوص دنیا میں رہتے تھے وہاں نظم اور آہنگ جیسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی تھی۔ سابقہ سلطنت ہیپسبرگ کی مشرقی سرحدوں پر (جو کبھی سلطنتِ روم کا حصہ رہ چکی تھی) یہ دورافتادہ بستی ایسے علاقے میں تھی جہاں دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں (یا رگڑ کھاتی تھیں)۔ اس سرزمین کو مغربی تہذیب نے ایک اُتھلے بالائی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہ دیا تھا۔ ایک طرح سے یہ سائنس اور ٹکنولوجی کے آڑے مٹے نشانوں کی بھی نوآبادی تھی جس نے یہاں کی قدیم ثقافت کو تارتار کر دیا تھا۔ اس چھچھلتے ہوئے حملے کی مدافعت کرنے والی مقامی خصوصیات تھیں، جیسے مشرقی تقدیرپرستی جو بےبسی کے احساس میں گندھی ہوئی تھی، اور اپنی بربادی کی خاموش تماشائی تھی۔ اس پس منظر میں چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی، جو ایک دوسرے کے ہم زاد نظر آتے، ایک ایسے مخصوص طبقہ' اشرافیہ کی نمائندگی

کرتے تھے، جو ہمیں ویلز یا جٹ لینڈ، یا لمبارڈی میں بھی مل سکتا تھا۔ یہ طبقہ بہتر اوصاف سے عاری نہ تھا، مثال کے طور پر میرا میزبان جوڑا۔ یہ دونوں نہ تنگ نظر تھے نہ ان کی تعلیم میں کمی تھی۔ بعض معاملوں میں تو ان کی روشن خیالی حیران کن تھی، لیکن آرام دہ حالات میں محفوظ زندگی نے، جس میں ہر فرد کے فرائض واضح تھے اور ہر کام تواتر سے انجام دیا جاتا تھا، ان کے خیالات اور جذبوں، ان کی زبان اور روّیے میں ایک ایسی سادگی پیدا کر دی تھی جو کسی کو سادہ لوحی بھی نظر آ سکتی تھی۔ پھر بھی، اگر کوئی گہرائی سے دیکھے تو اسے ان دونوں میں کچھ متذبذب سی گرم جوشی اور مسائل کے ادراک کی انسانیت سے مملو صلاحیت بھی نظر آ سکتی تھی۔ یہ وہ اوصاف تھے جو زیادہ متمدّن دنیاداروں میں عام طور پر عنقا ہوتے ہیں۔

یہاں کوئی مجھے پڑھنے کی ہدایت نہیں کرتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ میں اپنی مرضی سے امتحان کی تیاری کر لوں گا۔ مجھے میکس کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مل گئی تھی۔ پہلے جب میں اپنے والدین کے ساتھ یہاں آتا تھا تو رہنے کے لیے مجھے چچی سوفی کے کمرے سے ملحق ایک کمرہ دیا جاتا تھا۔ لیکن اس بار میری رہائش کے لیے "ٹاور" کا انتخاب کیا گیا تھا۔

یہ "ٹاور" کوئی سچ مچ کا مینار نہیں تھا۔ یہ تو شراب کشید کرنے کی بھٹّی کے اوپر عارضی قیام کے لیے مخصوص کیے جانے والے چند کمرے تھے، ایک قسم کی برساتی۔ اس کے اندر جانے کا راستا باغ میں کھلتا تھا جہاں سے کافی ڈھلوان سیڑھیوں کے ذریعے اس کے دروازے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ موسم سرما کی مشہور شکاری مہمّات کے زمانوں میں چچا ہیوبرٹ کے شکاری ساتھی، خصوصاً کنوارے، چھڑےچھانٹ مہم جُو اور کھلاڑ دوستوں کو یہیں ٹھہرایا جاتا تھا، جن کی بلانوشی کی داستانیں زبان زد تھیں۔ بقیہ سال یہ خالی پڑا رہتا۔ استعمال نہ ہونے کے باعث ان کمروں میں گرد اور بند جگہوں کی مخصوص مُسکی بوئی بُو پھیلی رہتی۔ چچا ہیوبرٹ کے دوستوں کے قیام اور اس جگہ کے بارے میں، مَیں نے اندازہ لگایا کہ کچھ خاص حکایتیں گردش کرتی رہتی تھیں، کچھ ایسی باتیں جن کا بچوں کے سامنے صرف اشارتاً ذکر کیا جا سکتا ہو۔ گو سب جانتے تھے کہ یہ مذاق اور چٹکلے تھے اور زیادہ تر حاشیہ آرائیوں پر مبنی تھے، پھر بھی اگر اور کسی سلسلے میں نہیں تو ان واقعات کا ذکر کم ازکم رشتہ' ازدواج میں چچی سوفی کی مثالی قوتِ برداشت کے ثبوت کے طور پر اکثر چل نکلتا۔

ٹاور مجھے رہنے کے لیے کیا ملا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں راتوں رات ہاتھ بھر قدآور ہو گیا۔ یہاں قیام کر کے گویا مَیں پورے مردوں کی صحبت میں وارد ہو گیا تھا۔ وہ تکلیف دہ نگہداشت جو مجھے اپنی ماں اور اتالیقوں کی جانب سے مستقل ملتی رہی تھی، اور جس نے بعد میں بورڈنگ روم کی سخت پابندیوں کی صورت بدل لی تھی، ٹاور کی فضا

میں یکسر مفقود ہو گئی تھی۔ میرے رونگٹوں میں یہ احساس سرسراتا کہ ان کمروں میں پوری عمروں کے مرد رہے ہیں۔ مرد، بچے یا لڑکے نہیں، پوری عمر کے مرد، جو آزادی سے جو چاہیں کرتے ہوں گے، خودمختار ہوں گے، اپنی زندگی کےخود مالک ہوں گے۔ انھیں ہتھیاروں کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا، وہ سورما اور جنگ جُو تھے، اور ان کی درشت دنیا میں اب مَیں رہ سکتا تھا اور سانس لے سکتا تھا۔ شکار کے زمانے میں ان کے قیام کا مکمّل بیولا مَیں اپنے رُوم رُوم میں محسوس کرتا۔ بند کمروں میں سگار کی باسی مہک تو موجود ہی تھی، باقی کا منظر میرا تخیل خود تراش لیتا۔ موسم سرما کی گہری سُرمیلی صبحوں میں آتش دان میں چٹختی ہوئی آگ، علی الصّباح حویلی اور احاطے میں شکار کی تیاری کی چہل پہل، شکاری کتوں کی پھڑکتی ہوئی کیاؤں کیاؤں، تیز کافی، ٹوسٹ، تلے ہوئے سؤر کے گوشت اور انڈوں کی اشتہاانگیز مہک گویا شکار کے دن کا اعلان کرتی ہوئی؛ ایک ایسا دن جس کا اشتیاق سے انتظار کیا جاتا اور اشتیاق سے جسے جیا جاتا۔ ایک خودفراموشی اور دھڑکتے ہوئے امکانات کا دن، ہر لمحہ حیرت انگیز، خوں گرماتی ہوئی توقعات سے مملو لمحات، سرعت سے کیے گئے فیصلے کی سنسنی، اور افق پر رنگوں سے مصوّری کرتی ہوئی ساعتیں جو سحر کی گلگوں، سیپی کے اندرونی حصے جیسی صاف ستھری کلیوں کے منظر کو شام کے خوں‌آشام رنگوں میں ہولے ہولے تبدیل کرتی جاتیں۔ شکار ختم ہو چکا ہے، ہر سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں تازہ، سرد، چبھتی ہوئی ہوا بھر رہی ہے، رگوں میں خوں تیزی سے دوڑ رہا ہے، شکاری گھر لوٹ رہے ہیں، ان کے صبارفتار رہواروں کے تلوے چٹختے جا رہے ہیں، ہوا سے رخسار تمتما رہے ہیں جب کہ شکاری بھاری اونی کپڑوں میں‌خوب گرم ہیں۔ اس منظر کو رات آہستہ آہستہ اپنی سیاہ قبا میں ملفوف کرنے والی ہے اور دنیا کو اوّلیں تاریکی سے بھر رہی ہے۔ اس ملگجی روشنی میں لوٹتے شکاریوں کے گراںڈیل پیکر ابھرے چلے آ رہے ہیں۔ گھوڑوں کے جسموں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ دوڑتے ہوئے وہ اپنی دُمیں اٹھاتے ہیں اور ان کی گلابی مِقعدوں کی پھیلتی چٹّنوں سے دھواں‌دھار لِید گر رہی ہے جو رہوار کی چھوڑی ہوئی لکیروں کے درمیان بھوکے پرندوں کی غذا بن رہی ہے۔ یہ کس قدر مسحورکن پراسرار دنیا تھی! اس میں ستاروں کی جگمگاہٹ تھی، خلا کی سی بےکراں وسعت اور برفیلاپن، اور گردوغبار اور پسینے سے بھری زندگی۔ "آج تمھارے ہاتھوں نےخون بہایا ہے، اس لیے زندگی تمھارے رگ وپے میں بجلی کی طرح دوڑ رہی ہے۔" شکاریوں کی گھر کی جانب پُرشور واپسی، گھر میں تہواروں کی سی رونق، شکاریوں کے لبوں پر خانوں خانہ کی نسائیت بھری مہمان نوازی کے لیے مناسب تعریفی کلمات۔ انگلیوں کے درمیان پیالے میں ہلکی شراب کی جھلملاہٹ، گرم پانی لانے والی خادمہ کے سرینوں پر پھرتی سے بھری چٹکی، غسل میں بدن کے ہر عضو کے پُرسکوں ہو جانے کی لذت، صاف تازہ تولیوں کی مسرت، اور رات کے طعام کے لباس کے لیے ہلکے پھلکے جوتوں کا آرام، رنگارنگ

طعام، کئی قسم کی شرابیں۔ سینکڑوں قتل کیے ہوئے جانداروں سے منہ تک بھرے تھیلے، جمے خوں سے لتھڑا، اکڑا ہوا، روپےدار مالِ غنیمت، جو چند ساعت قبل تک زندگی سے سرشار تھا۔ روشنی اور سایوں کی رواں بازی گری، مقتول جانوروں کی پتھرائی آنکھیں جو مشعلوں کی روشنی میں اور بھی بےنور نظر آتیں، رات کی سرد دھند میں ڈوبتی ہوئی شکاری نقاروں کی آواز۔ کھانے کے بعد کوہیاک کا دور، مردوں کی باتیں، جیسے دن بھر کے واقعات کو دوبارہ جی رہے ہوں۔ مذاق، چھیڑچھاڑ، اونچے اونچے گونج دار قہقہے، یہ سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ بہت جلد یہ میری زندگی بن جائیں گے، میرا وجود بن جائیں گے۔

اس بات پر میں اور بھی مسرور تھا کہ مردوں کی اس دنیا میں کھلنڈراپن تھا جو اس خیال کی نفی کرتا تھا کہ بچپن کے حیران کی "زندگی کیا ہے؟" کے خواب سے نکل کر آپ ایسی حقیقی زندگی میں داخل ہوتے ہیں جس میں ضروری اور اہم کام کرنے ہوتے ہیں، اور فرائض کو ادا کرنا ہوتا ہے جس سے بالغ پن کا پورا دور سنجیدہ ذمےداریوں سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری بوریت اور بےکیفی کی ابتلا کا دور اب ختم ہوا۔ بالآخر میں آزادی اور خودمختاری اور مساوات اور خوش باشی کے دوسرے کی زندگی تک رسائی حاصل کر چکا ہوں۔ گھر میں جو سازوسامان فالتو یا غیرضروری سمجھا گیا تھا وہ ٹاور میں رکھ دیا گیا تھا۔ ٹاور کا فرنیچر عام استعمال ہونے والے روایتی فرنیچر پر کسی ہوئی پھبتی معلوم ہوتا تھا۔ بڑی کے سینگوں والے صوفے اور کرسیاں، رنگارنگ، پیوند لگی گدڑی جیسا قالین، ہاتھی دانت کی کھوپڑی جو پیپرویٹ کا کام دیتی، تاش کے کھلے ہوئے پتّوں اور ان پر دھرے سگریٹ کے ٹوٹے کی شکل کا ایش ٹرے، یہ سب کسی آرٹسٹ یا طالب علم کے کمرے کا سامان نظر آتے۔ آتشدان کے سامنے بڑے سے ریچھ کی سمور بچھی تھی جس میں ایک ریچھ کا سر بھی لگا تھا جو بالکل اصلی معلوم ہوتا۔ کارنس کی دیوار پر شیشے کا صندوقچہ آویزاں تھا جس میں گوم خطّوں کی غیرمعمولی حد تک بڑی تتلیوں کا ذخیرہ تھا۔ دیوار پر کسی رومی جنرل کی ٹرافی کی طرح ایک ایمبلم آویزاں تھا جس میں شکار کا سارا بکھیڑا موجود تھا، جال، شکار کے بگل، بندوقیں، شکاری تھیلے، قسماقسم کے چُھرے چاقو۔ میرے لیے ٹاور کا سارا سامان ایک بھرپور خوش باشی سے گزاری ہوئی زندگی کا مظہر تھا جس میں کھلنڈرےپن کی جبلّت نمایاں تھی۔ میرے لیے یہ ان مردوں کے احساسِ بلوغت کی روح تھی۔ اس کی خوش باشی اور کھلنڈرےپن پر اخلاقیات، فرض شناسی اور سخاوت جیسے اوصاف کا باریک حجاب تھا۔ تہ میں کسی بھی حد سے گزر جانے کی طاقت، سرخوشی، زندگی کا رس چوس چوس لینے کی طمانیت تھی، اور ایک عجیب خطرناکی، گویا یہ پورا بیولا شدید خطرات اور موت کے عین دہانے پر ڈولتا ہو۔

اس سے پہلے مَیں جب یہاں مہمان ہوتا تو مجھے چچی سوفی کے کمرے سے ملحق کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر آویزاں تصویروں میں جذباتی پن تھا، مثلاً پال

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے
ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner

اور کنواری مریم کی شبیہات۔ اپنی لڑکپن کی تنہائی میں مَیں ان تصویروں کی داستانوں کا بھی ایک خاموش ناٹک رچاتا رہتا تھا، لیکن مجھے تب بھی احساس رہتا تھا کہ یہ سب تو محض ادب ہے؛ میری اپنی زندگی میں ان کہانیوں کے واقعات اور موڑ کبھی نہیں آئیں گے۔ لیکن یہاں ٹاور میں دیواروں پر سورماؤں کے کارناموں کی تصویریں تھیں۔ تاریخی حکایات اور دیومالائی داستانوں نے دیواروں کو ڈھانپ رکھا تھا جیسے کاؤنٹ سیں ڈور کی مہمّات (یہ ذکر کرنا کوئی نہ بھولتا تھا کہ وہ شہزادی پالین کے والد تھے جو بنفسِ نفیس ہمارے اپنے چانسلر میترنیخ کی بہو تھیں)۔ ایک تصویر میں یہ مہاسورما کاؤنٹ ایک حسینہ سے یوں محوِکلام تھے کہ انھوں نے اپنے رہوار کو حسینہ کے دریچے پر چڑھا رکھا تھا۔ کاؤنٹ نے گھوڑے کو دریچے کی کگر پر گھٹنوں کے بل جھکا دیا تھا؛ یہ آسن اس درجہ دشوار تھا کہ لگتا تھا گھوڑا ان کی رانوں کے نیچے سے ابھی زقند بھر کر نکل جائے گا۔ اس کرتب میں کاؤنٹ کی گردن کا منکا ٹوٹ جانے کا نہایت حقیقی خطرہ موجود تھا، مگر کاؤنٹ اس خطرے سے قطعی بےنیاز، کامل سکون سے محبوبہ کے ساتھ ہم کلام تھے، اور دیکھنے والا جانتا تھا کہ اگر گھوڑا ان کے نیچے سے نکل جائے تب بھی وہ یوں ہی رکاب میں پیر پھنسائے، زین میں کسے ہوئے، ہوا میں سکون سے معلّق رہیں گے۔ اس فوق الانسانی جرأت، خطرات کے لیے استہزا بلکہ ایک لاابالی دعوت کا نچوڑ کمرے میں دوسری آرائشی اشیا میں بھی موجود تھا، جیسے جنگِ عظیم کی یادگاریں، توپ کے گولوں کے خول، بموں کے ٹکڑے، تلواریں وغیرہ، جو کمرے میں اِدھر اُدھر آویزاں تھیں۔

ٹاور میں گھنٹوں خاموش کھڑا مَیں گردوپیش کو تکتا رہتا۔ میں جیسے اس ماحول کے ذرّے ذرّے سے ابلتی ہوئی مکمل روح کو اپنی سانسوں اور نگاہوں سے چوس کر اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا جو میرے ذہن میں بالغ مردانہ پن اور مردمی کی جارح قوت کا نچوڑ تھی؛ جس میں لذت، خطرہ، موت، سب کچھ یکجا ہو گئے تھے۔ پر دماغ میں کبھی کبھی ایک سوال ضرور آتا تھا۔ یہ تو سمجھ میں آسانی سے آ جاتا کہ ٹاور کی دیوار پر اوہلانوں اور قازقوں کی خوں‌ریزی کی تصویروں میں مردانگی کی حسّیات پانا منطقی بات تھی؛ لیکن آخر یہ کیوں‌کر ہوتا تھا کہ ٹاور میں آویزاں چوبی چوکھٹے کے آئینے سے، اس کی ساخت، رنگ، لمس، ہر جز سے قوتِ مردانگی پھوٹتی محسوس ہوتی، جبکہ ہوبہو اسی ساخت، رنگ اور جسامت کا آئینہ چچی سوفی کےکمرے میں نزاکت سے مملو نسوانیت کا مرقّع بن جاتا تھا؟ اس کا کیا بھید تھا؟ مردانگی کا اصل جوہر، جس پر میں انگلی رکھ کر شناخت کر سکوں، آخر کیا تھا؟ میں کس طرح اس کو اپنے اندر سمو سکتا تھا؟ اس پُراسرار، ممنوعہ کیفیت میں بےتابانہ کیسےداخل ہو جاؤں؟ یہ سوچ سوچ کر میں دیوانہ ہو جاتا اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے باہر بھاگ جاتا۔

رفتہ رفتہ مجھے چچا بیوبی کے لڑکپن اور بچپن کے بارے میں معلومات مہیا ہونی شروع

ہوئیں۔ چچا بیوبی آج مردانگی کا پیکر تھے، مگر مجھے معلوم ہوا کہ ان کا بچپن اور لڑکپن، جو اس کرخت مردانگی کا پیش رو تھا، تھوڑی بہت جذباتی نسوانیت کے پہلو بھی رکھتا تھا۔ اس طرح مجھے چچا بیوبی اور ان کے شکاری دوستوں کے بارے میں خفیہ مذاقوں کے پس منظر کا مبہم سا اندازہ ہوا، گو میں اسے پوری طرح سمجھنے سے اب بھی قاصر تھا۔ چچا بیوبی سابق آسٹریائی کی حیثیت سے پروشیا سے دلی نفرت کرتے تھے، آسٹروہنگیرین سلطنت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور وسیع تر جرمنی کاخواب انھیں دل سے عزیز تھا۔ توبنجن یونیورسٹی میں اپنے طالبعلمی کے دور میں وہ وہاں کی ڈوئل کی انجمن کے سرگرم رکن تھے۔ چچا بیوبی ایک پکے یہودی دشمن تھے۔ وہ اپنے سیاسی رہبر فان شونرر کے پرجوش مقلّد تھے۔ یہ فان شونرر وہی موصوف تھے جنھیں ایک یہودی اخبار کے ادارتی دفتر میں گھس کر ہنگامہ مچانے پر (اس اخبار نے مارچ ۱۸۸۸ میں قیصر ولہلم اوّل کی موت کی غلط خبر پھیلائی تھی) قید اور خطاب کی ضبطی کی سزا بھگتنی پڑی تھی۔ میرے والد، اپنے خشک مزاج کے کمیاب لمحات میں، چچا بیوبی کو یہ واقعہ یاد دلانا کبھی نہ بھولتے۔ اور ان کا فقرہ کبھی اپنے نشانے پر لگنے سے نہ رہتا۔ چچا بیوبی اب بھی اس واقعے کے ذکر پر طیش میں آ جاتے، جس نے نوجوانی کے دنوں میں انھیں تقریباً آپے سے باہر کر دیا تھا۔ اور چچی سوفی ان کی تائید کرتے ہوے کہتیں، "آپ کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ بیوبی نے ناانصافی کو کبھی برداشت نہیں کیا۔"

میں دل ہی دل میں چچا بیوبی کی نوجوانی کے زمانے کو دوبارہ تخلیق کرتا۔ جی جان سے تصور کرنےکی کوشش کرتا کہ آخر وہ شعلہ بہ جاں جذبہ کیا ہو گا، وہ "زائٹ گیسٹ"، وہ مخصوص آریائی ذوقِ عمل جس نے پوری طرح حاوی ہو کر لپکتے شعلے کی طرح ان تمام دوسرےعناصر کو بھسم کر دیا تھا جن سے چچا بیوبی کی شخصیت کی ابتدائی تشکیل ہوئی ہو گی، کیوں‌کہ یہ بھی تو حقیقت تھی کہ چچا بیوبی کے خاندانی پس منظر کے مطابق ان کی پرورش میں آسٹریا کی قدیم مہذب حقیقت پسندی، مبالغے سے نفرت، روایات کا احترام اور ریاست سے وفاداری کی تربیت، یہ سب کچھ یقیناً شامل رہا ہو گا۔ یہ خصوصیات ان کے خون میں داخل رہی ہوں گی جو اس سرزمین کی دین تھا جہاں انھوں نے جنم لیا تھا اور پرورش پائی تھی۔ یہاں کے باسیوں کی معروف خصوصیات، بلقانی ہوشیاری اور حسِ مزاح، مشرقی دھیماپن اور ایک طرح کی آلکسی، یقیناً ان کے خمیر میں شامل رہی ہوں گی۔ کوئی آگ تھی جس نے ان خصوصیات کو جلا کر نابود کر دیا۔ میرے اندر یہ بےتابانہ تجسّس تھا کہ اس آگ کی جڑ کیا تھی، وہ چقماق کون سے تھے جن کی رگڑ سے یہ چنگاری پھوٹی۔ میرے شعور کی ایک زیریں رو ہمہ وقت اس کا کھوج لگاتی تھی، اور آخر ایک دن وہ مجھے مل ہی گیا۔ ایک کتاب میرے ہاتھ لگ گئی جس کا توجہ طلب نام "بائبل" تھا۔ اب یہ بتانا تو غیرضروری ہے کہ یہ مقدس بائبل نہیں تھی؛ یہ طالب علموں کے لیے مےنوشی کے وقت گائی جانے والی تندوتیز

Scanned with CamScanner

اور مختصر نظموں کا مجموعہ تھا، اس جذبے سے چھلکتی ہوئی شاعری جسے میرا ذہن خالص آریائی جرمنی جذبہ سمجھ سکتا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جرمن نسل سے ہونے کے باوجود، صدیوں سے ہم جرمن، نوآبادیاتی مہمّات کے نتیجے میں مشرقی یوروپ کے دورافتادہ قصبات کے باسی بنے ہوئے تھے اور ان گنت نسلوں سے وہیں رہتے آ رہے تھے۔ میری طرح کے لاکھوں لوگ ان نظموں کو اصل جرمنی کا جوہر اور روح ہی سمجھ سکتے تھے۔

ان دنوں بہار اپنے عروج پر تھی۔ برف پگھل رہی تھی اور تارہ پانی کی شوخ چشمے کلکاریاں مار کر ابل پڑے تھے۔ ویسا ہی تھا میری طبیعت کا خروش۔ "ہائنل" کی سرورق پر رنگین تصویر تھی جس میں طالب علموں کو دریائے راٹن پر کشتی رانی کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ جو لباس انھوں نے پہن رکھا تھا وہ تہواروں پر سپاہی آج بھی پہنتے ہیں۔ انھوں نے مزیّن سیاہ مخملیں جیکٹیں، چُست سفید پاجامے اور سر پر بغیر چھجّے کی گول ٹوپیاں۔ ایک طالب علم کشتی میں نیم دراز، باقی کشتی کھیتے، گیت گاتے ہوئے دریا کے دونوں اطراف پہاڑیوں پر قلعوں کے کھنڈر۔ یہ تھا جرمنی کے ماضی کا شکوہ، اس کے حال کا رومان، اور مستقبل کے شاندار امکانات۔ اور وہ لباس! وہ چست، چاق وچوبند لباس۔ پس یہ سب کچھ اس لباس کے پہندنوں اور تسموں میں سربستہ ہو چکا تھا، اور میں یہ لباس فی الفور خود پہن لینا چاہتا تھا۔ میں نے چچی سوفی سے مشتاقانہ فرمائش کی۔ بچاری نے پرانے کپڑوں کے صندوقوں کو مناسب کپڑوں کی تلاش میں کھنگال ڈالا۔ خوشی قسمتی سے باورچی کیپ کو یاد آیا کہ اس کے بہنوئی کے کاکی کی بھائی کے پاس کسی زمانے میں اس طرح کی وردی تھی! شاید اس کی بیوہ کے پاس کوٹ اب بھی پڑا ہو۔

باورچی کا بہنوئی قصبے کا لوہار بالر تھا۔ میری اس سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر میں پرانی رائفلوں کی گولیوں کے سیسے کو پگھلانے کے لیے اس کی دکان کے چکر لگایا کرتا تھا، اور شدید رشک کھا کر اسے اپنے دلچسپ کام میں غرق دیکھتا رہتا تھا۔ وہ سفید، کھولتے ہوئے سیسے کو چمٹی سے پکڑ کر بھٹی سے نکالتا اور اپنی کھردری، گٹّے پڑی ہتھیلی پر، بغیر ہاتھ جلائے کمال پھرتی سے حرکت دے کر سیسے کی ننھی ننھی کنکریوں میں تبدیل کر دیتا۔ (انھیں میں اپنی غلیل کے چھرّے بناتا تھا۔) ایک بار بالر کی دیکھادیکھی میں نے بھی یہی کرنے کی کوشش کی تھی اور نتیجتاً پورا ہاتھ آبلوں سے بھر بیٹھا تھا۔ بہرحال، بالر کے بھائی کی بیوہ نے وہ کوٹ مجھے دے دیا۔ سوفی چچی نےاسے میرے ناپ کا سلوا دیا اور تسموں سے مزیّن کر دیا۔ اب سوال اٹھا کہ زیریں بدن پر کیا پہنا جائے۔ چچا بیوبی کی پرانی جرابیں پہننے پر تو میں ہرگز رضامند نہ ہوا، لیکن جب کوئی مناسب چُست سلائی کا پاجامہ نہ مل سکا تو چچی سوفی نے مجھے اس بات پر آمادہ کر ہی لیا کہ میں ٹانگوں سر چچی کا ایک پرانا ریشمی سیاہ زیرجامہ پہن لوں جو انھوں نے کبھی اپنی جوانی میں کسی فینسی ڈریس دعوت کے لیے سلوایا تھا۔ جوتوں کا مسئلہ کسی مہمان کے فراموش کردہ لمبے شکاری بوٹوں

نے حل کر دیا۔ سر پر پہننے کے لیے چچی نے پرانے کپڑوں کی گٹھری سے ایک سیاہ مخملیں ٹوپی برآمد کر لی بلکہ اس پر لومڑی کی سرخ کھال کی گوٹ بھی لگا دی۔

یہ سب کچھ زیب تن کرنے کے بعد جب چچی سوفی کے کمرے والے آئینے میں میں نے اپنا معائنہ کیا تو ان کی رومانیائی ملازمہ پر ہنسی کا ایسا دورہ پڑا کہ اسے کمرے سے باہر بھیجنا ضروری ہو گیا۔ میں نے اپنے عکس کو ٹاور والے مرداد آئینے ہی میں غور سے دیکھا۔ یہ محض بچوں کا کھیل نہیں تھا، ایسا کوئی ناٹک جس میں کوئی بچہ مثلاً ریڈانڈین باشندوں کا پروں کا تاج لگا کر کوئی معصوم کھیل کھیلنا چاہتا ہو۔ یہ میرے وجود کا وہ سنجیدہ حصہ تھا جس کی مشوونما ہونی تھی۔ جس چیز کو میں اپنے وجود میں محسوس کرنا چاہتا تھا وہ "جرمنیت" تھی۔ یہ کاسٹیوم مضحکہ خیز تھا، مگر یہ اسی ملبوس کی نقل تھا جو جرمن سپاہی کے احساسِ جرمنیت کا مادی مظہر تھا۔ یہ احساس میرا اپنا تھا۔ اسے "جرمن اسکشنو" کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تہہ میں مبہم مگر نہایت حقیقی اضطراب تھا اور ایک ایسی شدید آرزو جس کا مقصد نامعلوم تھا۔ کتاب میں میںنوشی کے گیت اسی کیفیت کے عمار تھے۔ ان میں اضطراب تھا، کسی بھی سمت سفر کر جانے کی شدید آرزو، اور لاحاصلیت کی گہری کڑواہٹ۔

میری فرمائش پر چچی سوفی ان گیتوں کی دھنیں پیانو پر بجاتیں۔ سرورق والے طالب علموں کا لباس پہن کر میں انھیں گاتا۔ جب ہم کوئی دھن نہ بنا پاتے تو چچا بیوبرٹ ہماری مدد کو آ جاتے۔ وہ بالکل کن سُرے تھے (مگر تمام کن سُروں کی طرح انھیں اس بات کا علم نہیں تھا)۔ وہ سیٹ پھلا پھلا کر چیختے اور اتنی زور سے دہاڑتے کہ چچی سوفی کانوں پر ہاتھ رکھ کر التجائیں کرتیں کہ خدا کے واسطے اب بس کرو۔ کبھی کبھی میں اور چچی سوفی ہنستے ہنستے ایک دوسرےکی بانہوں میں گر پڑتے! چچا بیوبرٹ بچارے ایسے مرنجاں مرنج آدمی تھے کہ بالکل برا نہ مناتے۔ اب یہ ہمارا روز کا معمول ہو گیا تھا کہ رات کے کھانے سے پہلے ہم پیانو کے گرد جمع ہو کر اپنی جرمنیت کی تجدید کریں۔ میں بہت خوش تھا اور چچا بیوبرٹ اور چچی سوفی بھی خوش تھے۔ ہمارے درمیان بےتکلفی اور اپنائیت کی ایسی فضا قائم ہو گئی تھی جو مجھے کبھی اپنے خاندان میں نہ مل سکی تھی۔ میرے میزبانوں کو بھی گویا ایک بیٹا مل گیا تھا۔

اس طرح حویلی کے باسیوں کے درمیان بڑی خوشگوار ہم آہنگی وجود میں آ گئی تھی۔ بچکانہ عجلت میں میں اسے اپنی ذات اور بیرونی ذات کل کائنات کے درمیان ہم آہنگی تصور کر بیٹھا تھا۔ اب تک میں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس کے رگ وریشے میں آسٹریائی حقیقت پرستی گندھی تھی۔ آسٹریا میں دوہری شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد اس میں شکست خوردہ قناعت بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں جس تہذیب کا وارث تھا وہ میری عمر کے لیے ناموزوں تھی۔ وہ سب تہذیب و تکلف، "پہلے آپ" کی گردان، ایک قسم کا راضی

Scanned with CamScanner

بہ رضا توکل، اور تقریباً مرثیہ خواں کلچر، میری عمر کے تقاضوں سے ناقابلِ برداشت حد تک متصادم تھے۔ اپنے ورثے سے مجھے کس حد تک نفرت تھی، اس کا اندازہ مجھے ایک شخص کے لیے اپنی نفرت سے ہوا جس کا نام استیاسنی تھا اور جو چچا بیوبی کے گھر برسوں سے مستقل مہمان تھا۔

استیاسنی جو اپنے آپ کو اپنے منہ سے "زوال کا وارث" کہتا تھا، بےپناہ ذہین اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ پراگ کا رہنے والا تھا جہاں کسی زمانے میں اس کے خاندان کا شمار امرا میں ہوتا تھا۔ اس کے گھر میں دوسرے نوادرات اور نایاب کتب کے ذخائر کے ساتھ ساتھ وہ نیلامی فہرست بھی مل سکتی تھی جس میں ۱۹۱۹ کے فوراً بعد اس کےخاندان کے کل مال واملاک اور جائیداد کی بولی لگی تھی۔ سب کچھ نیلام ہو گیا تھا۔ گھروں کا تمام سازوسامان، بگھیاں، خادموں کی وردیاں، یہاں تک کہ استیاسنی کے باپ کی نادر تصاویر کا ذخیرہ بھی نہ بچ سکا تھا۔ اس نیلام کے بعد خاندان کے والیوں میں سے ایک بھائی نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔

استیاسنی اپنے خاندانی ادبار کو ذاتی المیہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ہونٹوں پر مردنی زدہ تبسم لا کر کہتا، "لیکن یہ تو ایک کائناتی عملِ تحلیل کا حصہ ہے۔" اس کے نزدیک یہ فطری بات تھی کہ وہ مفلس ہو گیا تھا، اور ہر اس جگہ پناہ لیتا پھر رہا تھا جہاں بقول اس کے "عملِ تحلیل نے ہنوز اپنا کام مکمل نہیں کیا ہے۔" ویسے ہمارے یہاں ان دنوں خوشحال گھرانوں میں یہ عام طریقہ تھا کہ ضرورت مند معززین برسوں، بلکہ پوری عمر مہمان رہتے چلے جائیں۔

ذرا سے فاصلے پر دنائسٹر دریا کے پار روس تھا۔ ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد وہاں سے پناہ گزینوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس پار ہجرت کر آئے تھے۔ پورے پورے خاندان رشتےداروں یا دوستوں کے گھروں میں رہ رہے تھے۔ استیاسنی اپنے میزبانوں کی مدارات کو احسان کی جگہ اپنا حق تصور کرتا تھا۔ وہ ہر چیز پر اعتراض کرتا، ہر بات میں میں میخ نکالتا، اور لوگوں سے بدمزاجی سے پیش آتا۔ ساتھ ہی وہ اپنے آپ پر ایک ناخوشگوار استہزائیہ انکسار بھی طاری رکھتا۔ اس کی عرفیت "مَیں کون؟" پڑ گئی تھی۔ اکثر وہ کوئی بات ان جملوں کے ساتھ شروع کرتا، "مگر میں کون ہوتا ہوں جو فلاں بات پر اعتراض کروں۔۔۔" وغیرہ۔

حقیقت یہ تھی کہ میں استیاسنی سے ڈرتا تھا۔ میں اس سے تنفر محسوس کرتا اور رشک بھی کھاتا۔ شاید اس کی جانب سب کا ردِعمل یہی تھا۔ ہاں چچی سوفی نے بےشک اسے کسی پُرشکست پنچھی کی طرح اپنی چھترچھایا میں اطمینان سے سمیٹ لیا تھا۔ میرے والد استیاسنی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو استیاسنی کی توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اس سے مجھے جہاں ایک طرف تو خوشی ہوتی کہ استیاسنی اسی سلوک کا مستحق ہے، وہاں عجیب بات یہ تھی کہ گہری اذیت بھی محسوس ہوتی۔

استیاسنی سب سے الگ تھلگ رہتا مگر ایک طرح سب کے سر پر سوار بھی رہتا۔ اپنے کمرے میں وہ عجیب وغریب مصروفیات میں منہمک رہتا۔ کبھی تمام ملازموں کے زائچے کھینچتا، کبھی چچی سوفی اور چچا بیوبرٹ کی شادی کے وقت ان کے بسترِعروسی پر ستاروں کے نحس اثرات کا حساب لگاتا۔ کہا جاتا تھا کہ کبھی کبھی وہ روحیں بھی بلاتا ہے۔ یہ کام کامل رازداری سے سرانجام پاتے۔ اس طرح اس کی موجودگی میں بھی کچھ غیرموجودگی کی سی کیفیت رہتی۔ کھانے کے وقت البتہ وہ متاثرکن پابندیِ وقت کے ساتھ پوری طرح موجود ہی رہتا۔ کسی بھی قسم کا کھانا ہو، ظہرانہ ہو کہ عشائیہ، یا کسی کے دیر سے آنے پر اس کے لیے سینڈوچ بنائے گئے ہوں، یا چائے سے پہلے سموسوں کا دور ہو، ہر موقعے پر استیاسنی لازماً موجود ہوتا۔ کھانے کی میز کے ساتھ اس کا وجود اس طرح لازم وملزوم تھا گویا وہ چھری یا کانٹا تھا جسے کھانے کی میز پر بہرحال موجود رہنا تھا۔

وہ گہرے رنگ کے خوش قطع مگر بری طرح داغدار سوٹ میں، انکسار سے مذہبی استادوں کی مانند ہاتھ باندھے اور نظریں جھکائے کھڑا رہتا۔ اس کی قمیص کے کف اور کالر چھدرے ہو گئے تھے اور ٹائی کی گرہ ہمیشہ ٹیڑھی بندھی ہوتی، اس کے باوجود اس کی خوشی وضعی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس کا دراز قد اور متناسب جسم، اس کے سپید بُھک بال، کاسۂ سر کی متناسب ساخت، اور سرخ خمدار ہونٹ جتنے پُرکشش تھے، اس کی بقیہ شخصیت اسی قدر مکروہ تھی۔ اس کے قطعی تباہ شدہ دانت، مسلسل تمباکونوشی سے داغدار انگلیاں، کاہلی اور پُرخوری کے باعث اس کا مریضانہ مٹاپا۔ خصوصاً اس کی آنکھیں بہت عجیب تھیں۔ جب تک وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہتا، اس کے چہرے پر طنز اور حقارت کا تاثر رہتا، مگر جوں ہی اس کی نگاہیں اپنے کسی میزبان سے ٹکراتیں اس کی آنکھیں گویا کانچ کی بن جاتیں، اور چہرے پر نہایت عاجلانہ نفس کشی کی کیفیت طاری ہو جاتی، جیسے وہ ابھی کہنے والا ہو، "میں کون ہوتا ہوں۔۔۔"

کھانے کی میز پر استیاسنی بالکل کنارے پر بیٹھتا، جس کا مطلب تھا کہ اس کی نشست میرے ساتھ ہوتی۔ وہ شدید ندیدےپن سے کھانا کھاتا۔ مجھے اس کے کھانے سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ پھر بھی میں کنکھیوں سے اسے دیکھے بغیر نہ رہ پاتا۔ جب میں اس پروقار، حساس اور ترشے ہوئے خدوخال والے انسان کو جلدی جلدی، حرص سے کھانا نگلتے ہوئے دیکھتا تو مجھے ایک اذیت ناک لطف آتا۔ وہ کسی میٹرسٹ پینٹنگ کی طرح تھا جس میں خوبصورتی کے ساتھ اس کا تضاد بھی پیوست ہوتا تھا۔ اکثر وہ میری دُزدیدہ نگاہیں پکڑ لیتا۔ تب وہ یوں مسکراتا جیسے کسی جرم میں ہم دونوں کی ملی بھگت ہو۔ اس کی بےرنگ اور گمنام سی نگاہیں اس کے دلی جذبات کو چھپانے کی کوشش سی کرتیں، گویا وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس جیسی اعلا تعلیم اور ذہانت کے مالک شخص کو کس قسم کے قصباتی گھامڑوں کے ساتھ رہنا پڑ رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

وہ نگاہیں مجھے پریشان کر دیتیں۔ میں کئی کئی دن بےچین رہتا۔ میری خوداعتمادی خاک میں مل جاتی۔ میں کاؤنٹ سیں ڈور کی اولاد تو تھا نہیں۔ میری خوداعتمادی تھی ہی کتنی! استیاسنی کو اس کا خوب اندازہ تھا۔ وہ دانستہ مجھے شرمندہ کر کے لطف لیتا تھا۔ میرا اور اپنے میزبان جوڑے کا قرب خصوصاً اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس کی موجودگی میں جب بھی میں کمرے میں قدم رکھتا وہ طنزیہ لہجے میں کہتا، "بہت خوب ! تو وارث صاحب تشریف لے آئے"، اور اہتمام کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ جب تک میں بیٹھ نہ جاتا وہ کھڑا ہی رہتا، اور مجھ سے آپ جناب کر کے بات کرتا۔ چچی سوفی کے کئی بار ٹوکنے پر بھی اس کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ چچا ہیوبی کے ایک بار جھڑکنے پر البتہ اس نے مجھے براہِ راست مخاطب کرنا ترک کر دیا، مگر اس کے طنزیہ فقروں کا ہدف اس کے باوجود میں ہی رہتا تھا۔ یہ فقرے اکثر میری سمجھ میں بھی نہ آتے، اور استیاسنی میری اس الجھن سے اور زیادہ لطف لیتا محسوس ہوتا۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ میں سخت گیر ماحول میں تربیت پانے کے باعث بڑوں سے احترام کا سلوک کرنے پر مجبور ہوں، اور میرے لیے ناممکن ہے کہ اس کے طنزیہ تکلف کے جواب میں اس سے زیادہ تکلفانہ برتاؤ اختیار نہ کروں۔ اس طرح ہمارے درمیان گویا احترام اور تکلف کا ایک مقابلہ شروع ہو جاتا، جس پر چچا ہیوبی اور چچی سوفی کبھی کبھی بری طرح جھنجھلا جاتے۔

جب اس نے پہلی بار مجھے طالب علموں کی مےنوشی کے لباس میں دیکھا تو اس کی آنکھیں دبائی ہوئی ہنسی سے چمکنے لگیں۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے پاگل کر دینے والے غلامانہ انداز میں کہنا شروع کر دیا، "اخّاہ، تو گویا ہمارے میزباں کا لڑکپن دوہرایا جا رہا ہے! کیوں نہ ہو، ایک شمع سے دوسری کو روشن ہونا چاہیے۔ اور پھر ہماری جرمنیت کی حفاظت بھی تو لازمی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے چچا صاحب کی والدہ جرمن نہیں ہنگیرین تھیں، اور چچی سوفی کی رگوں میں اٹرستانی خون بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ رومانیائی خون ہے، لیکن میں کون ہوتا ہوں یہ کہنے والا کہ ہم آسٹریائی سب مخلوط النسل ہیں، خصوصاً نام نہاد جرمن آسٹریائی۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہم خود کو آسٹریائی تسلیم تک نہیں کرتے۔ شاید ہم امریکی ہیں۔ یا شاید ہم میں یہ سمجھنے کی بھی سیاسی بصیرت نہیں۔ افسوس! خیر ایسی ہی ہے زندگی۔ جذبات عقل پر فوقیت رکھتے ہیں اور زیادہ عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جذبات جتنے غیرعقلی ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ مثلاً عظیم جرمن سلطنت کے لیے ہماری آرزو ہی کو لیجیے۔ کون سی عظیم جرمن سلطنت؟ شارلمین کی یا کارل اعظم کی؟ اسے دوبارہ متحد کرنے کے لیے، تخلیق کرنے کے لیے، ہم کس قدر مضطرب ہیں۔ ایک صدی قبل بھی جرمن نوجوانوں کو یہی بخار چڑھا تھا۔ آج بھی یہ جرمن بولنے والے، جرمن سوچنے والے، جرمن محسوس کرنے والے، اسی آرزو میں گرفتار ہیں۔ اب یہ حقیقت بھاڑ میں جائے کہ ان میں زیادہ تر پروشیا یا فِن لینڈ کا خون ہے، اور خود آپ

کے پیارے دریائے ڈینیوب کے کنارے بسنے والوں کی رگوں میں سلووانی اور بوہیمین خون کی وافر آمیزش ہے۔ لیکن نہیں، ہم پھر بھی خالص، اصل نسل، کھرے جرمن ہیں۔ ہمارے نوجوان جرمن ایمپائر کا سیاہ، سرخ اور سنہری پرچم بلند کرنے کے لیے بےقرار ہیں، جس کا سیاہ رنگ موت کی، سرخ جھاگ اڑاتے بہتے خون کی، اور سنہرا رنگ کسی خواب ناک امکان کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہی ہماری "جرمنیت" ہے۔ ہم نوجوانی کی پُرسوز بےچینی اور بےمقصد ہُوک کو قومی شکوہ کا ولولہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر میرے معزز میزبان برا نہ منائیں تو میں انھیں اپنے ذخیرے سے کئی ہزار برس پرانا ایک عجوبہ دکھاؤں۔ اسے مصریوں نے بنایا تھا۔ اس کا ایک حصہ چھوٹا اور دوسرا بہت لمبا ہے۔ دراصل یہ خدا کی تجریدی صورت بنانے کی انسان کی اولیں کوششوں میں سے ہے۔ ایک لکڑی میں گھاس کی پٹی باندھ دی جاتی تھی جو ہوا سے ہلتی رہتی تھی۔ پرچم اسی طرح ایجاد ہوا تھا۔"

اس کی باتوں کی مکّاری مَیں خوب سمجھتا اور میرا خون کھول اٹھتا۔

ایک روز اپنے قدیمی جرمن لباس میں ٹہلتا ہوا مَیں ٹاور سے باہر نکل آیا اور سڑک پر سَرگشت کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ہیئت کذائی تھوڑی بہت ہلچل ضرور مچائے گی، اور اگرچہ مجھے کسی کھلی جھڑپ کا سامنا ہونے کی توقع نہیں تھی، پھر بھی میں ایسی کسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اپنے طور پر تیار تھا۔ بےشک میں نے ٹاور کی دیوار پر آویزاں چچا ہیوبی کے خنجروں میں سے کوئی خنجر اپنے سورماؤں کے لباس میں اُڑسنے کی جراُت نہیں کی تھی، لیکن میرا ڈیش ہاؤنڈ میکس میرے ساتھ تھا اور میری غلیل اور اس کے مٹھی بھر چھرّے میری جیب میں موجود تھے۔ توقع کے مطابق، گلی میں کھیلتے ہوئے یہودی بچوں نے مجھے حیرت سے دیکھا، پھر ہنسی سے دوہرے ہو کر میرے پیچھے لگ گئے۔ آوازیں کستے چھوکروں کی میں نے پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر گولڈمین کے بُرجیوں اور کنگروں والے گھر کے سامنے ایک لڑکے نے میرا راستا روک لیا۔ وہ میرا ہم عمر تھا لیکن قد اور جسامت میں مجھ سے ذرا دبتا ہوا۔ اس کا لباس گلی کے چھوکروں کے مقابلے میں بہتر تھا اور اس کی برتر ماحول میں تربیت کی نشان دہی کرتا تھا، مگر نقوش صاف بتا رہے تھے کہ یہ یہودی ہے۔ گھونگریالے بالوں سے گھرا اس کا چہرہ بالکل بھیڑ جیسا تھا، مگر چہرے کے نقوش سے زیادہ نمایاں اس کی خوداعتمادی کا سرکش انداز تھا جو میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔

اس نے مجھے دیکھ کر حیرت سے کہا، "ارے! کیا تم کوئی یہودی راہب ہو؟" میں نے اسے سختی سے گھور کر اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، کیونکہ اس کے بےہودہ سوال کا جواب دینا مجھے اپنی شان کے خلاف محسوس ہوا۔ لیکن اس پر میرے گھورنے کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر میری ٹوپی کے پُھندنے کو استہزائیہ انداز میں چھوا، اور اپنا سوال

Scanned with CamScanner

دوہرایا۔

اس توہین پر میں نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ میرا ایسا کرنا تھا کہ تمام بچے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں میری خوبصورت ٹوپی سر سے اتر کر دھجّی دھجّی ہو چکی تھی۔ مجھے اپنی کان کنی کی جیکٹ کی آستینیں الگ ہوتی محسوس ہوئیں۔ میرے منہ پر چند گھونسے بھی پڑے، مگر میں نے بھی تاک تاک کر گھونسے جمائے۔ سب سے زیادہ ذلّت آمیز بات یہ تھی کہ میکس میری حفاظت کرنے کی بجائے میری ٹانگوں کے پیچھے چھپ کر کیاؤں کیاؤں کر رہا تھا۔ وہ اپنی بدحواسی کی وجہ سے گھونسوں اور لاتوں کی زد میں آ گیا۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ جس لڑکے کو میں نے پہلے مارا تھا وہ میکس کو بچانے کے لیے اس پر تقریباً لیٹ گیا اور چلایا، "اسے چھوڑ دو، کتے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" اتنی دیر میں ایک زوردار پٹاخا چھوٹا۔ لوہار ہالر گھر واپس جا رہا تھا۔ اس کی تالی کی آواز بھی گولی کے دھماکے جیسی تھی۔ بچے اتّفاقاً غائب ہو گئے۔ گلی میں سنّاٹا چھا گیا۔ صرف میں اور گوسفند صورت لڑکا کھڑے رہ گئے۔ اس نے میکس کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ کتا نئے بچے کا چہرہ چاٹنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کہا، "کتنا پیارا کتا ہے!" میں نے جلےدل سے جواب دیا، "ابھی چھوٹا ہے اس لیے لڑتا نہیں ہے۔" دل تو میکس کو کوسنے اور گالیاں دینے کے لیے چاہ رہا تھا، لیکن میں یہودی لڑکے کے سامنے اپنے کتے کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیوں کہ وہ دس لڑکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "جرمنوں کی طرح بیوقوف نہیں، اس لیے؟" اس نے منہ کھول کر زبان سے دانت کو ٹہوکا دیا، پھر کہنے لگا، "تم نے میرا ایک دانت ہلا دیا ہے۔ اگر ٹوٹ گیا تو سونے کے دانت کی قیمت دینی پڑے گی۔ دانت دوسری بار نہیں نکلتا۔"

"کتے کو نیچے اتار دو،" میں نے کہا۔ "یہ گود کا کتا نہیں بنے گا۔"

لڑکے نے بہت نرمی سے کتے کو زمین پر رکھ دیا۔ میکس دوبارہ سہلائے جانے کے لیے اچھلنے لگا۔ لڑکے نے پیار سے میکس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا، "تو پھر کیا بنے گا؟"

"شکاری کتا۔"

"کس چیز کا شکار کرے گا؟ تتلیوں کا؟"

"ہاں! کیوں نہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اس کا شکار دکھا سکتا ہوں۔" میں تتلیوں کے اس ذخیرے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ٹاور میں شیشے کے صندوقچے میں سجا ہوا تھا۔

"تو دکھا دو،" اس نے کہا۔ "کیا تمہیں ڈر ہے کہ میری وجہ سے تمہارے گھر میں جوئیں پڑ جائیں گی؟ میں ڈاکٹر گولڈمیں کا بیٹا ہوں۔" اس نے نوگوتھک طرزِتعمیر کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم چاہو تو میرے گھر آ سکتے ہو۔ خواہ تمہارے شکاری کتّے کے روؤں میں کیڑے ہی کیوں نہ پڑے ہوں۔"

اس طرح ایک ایسی دوستی کا آغاز ہوا جو بدقسمتی سے زیادہ عرصے قائم تو نہ رہ سکی لیکن جس کی وجہ سے اس برس کا موسم گرما، جس میں بہت سے واقعات پیش آئے، میرے لیے کئی لحاظ سے ناقابلِ فراموش بن گیا۔

پہلے تو مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں ڈاکٹر گولڈمیں کے بیٹے کو محض اپنی مرضی سے اپنے رشتےداروں کے گھر مدعو کروں یا نہ کروں۔ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ وہ یہودی تھا؛ چچا ہیوبی کے خانوادے اور گاؤں کے دوسرے باسیوں کے درمیان سماجی فرق بھی ایک رکاوٹ تھی۔ پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ گولڈمیں گھرانے کے لیے چچا ہیوبی اور چچی سوفی شاید کچھ اور طرح کی جھجک بھی محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو اکثر جاگیرداروں کے تعلقات گاؤں کے طبیب سے خوشگوار ہوتے ہیں، لیکن یہاں دوسری صورتِ حال تھی۔ حویلی کے نوکر چاکروں اور ملازمیں کو زیادہ سنجیدہ بیماریوں کے بارے میں مشورے لینے تو ڈاکٹر گولڈمیں کے پاس بھیج دیا جاتا تھا، مگر کوشش یہی رہتی کہ چھوٹی موٹی تکالیف کا علاج ڈاکٹر گولڈمیں کی مدد کے بغیر ہی، قصبے کے پولش دواساز کی مدد سے کر لیا جائے جس پر چچی سوفی کو گہرا اعتقاد تھا۔ چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی خود اپنا علاج تو ڈاکٹر گولڈمیں سے ہرگز نہ کرواتے تھے۔ علاوہ ازیں جس استہزائیہ انداز میں یہ دونوں قصبے میں اپنے ہر نووارد مہماں کو گولڈمیں کا مکاں ایک مضحکہ خیز عجوبے کی طرح دکھاتے تھے اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکٹر گولڈمیں سے فاصلہ رکھنے کا کوئی مخصوص سبب ہے۔

یہ سبب کوئی بھی ہو، اتنا مجھے ضرور اندازہ تھا کہ اگر میرے رشتےدار ذرا بھی ضرورت محسوس کرتے تو یقیناً وہ ڈاکٹر گولڈمیں سے بہتر تعلقات استوار کر چکے ہوتے۔ اس لیے میں مخمصے میں تھا کہ اس چھوٹے سے قصبے کے سماجی رشتوں، یا ان رشتوں کے عدم وجود میں صرف اپنی مرضی سے کیوں کر دخل اندازی کروں۔

مثلاً ایک بار میں نے استیاسنی کے منہ سے ایک ایسی بات سنی تھی جو میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ میں نے غالباً دوسروں سے زیادہ اس بات پر غور کیا تھا۔ کسی مہماں نے برسبیلِ تذکرہ کہا تھا کہ چونکہ چچا ہیوبرٹ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں (گو انہیں سند نہیں ملی ہے لیکن پھر بھی) ان کا شمار علما میں ہو سکتا ہے۔ اس پر استیاسنی نے یوں تبصرہ کیا، "جرمن قوم کا المیہ ہی یہ ہے کہ اس کے معتبرین میں سے نصف نام نہاد عالم ہیں اور نصف نام نہاد دانشور۔" صاف ظاہر تھا کہ علما اور دانشوروں میں نہیں بنتی۔ اس بات کی شہادت خود چچا ہیوبرٹ کے تبصرے سے ہوتی ہے۔ استیاسنی کی بات پر پیچ وتاب کھاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا، "ان دانشوروں سے چڑ سب سے زیادہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ مجمل ہے جو کبھی سیدھی بات کہیں۔ بوبھو جیسے فوجی توپ خانے کے سپاہی کبھی سیدھا نشانہ نہیں باندھتے؛ ہدف کچھ اور ہوتا ہے اور نشانہ کہیں اور لگاتے ہیں۔ بالکل

Scanned with CamScanner

یہودیوں کی طرح۔" چچا ہیوبرٹ کے موقف کی حمایت میں چچی سوفی ہمیشہ چند کلمات ضرور ادا کرتی تھیں۔ اس بار بھی انھوں نے کچھ یوں کہا: "ہیوبی کا یہ مطلب نہیں کہ توپ خانے کے تمام سپاہی یہودی ہوتے ہیں۔ حالاں‌کہ یہ درست ہے کہ اگر انھیں محکمہ طب یا محکمہ جنگ میں پناہ نہ ملے تو وہ توپ خانے ہی میں ملازمت کرتے ہیں۔ مگر ہیوبی صحیح کہہ رہے ہیں۔ اسٹیپاسنی جس طریقے سے گفتگو کرتے ہیں اس پر تو نہایت دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے، حالاں‌کہ بیچارے اتنے اچھے ہیں۔۔۔ اور اتنے غریب بھی ہیں۔"

یوں بھی وہ سورما، وہ ازمنہ قدیم کی یادگاریں، یعنی ٹاور میں مہماں بن کر آنے والے چچا ہیوبی کے شکاری دوست اور طرح کے تھے۔ وہ تو عالموں سے بھی کوسوں دور رہتے تھے، جن میں ایسے پیشہ ور علما بھی شامل تھے، مثلاً وکلا اور طبیب، جن کے بارے میں وہ احتراماً یوں تبصرہ کرتے تھے کہ "پیشہ ورانہ تربیت یافتہ، جو اپنے دماغ کی کمائی کھانے پر مجبور ہیں؛ ایسے لوگ نہیں جو یوں ہی شوقیہ، علوم کی لامحدود وسعتوں میں جرأت آزما ہوں۔" یہاں اشارہ صاف چچا ہیوبی جیسے "شوقیہ" اشخاص کی جانب ہوتا تھا۔ اب اگر کوئی نہ صرف دانشور ہونے کے باعث مختلف ہو، بلکہ ساتھ ساتھ یہودی بھی ہو، تو اس صورت میں سماجی خلیج کو پاٹنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ یہ تو امر مسلّم تھا کہ ڈاکٹر گولڈمین یہودی بھی تھے اور دانشور بھی تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ وہ اسٹیپاسنی سے دانشورانہ موضوعات پر پُرجوش تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام ہچکچاہٹوں کے باوجود، میں نے ہمت کر کے اپنے تئیں یقین دلا لیا کہ ٹاور بلا دخل اندازیِ غیرے صرف میرے لیے مخصوص ہے؛ یہاں میں اپنی مرضی سے جسے چاہوں مدعو کر سکتا ہوں۔ لہٰذا ڈاکٹر گولڈمین کے سرخ بالوں والے بیٹے کو ٹاور میں تتلیوں کا ذخیرہ دیکھنے‌کی دعوت دے ڈالی۔ "ویسے تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔

اس کا نام وولف تھا۔ اس نام پر میرا ملاجلا ردعمل ہوا تھا۔ اس پر تو میں مسرور ہوا کہ میرے نئے دوست کے نام سے یہودیت کی بُو نہیں آتی تھی کہ مجھے کوفت ہوتی۔ مگر ساتھ ہی یہ مناسب نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک یہودی اپنا نام جرمن حکایتوں کے کسی سورما سے مماثل رکھ لے۔ بعد میں اس نے بتایا تھا کہ قدامت پرست یہودیوں میں وولف بہت عام نام تھا۔ اس کے باپ کا اول نام بیئر (ریچھ) تھا۔ بیئر گولڈمین، یہ نام سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر اس نے میرا نام پوچھا۔ مجھے بتانا پڑا کہ مجھے بُوبی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نام کو سن کر اس نے اس طرح حماقت سے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا جس طرح چچی سوفی کی ملازمہ نے مجھے قدیم جرمن ملبوس میں دیکھ کر ٹھٹھے مارنے شروع کر دیے تھے۔ "تو اگر تمھاری کوئی بہن ہوتی تو اس کا نام لڑکی ہوتا؟" مجھے تسلیم کرنا پڑا۔ شاید ایسا ہی ہوتا۔ "اور تمھارے باپ کا نام مرد اور ماں کا نام عورت ہوتا؟" وہ اتنا ہنسا کہ اس کی سانس کافی دیر میں درست ہو پائی۔

جب میں اسے فخریہ ٹاور میں لے گیا تب بھی اس کا ردعمل یکساں تھا۔ "کیا یہ ہے ٹاور؟ اسے کہتے ہیں ٹاور؟ ارے ٹاور کیسا ہوتا ہے میں تمھیں دکھاتا ہوں۔" اس نے روشندان سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا جس کی چھت پر بلند بارعب مینار درختوں سے بالا ایستادہ تھا۔ بلکہ اس پر ایک پرچم تک آویزاں تھا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر کڑھا کہ اس بدبخت مینار کو تو میں اکثر تکتا رہتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ میرے جرمن جذبات کی بہتر عکاسی تو یہ نوگوتھک تعمیر کرتی ہے نہ کہ یہ اٹریا، جسے میرے حوالے کر دیا گیا ہے۔

"تو کیا تمھارا کمرہ اسی بُرجی میں ہے؟" میں نے کچھ معذرت خواہی کے انداز میں پوچھا۔

"دیوانے ہوئے ہو،" اس نے کہا، "میں کیوں روز اتنی سیڑھیاں چڑھوں گا؟ کوئی میں جرمنیا ہوں؟"

اس کی اس عادت پر میں جل بُھن کر رہ جاتا تھا کہ وہ ہر احمقانہ رویّے کو جرمنیت سے منسوب کرتا، حالاں‌کہ مجھے یہ خیال بھی آتا کہ غالباً جس ماحول میں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے وہاں یہ عام اندازِ گفتگو ہو گا، اور میرا دوست مجھ سے اتنا بےتکلف ہے کہ مجھ سے بےجھجک فطری انداز میں بات کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو درست جرمن بول سکتا تھا، مگر وہ جان بوجھ کر یہودیوں کی پولش اور یدش کی ملی جلی بولی استعمال کرتا تھا۔ رنگارنگ محاوروں اور روزمرہ سے مزیّن، چست اور زیرک طرزِاظہار سے مملو یہ بولی اس کی شخصیت سے، اس کی طاقت ور پھرتیلے دماغ سے، اور اس کی ناقابلِ تسخیر خوداعتمادی سے بہتر مطابقت بھی رکھتی تھی۔ اس کے برعکس مجھے قطعی درست جرمن بولنے کی سختی سے تربیت دی گئی تھی۔ حالاں‌کہ میرے والدین گھر پر جو زبان بولتے تھے وہ کچھ بند قبا چاک قسم کی جرمن تھی۔ آسٹریا کے باسیوں کی اصل بولی ٹھولی اسی قسم کی تھی۔ لیکن انھیں بالکل درست، کلاسیکی جرمن بھی بولنی آتی تھی۔

ٹاور کے نوادرات سے وولف سرمو متاثر نہ ہوا، بلکہ بور ہو گیا۔ ہاتھی دانت کے کاسہ سر میں اسے غلطیاں نظر آئیں۔ اس نے بتایا کہ اس کے باپ کے پاس ایک سچ مچ کا انسانی ڈھانچا ہے اور وہ مجھے دکھا سکتا ہے کہ غلطیاں کہاں کہاں ہیں۔ کاؤنٹ سین ڈور کے شہ سوارانہ کرتب پر اس کا تبصرہ اتنا ہی تھا: "یہ سرکس میں کام کرتے تھے کیا؟"

دیوار پر آویزاں ترچھی صلیب کی مانند ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی چچا ہیوبرٹ کی تلواروں کو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ میں نے کمال گرمجوشی سے اس کے سامنے اپنی نویافتہ معلومات کا خزانہ لُٹا دیا: کس طرح جرمن نوجوانوں کی جنگجو انجمنیں ہوتی تھیں، ان کے ارکان سبک شمشیروں سے تلواربازی کرتے تھے، ہر انجمن کی مخصوص وردی اور ٹوپی ہوتی تھی۔ انھیں "بھائی چارے کی انجمنیں" کہا جاتا تھا، ان کے خاص گیت بھی ہوتے تھے جو مےنوشی کے وقت گائے جاتے تھے۔ انجمنوں کی تربیت میں شراب نوشی کے آداب بھی سکھائے

جاتے تھے مثلاً یہ کہ یکے بعد دیگرے جام لنڈھانے کی بجائے وقفے سے شراب پی جائے تاکہ پینے والا مدہوش نہ ہو۔

وولف گولڈمین، جس کے سرخ بالوں والا چہرہ اسے آتشدان میں گھورتے ہوئے گوسفند سے مماثل بنا دیتا تھا، میری باتیں غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نےکہا، "اور تم رائن کے ساحل پر سنہری بال سنوارتی حسیناؤں کے گیت بھی گاتے ہو؟"

ہاں۔ یہ درست تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کا اشارہ ہائنرخ ہائنے کے ایک مشہور نغمے کی طرف تھا، جو سب جانتے ہیں کہ ایک یہودی تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر اسے بتائی۔ یہ سن کر اس کے چہرے کے تاثرات میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا۔ میں کھسیانا ہو گیا، مبادا وہ سمجھے کہ میں بےڈھنگے جرمن طریقے سے اس سے اپنائیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

پھر اس نے سوال کیا، "اگر ان تلواروں سے جنگ کی جاتی ہے تو ان میں نوکیں کیوں نہیں ہیں؟"

اس بارے میں بھی میں اس کو معلومات بہم پہنچا سکتا تھا۔ یہ تلواریں نہیں سبک نیمچے تھے۔ ان سے زخم نہیں لگایا جاتا، صرف پھکیتی کی جاتی ہے۔ یہ طالب علموں کے ڈوئل مقابلوں کے لیے ہوتی ہیں۔ حریف ایک دوسرے کے مدمقابل، ٹانگیں پھیلائے، ساکت ایستادہ ہو کر، ایک بازو پشت کی جانب کر کے، صرف ایک بازو سے صرف سر اور چہرے پر وار کرتے تھے۔ جب کسی کے چہرے پر زخم آ جاتا تو اس کا معائنہ کیا جاتا۔ بعد میں ان زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے اور ان کے نشانات قابلِ فخر سمجھے جاتے۔ ان مقابلوں میں یہ بڑی ذلّت کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی فریق سر کی جنبش سے خود کو بچانے کی کوشش کرے۔ ایسے نوجوان کو جنگجو بھائی چارے کی انجمن سے بےدخل کر دیا جاتا۔ ان کی رپورٹ میں درج کیا جاتا، "غیر تسلی بخش۔"

مجھے تعجب ہوا کہ وولف گولڈمین اس لفظی ترکیب سے آشنا تھا۔ اس نے کہا، "ہم یہودیوں کو غیر تسلی بخش قرار دیا گیا تھا۔"

میں گڑبڑا گیا کہ اس بات کا کیا جواب دوں۔ میں نے کہا، "یہ تو ایک طرح کے کھیل ہوتے ہیں، جس میں ہمّت کا برادرانہ امتحان لیا جاتا ہے۔ زخموں کے نشان نجابت کے ثبوت سمجھے جاتے ہیں۔"

وولف گولڈمین نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا، "ہاں۔ افریقی بھی اپنے چہروں پر نشان گودتے ہیں۔ مگر کم ازکم وہ پھول پتّیاں تو بناتے ہیں۔" آخرکار اس نے مجھے بتایا کہ اس تمام تاریخ سے وہ خود واقف ہے؛ اس کا باپ اپنی نوجوانی میں اسی قسم کی یہودی جنگجو انجمن کا رکن رہ چکا ہے۔ یہ دفاعی انجمنیں تھیں۔ غالباً جرمن قوم پرست جنگجو انجمنوں کے لڑکوں نے یہودیوں کو اتنا ستایا تھا کہ انھوں نے بھی جنگجو انجمنیں تشکیل دے لی تھیں۔

"لیکن..." اس نے تلخی سے اضافہ کیا۔ "ان میں شراب نوشی کے گیت وغیرہ نہیں گائے جاتے تھے۔ ان کا مقصد تلواربازی سیکھنا تھا۔ کوئی ماہر پھکیت، شمشیرزنی سکھاتا تھا۔ ہنر سیکھنے کے لیے پھرتی اور حاضردماغی کی ضرورت ہوتی تھی۔ جرمن لڑکے ان ماہر شمشیربازوں سے الجھتے ہوئے گھبراتے تھے۔" اس نے ہنس کر کہا، "اسی لیے انھیں غیر تسلی بخش قرار دیا گیا تھا۔" یہ بات اسے اس کے باپ نے بتائی تھی۔ وہ خود اپنی انجمن کے سب سے ماہر شمشیرزن رہ چکے تھے۔

"تم بھی پھکیت سیکھو گے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی میرا دماغ خراب ہوا ہے؟" وولف گولڈمین نے کہا۔ "مجھے اپنے ہاتھوں کی کسی اور کام کے لیے ضرورت ہے۔"

اس وقت میں ٹھیک سے جان نہ پایا تھا کہ وولف اپنے ہاتھوں سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ مگر وہ اپنے ہاتھوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ اس عمر کے لڑکے جن ہنروں میں ماہر بننا چاہتے ہیں، وولف کو ان میں ذرا دلچسپی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھڑسواری کا شوقین بھی نہ ہو گا۔ یوں بھی مجھے اصطبل کے کسی سائیس سے یہ کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی کہ کسی یہودی لڑکے کے لیے گھوڑا کس دے۔ لیکن وولف کو لڑکوں والے دوسرے شوق بھی نہ تھے۔ نہ وہ درختوں پر چڑھتا، نہ پتھروں سے نشانے باندھتا، نہ شاخیں پھیلتا۔ غلیل بازی اور تیراندازی بھی اسے پسند نہ تھی۔ وہ تو منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی تک نہیں بجاتا تھا۔ اس کے سامنے مجھے اپنی ساری مہارت ہیچکانہ لگتی۔ گو ہم دونوں ہم عمر تھے، لیکن ایک میں تھا کہ تعلیم یافتہ طبقے میں شمولیت کے امکانات وجود میں لانے کے لیے امتحان میں کامیاب ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا، دوسری طرف وولف ابھی سے اچھا خاصا دانشور لگتا تھا۔

عرصے تک میں وولف کو اپنے رشتےداروں کے گھر لانے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے گھر میں کئی بار گیا، جہاں ہر کمرے میں چھت تک کتابیں اور کاغذ بھرے تھے۔ گھر کا سازوسامان تو بالائی طبقے جیسا تھا؛ سیاہ بھاری فرنیچر جس کے گدوں پر پلش کا کپڑا چڑھا تھا؛ بھاری ریشمی پردوں کو فنکاری سے چنّٹیں دے کر اور تکمے لگا کر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود گھر میں کمتر طبقات کی رہائش گاہوں سے مماثل، بند فضا تھی۔ الماریاں اور میزکرسیاں گزشتہ صدی کے جرمن طرز پر گہری کندہ کاری سے مزیّن تھیں۔ یہ مجھے پسند آنے چاہییں تھے (تمام بچوں کی طرح میں بھی بدذوق تھا)، لیکن یہ فرنیچر درحقیقت اعلا درجے کا نہ تھا؛ ایک تو جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، اور کندہ کاری بھی نفیس نہیں تھی۔ گھر بھر میں ہر افقی سطح پر کتابوں اور کاغذات کا انبار تھا۔

وولف کا کہنا تھا کہ اس انبار میں بعض نایاب کتابیں شامل ہیں جو مصنفین نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ڈاکٹر گولڈمین کو دی تھیں۔ اس کے باپ نے ازمنۂ وسطیٰ سے اب تک

Scanned with CamScanner

یہودیوں پر ستم ڈھانے کے اعدادوشمار جمع کیے تھے۔ اگر کوئی اس موضوع پر لکھنے کی جرأت کرے تو اسے اس ذخیرے سے بالکل درست اور لاانتہا معلومات میسر ہو سکتی تھیں۔

مجھے ڈاکٹر گولڈمیں پسند نہ تھے۔ ان کا چہرہ اپنے بیٹے کی طرح بھیڑ جیسا تھا۔ سرخ بال، جیسے بھیڑ آتشدان میں گھور رہی ہو۔ مجھے ان کے خم کھائے ہاتھوں سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا جو سلاماندر مچھلی کے پیٹ کے مانند چتکبرے تھے اور شیر کے بالوں جیسے سرخ بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مرحوم دادا گولڈمیں کے لیے بھی میرے خیالات اتنے اچھے نہ تھے، کیوں‌کہ چچا ہیوبرٹ نے تفنن طبع کی خاطر ان کے کئی لطیفے سنائے تھے۔

حویلی میں وولف کے دادا کا ذکر استیاسنی کی وجہ سے نکلا۔ ایک دن جب ڈاکٹر گولڈمیں مریضوں کو دیکھنے باہر گئے ہوئے تھے، میں نے اور وولف نے منصوبہ بنایا کہ آج اس ڈھانچے کا معائنہ کریں گے جس کے بارے میں وولف ڈینگیں مارا کرتا ہے۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں استیاسنی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ کتابوں کے ایک ڈھیر پر جھکا ہوا تھا۔ دانتوں میں پنسل دبائے وہ غور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔اس کے خمدار سرخ ہونٹوں پر پُرسکوں تبسم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے ہمیں نہیں دیکھا۔ وہ زیرلب کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس کے خوبصورت چہرے کو اس کی اصلیت میں دیکھا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا کتنا حسین چہرہ تھا۔ اس پر وہ مصنوعی تکلّف نہیں تھا؛ نہ اس کی آنکھوں میں نابینائی کی سی کیفیت تھی جو مجھے اپنے رشتےداروں کے گھر نظر آتی تھی جب وہ مصنوعی غلامانہ کیفیت خود پر طاری کر لیتا اور "میں کون ہوتا ہوں" کی رٹ لگاتا اور مکروہ نظر آنے لگتا۔

ہم دونوں جیسے خودبخود الٹے پاؤں واپس کمرے سے نکل آئے۔ میں نے پوچھا، "کیا یہ اکثر یہاں آتا ہے؟" مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گولڈمیں کے گھر استیاسنی کی آمدورفت برسوں سے ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس گھر میں وہ میرے رشتےداروں کے گھر کی نسبت کہیں زیادہ اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ مگر مجھے کامل یقین تھا کہ چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی کو اس بات کا علم نہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ اچانک مجھ سے یہاں اپنا آمناسامنا ہونے کا ذکر نہیں کرے گا۔

اس لیے میں حیران رہ گیا جب دوسرے وقت کے کھانے پر ہی استیاسنی نے بہت اہتمام سے میری جانب رخ کر کے بہ آوازِ بلند کہا، "تو ہمارے وارث کی نشوونما نے خوشگوار موڑ لیا ہے۔ وہ اپنی ضد بھری تنہائی کے حصار سے نکل رہا ہے۔ ملنسار ہو رہا ہے۔ سماجی تفریق کو ختم کر رہا ہے۔ ایسے رشتے جوڑ رہا ہے جو کبھی ٹوٹ گئے تھے، یا ہو سکتا ہے کبھی بنے ہی نہ پائے ہوں۔ یہاں میں بتا دوں کہ قوم پرست جنونیوں کے حلقوں میں یہ بات پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی جائے گی۔ ہو سکتا ہے اسے خالص آریائی طرزِفکر سے غداری قرار دیا جائے، لیکن میں کون ہوتا ہوں جو یہ بتاؤں کہ دراصل ہمارے قدیم ہیرو جنھوں نے

ملکوں کو آزاد کرانے کی جنگیں لڑیں، اس بات کی نفی نہیں کرتے۔ وہ پورے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے اور اس کا مطلب یہی تھا کہ ان ملکوں میں رہنے والے یہودی بھی آزاد ہو جائیں۔ ہماری تاریخ کے اصل سورما یہودیوں کو گھیٹو میں محبوس کرنا ہرگز برداشت نہ کرتے۔"

جرمن قوم پرست جنونی کا اشارہ واضح طور پر چچا ہیوبرٹ کی طرف تھا۔ چچی سوفی ہمیشہ کی طرح ان کی مدد کو آئیں۔ انھوں نے مضبوطی سے کہا، "بچے کو ایسی پیچیدہ باتوں سے منتشرخیال مت بناؤ۔" پھر انھوں نے اضافہ کیا، "وہ ہم جیسا ہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے الجھائے بغیر اپنے فطری رجحانات کی تکمیل کرنے دی جائے۔ پھر سب کچھ ٹھیک رہے گا۔"

یہ اشارہ چچا ہیوبرٹ کے لیے تھا کہ وہ اپنے قوم پرستانہ ماضی کی جذباتی باقیات کے زیراثر کہیں یہودی لڑکے سے میری دوستی پر اعتراض نہ کریں۔ لیکن چچا ہیوبرٹ جو اپنے کارناموں پر ان گنت براہِ راست حملے اپنی قوتِ برداشت کے بل پر سہار جانے کے عادی تھے، بھلا لطیف کنایوں کے ذریعے کہاں باز رہنے والے تھے؛ اور پھر یہود دشمنی میں تو ان کا مذاق اڑانے والے بھی ان سے متفق ہو جاتے۔ مسکرا کر آنکھیں چمکاتے ہوئے کہنے لگے، "بھئی بڈھا گولڈمیں اگر آج زندہ ہوتا اور دیکھتا... اُفوہ! حد ہو گئی!"

اس طرح وہ گفتگو چل نکلی جس میں سب نے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا، کیوں‌کہ یہ مقامی باتیں تھیں؛ اس میں مقامی گپ شپ کا دخل تھا۔ اس گفتگو سے مجھ پر گولڈمیں گھرانے سے اپنے رشتےداروں کی کشیدگی کا بھید تو کھلا، مگر میرا تصورِ جرمنیت مزید الجھ گیا۔

بڈھا گولڈمیں، یعنی وولف کا دادا، گالیشیا کا رہنے والا تھا جو اس زمانے میں روس کا حصہ تھا۔ روایت تھی کہ وہاں اس کا باپ اُن خداترس اور متقی یہودی مذہبی رہنماؤں میں سے تھا جو ایک قسم کے عدل کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ استیاسنی نے اس پر کہا، "وہ اخلاقی اور مذہبی مسائل میں عدل کرتے تھے۔ اس طرح وہ اُن مشرقی صوفیا سے مماثل تھے جن کی تحریریں ہمارے دینی علما اور اشرافیہ نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جبکہ ان یہودی علما کی تحریریں ہم سراسر نظرانداز کرتے آئے ہیں جن کے احساسات ہم سے قریب تر ہو سکتے ہیں اور جو ہمارے پاس رہتے ہیں۔"

بقیہ داستان یہ تھی کہ بوڑھا گولڈمیں ایک باغی فرزند ثابت ہوا اور اس نے اپنی آزادخیالی کا اعلان کر دیا۔ اس نے گالیشیا سے جرمنی ہجرت کی۔ موسیقی کے رسیا گولڈمیں کو جرمنی میں رچرڈ واگنر کی موسیقی نے مسحور کر دیا۔ دوسری طرف اس نے وافر دولت بھی کما لی۔ "حیراں کی بات تھی کہ اس کے تموّل کا ذریعہ قصّاب خانہ تھا۔" استیاسنی نے اضافہ کیا، "اور کو آج اس بات کو تسلیم کرنے پر کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہو گا مگر یہ

ایک تاریخی حقیقت ہے، گولڈمیں کی طرح ان گنت متموّل یہودیوں کی دولت بسمارک کی اوّلیں رائخ کی بنیادیں رکھنے میں خرچ ہوئی تھی۔" چچا ہیوبی نے ٹکڑا جوڑا، "یہ منافع خور بھی تھے اور قربانیاں بھی دیتے تھے۔ دونوں کام ساتھ ساتھ۔" چچی سوفی نے ہاں میں ہاں ملائی، "ہیوبی ٹھیک کہتے ہیں، پیسے بنانا تو کوئی یہودیوں سے سیکھے۔"

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ بڈھا گولڈمیں اپنے منتخب وطن جرمنی کو چھوڑ کر زرعی خوشحالی کے اس مثالی خطّے میں مویشیوں کا کاروبار کرنے کیوں‌کر آ وارد ہوا، اور کب اس نے یہاں اپنا مضحک خیز، خودنمائی کے نمونے جیسا گھر تعمیر کیا۔ استیاسنی کا کہنا تھا کہ اس نے نیتشے کے افکار سے ایسا پُرخروش سمبندھ قائم کر لیا کہ وہ واگنر کا منکر ہو گیا۔ وہ بسمارک کی مطلق العنانی سے بھی بیزار ہو کر جرمنی سے نکل پڑا تھا، مگر اس کے گھر کا جارحانہ جرمن قوم پرستانہ طرزِتعمیر اس خیال کی تردید کرتا تھا۔ یہ بوالعجبی ہی تو تھی کہ ہیبسبرگ کے خاص الخاص علاقے میں یہ طرزِتعمیر نمودار ہو اور اسے پہلےپہل متعارف کرنے والا ایک یہودی ہو۔ وثوق سے صرف یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ادا چچا ہیوبی کے والد کو پسند نہیں آئی تھی جو بےحد قدامت پرست آسٹریائی تھے اور آسٹریا کے قیصر جوزف فرانز کی تابعداری کو گویا عبادت گردانتے تھے۔ مطلق العناں پدرانہ نظام کے لیے ان کی اطاعت کیشی، بسمارک کے الوہی حقوقِ شہنشاہیت سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ایسے شخص کو ایک ایسا یہودی جو جرمن قوم پرستوں کی نقل کر رہا ہو، دو مکروہ تضادات کے امتزاج کے سوا اور کیا نظر آ سکتا تھا۔ یہ ایسا امتزاج تھا جس کی حیرانی کی دعوتِ فکر سے فرار صرف اس کے وجود کو سراسر نظرانداز کر کے ممکن تھا۔ چچا ہیوبی نے پچھتاتے ہوے کہا، "میرے والد کو مجھ سے شکایت ہو گی کہ میرے جذبات ان سے متصادم تھے۔" چچی سوفی پھر ان کی مدد کو آئیں، "ارے ہیوبی، اس وقت تمھاری عمر ہی کیا تھی؛ مشکل سے اٹھارہ برس کے ہو گے۔ یہ ۱۸۹۰ کی بات ہے۔ اور اب تمھارا اٹھاونواں برس چل رہا ہے۔ اس وقت تم کوئی سمجھ داری کی بات کیسے کر سکتے تھے بھلا؟"

گو میں نے کبھی اپنے والد سے یہ ذکر سنا تھا، لیکن اس وقت میں نیتشے کے فلسفے کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا، نہ مَیں بسمارک کی مطلق العنانی اور اس سے پیدا ہونے والے ردعمل کو سمجھ سکتا تھا، لیکن اتنی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس پوری صورتِ حال میں تضادات ایک عجیب وغریب طریقے سے مستقل متحرک تھے، اور عداوتوں کا سرعت سے تبادلہ ہو رہا تھا۔ بڈھا یہودی گولڈمیں اپنی ہی طرح کا جرمن قوم پرست تھا، اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو حصولِ تعلیم کے لیے ویانا اور پراگ بھیجا۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا ان علوم اور فنون کا مطالعہ کرے جن سے وہ خود محروم رہ گیا تھا اور جو اس کے خیال میں کل عالم انسانیت کے نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔ تقدیر کا کرنا یہ ہوا کہ ان کا سپوت ان شہروں میں جرمنوں کے تعصّب کا شکار بن کر، سردمہری سے صرف علم

طب کا حصول کر کے واپس لوٹا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ یہودیوں کے لیے علیحدہ ریاست کا حامی بن چکا ہے اور صیہونی ہو گیا ہے۔ دیگر یہ کہ اس نے ازمنۂ وسطیٰ سے یہودیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے اعدادوشمار جمع کیے ہیں۔ بڈھا گولڈمیں بیٹے کا منھ تکتا رہ گیا۔ ساری عمر اس نے جرمنوں اور یہودیوں کے اتحاد کی کوشش میں گزار دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہودی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں اور دوسری قوموں کے مذہبی جنون کے ہاتھوں مصائب جھیلتے رہے ہیں۔ اس کی آرزو تھی کہ اس قسم کا جنون یہودیوں میں کبھی پیدا نہ ہو۔

گفتگو کے اس مقام پر استیاسنی جذبات کی رو میں یوں بہہ نکلا کہ اس نے وہ مکروہ غلامانہ نقاب بالکل اتار پھینکا جو وہ عام طور پر اپنے چہرے پر مسلّط کیے رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت کے نفیس ترین پہلو عیاں ہو گئے۔ اس کا چہرہ حسن سے دمک اٹھا۔ جی جان سے وہ ہمیں سمجھا رہا تھا کہ بڈھا گولڈمیں اپنے ترقی پسند انسان دوست خیالات کے بارآور ہونے کے لیے اس علاقے کو مناسب ترین گردانتا تھا جہاں پہلے سے وافر نسلی تنوّع موجود تھا۔ وہ قیصر ولہلم کی آہنی قوم پرستی سے متنفر تھا۔ اس کے خیال میں اس کے فلسفۂ حیات کے لیے ہمارے قصبے کی فضا سازگار تھی کیوں‌کہ قدیم سلطانی نظام میں متنوع مذاہب، زبانوں، قومی تشخص اور نسلی عادات کی پُرامن بقائے باہمی قائم رکھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ لیکن جب استیاسنی نے ہمیں باور کرانا چاہا کہ گولڈمیں کی رہائش گاہ کی رومانی بسمارکی طرزِتعمیر کو ہم اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں تو وہ دوبارہ اپنے طنزیہ "میں کوی ہوتا ہوں" والی طرزِگفتگو میں پلٹ گیا۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں اور مردار مسکراہٹ کے ساتھ اس نے وضاحت کی کہ ہمیں اس طرزِتعمیر کو محض ایک بدمذاق نودولتیے یہودی کی گستاخانہ جرأت سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے، جس نے مشکوک ذرائع سے اچانک دولت حاصل کر لی ہے۔ یہ رومانی جذباتی مینار اور کنگرے اور محرابیں دراصل ایک آفاقی شجاعت آفریں عدل کی آرزو کی نشان دہی کرتے ہیں جس کی جگہ، نسل بعد نسل، ایک بورژوا، بےمزہ، حریصانہ طرزِزندگی نے لے لی ہے۔

چچا ہیوبرٹ شگفتہ مزاجی کی لہر میں اس پھبتی کو بھی یکسر نظرانداز کر گئے۔ انھیں ویسے بھی کسرِنفسی کی عادت تھی۔ اپنے آپ وہ شاذ ہی بڑھ چڑھ کر بولتے تھے۔ ان کے منھ سےکچھ کہلوانے کے لیے چچی سوفی کو انھیں ٹھوکے دینے پڑتے تھے۔ "کیوں ہیوبی، تمھارا کیا خیال ہے؟" وہ کہتیں۔ مگر جب وہ بولتے تو ان کی کھڑنک ظریفانہ حس اور بےپناہ قوتِ مشاہدہ کا اندازہ ہوتا جو استیاسنی کی تصورپرستانہ، پیچ دار اور منقّش گفتگو سے زیادہ کارگر تھی۔ اس بار بھی چچا ہیوبرٹ کی ظرافت نے اپنا کام دکھایا۔

چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں انھوں نے ۱۸۹۰ میں قیصر فرانز جوزف کے پینتالیسویں جشنِ تاج پوشی کے تہوار کی تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ مشرقی یوروپ کے کسی گوتھم

Scanned with CamScanner

(تحصیل) میں سرکاری تقریب کی تمام حماقت افروزیاں، آگ بجھانے والے رضاکاروں کی پریڈ کا انتشار، صرف علامت کے طور پر چند یہودیوں کی بھی میلے میں شمولیت، جن کی ٹوپیاں توتا ناکوں تک پھسلی جاتی ہوں اور پاجامے گھٹنوں سے اوپر چڑھے ہوں، کی سرا پینڈپاجا، پسینے میں شرابور میئر کی سرحدی جرمن بولی میں بےسروپا تقریر، جس میں ہر بات ذومعنی بن جائے۔ کنواریوں کی ٹولیوں کے سفید پہناوے، جس پر لڑکے کھی کھی کر کے فقرے چست کریں۔ چچا ہیوبرٹ کے باپ قصبے میں اپنے "مقدس" شہنشاہ کی حکومت کے مقامی نمائندے کی حیثیت سے متمکن ہیں۔ مقررین ان کو دھڑادھڑ خراج تحسین پیش کر رہے ہیں اور وہ دوسروں پر اعزازات کی بارش کر رہے ہیں۔ آخری انعام دینے کے فوراً بعد وہ معتبرین و معززین اور پادری کی معیت میں ٹاؤن ہال کا رخ کرنے والے ہیں کہ بوڑھا گولڈمین ان کا راستا روک لیتا ہے۔ مجھے یاد آیا، وولف نے اس دن کس طرح میرا راستا روک لیا تھا جب میں اپنا رنگ برنگا ملبوس زیب تن کر کے چہل قدمی کر رہا تھا۔ تصور میں میں نے بڈھے گولڈمین کو بالکل اسی حالت میں دیکھا، وہی آتشدان میں کھورتی بھیڑ کا چہرہ اور پتیلی خوداعتمادی۔ بڈھا یہودی قصبے میں نووارد نہیں ہے۔ یہاں اس کا قلعہ نما مکان کافی عرصے سے موجود ہے۔ اپنی عجیب وغریب عادات کے باعث وہ اب تک لوگوں میں گھل مل نہیں سکا۔ وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس تنہائی کو ختم کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر ایک ایسے شہنشاہ کے جشنِ تاج پوشی کا موقع ہے جس کی شفقت کے زیرسایہ سب قومیں، نسلیں اور مذاہب بحفاظت رہ سکتے ہیں۔

اس تاریخی مدّھ بھیڑ کا ذکر کرتے ہوئے چچا ہیوبرٹ ہنسی نہ روک سکے۔ "بھئی جب میں یاد کرتا ہوں، پاپا نے کیسے اس یہودی اور اس کےعقب میں کھڑی اس کی موٹی عورت کو چُندھیا کر دیکھا تھا، اور یہودی ہاتھ بڑھا کر کہہ رہا تھا، ذرا توجہ فرمائیے ہز ہیرن! کیا اس مسعود موقعے پر میں اپنا تعارف کرا سکتا ہوں؟ ساؤل گولڈمین میرا نام ہے۔ ہز ہیرن اس بات سے تو یقیناً ناواقف نہ ہوں گے کہ گزشتہ چند برسوں سے میں یہاں بس چکا ہوں اور اس برادری میں، جس کا میں ہر لحاظ سے حصہ بن جانا چاہتا ہوں، میں نے اپنا مکان کھڑا کیا ہے۔ گولڈمین کی زبان اور لہجہ درست نہ تھے۔ وہ یہودیوں کی مخصوص ٹٹلاہٹ میں بولتا تھا۔ اس لہجے میں "مکان" کا تلفظ "پاجامے" کا ہم معنی سنائی دے سکتا تھا۔ اور پاپا، وہ میئر کی جانب مڑے اور کہنے لگے، کیا کھڑا کیا ہے اس نے اپنے پاجامے میں؟ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ یہودی اپنی موٹی عورت کو پیچھے کھڑا کیے، پیٹ سینے سے نکالے، ٹیڑھی ٹانگوں اور خم دار نوکوں والی کھڑاویں پہنے اپنا سا منہ لیے کھڑا رہ گیا۔"

ہمیشہ کی طرح چچی سوفی نے تائید کی: "ہاں بھئی، بڈھا گولڈمین حسین تو نہیں تھا۔ گجریلے بال تھے۔ روتھ شیلڈ کی طرح پیسا بنا لیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ بیوی بھی ایسی ہی تھی، موٹی تو دگنی۔"

ابھی تک مجھے گولڈمین کے گھربار میں کسی عورت کے وجود کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بڈھے کی بیوی کے ذکر پر پہلی بار خیال آیا کہ یقیناً اس خاندان میں کچھ عورتیں بھی ہوں گی۔ مجھے یوں ہی سا یاد تھا کہ گولڈمین کے پیانو پر موسیقی کے کاغذوں کے ڈھیر کے پاس میں نے ایک عورت کی تصویر رکھی دیکھی تھی، مگر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ وولف کی ماں ہو سکتی ہے۔ چند دن بعد جب چچی سوفی نے روزانہ ڈاک سے استیاسنی کے نام کا ایک خط مجھے اس کے کمرے تک پہنچانے کے لیے دیا تو میں نے چاندی کے فریم میں جڑی وہی تصویر استیاسنی کی میز پر رکھی دیکھی۔ یہ ایک عام سا چہرہ تھا، کانوں تک تراشے ہوئے بال، حساس ہونٹ اور گہری نگاہیں۔ اس زمانے میں اس انداز کی تصویریں اتروانے کا رواج تھا۔ میں نے سمجھا تھا شاید کسی اداکارہ کی تصویر ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہی ہے جس کی تصویر میں نے وولف کے گھر دیکھی تھی۔ دوسری بار ملنے پر میں نے وولف سے پوچھا، "یہ کس کی تصویر ہے؟" وولف نے سپاٹ لہجے میں کہا، "جس نے مجھے جنم دیا۔" مجھے لگا شاید میں ٹھیک سے اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس لیے میں نے پھر پوچھا،

"تمہارا مطلب ہے تمہاری ماں؟"

"اور کون؟ ماں نہیں تو کیا باپ؟"

"تو کیا... ان کا انتقال ہو گیا؟" میں نے اکھڑا ہوا سا سوال کیا۔

"خدا نہ کرے! وہ کیوں مریں۔"

"میں نے انہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"طلاق ہو گئی ہے۔ وہ ویانا میں رہتی ہیں۔ واٹنر کے ادارے میں ظروف سازی کے شعبے کی صدر ہیں۔"

"استیاسنی انہیں پسند کرتا ہو گا۔ اس کی میز پر ان کی تصویر رکھی ہے۔"

"ہاں۔" وولف نے بےپروائی سے کہا، "وہ ان کے عشّاق میں سے ایک ہے۔ سب سے مشہور پینٹر آلٹن برگ تھا۔"

میں پینٹر آلٹن برگ کو نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی وہ جس طرح اپنی ماں کے بارے میں بات کر رہا تھا اس نے مجھے بھونچکا کر دیا۔

"تم ان سے ملتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جب ویانا جاتا ہوں تب۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔ پھر ایکاایکی بےچین ہو کر کہنے لگا، "خیر، اب تمہیں رخصت ہونا پڑے گا۔ مجھے کام ہے۔"

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب کہ وولف نے اس طرح اچانک ہماری ملاقات کو منقطع کر دیا ہو۔ عام طور پر، میرے خیال میں، جب میری کسی حماقت پر اس کا پارہ چڑھ جاتا تو وہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اسی لیے میں اس سے کبھی پوچھتا نہیں تھا کہ اسے کیا کام ہے۔ مجھے

Scanned with CamScanner

معلوم تھا کہ اسے ہوم ورک نہیں کرنا، نہ کسی امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ لیکن جس ثابت قدمی سے وہ مجھے بھگا دیتا تھا اس کا مجھے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ میں بیزار ہو کر ٹاور میں اسکول کا نصاب پڑھنے لگتا۔ میکس، میرا ڈیش ہاؤنڈ، مطمئن میرے قدموں میں بیٹھا رہتا۔

کبھی کبھی وولف گولڈمیں کی صحبت سے میں اوب جاتا۔ اس کی ناقابلِ تسخیر خوداعتمادی سے میرے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی۔ بڑی سے بڑی بات کی جانب اس کی بےپروائی مجھے کھٹیا محسوس ہوتی۔ مثلاً اپنی ماں کے بارے میں اس قدر سکون سے یہ کہنا کہ وہ اس کے باپ کی بجائے کسی اور کی معشوقہ ہے، بلکہ کئی مردوں کی معشوقہ ہے، میرے دل میں اس کے لیے تنفر پیدا کر دیتا تھا، جس طرح استیاسنی کی مردنی زدہ مسکراہٹ مجھے متنفر کر دیتی تھی۔ استیاسنی کو جب بھی کوئی ایسی بات کہنی ہوتی جس سے میرا کوئی دل پسند عقیدہ پاش پاش ہو جائے تو وہ بات شروع کرنے سے پہلے اپنے ہونٹوں پر وہی مردار مسکراہٹ چسپاں کر لیتا تھا۔ میں اس رویے سے سحرزدہ سا ہو جاتا تھا، مگر یہ باتیں مجھے اکھڑتی بھی تھیں کیونکہ وہ مجھے اپنے سارے عقائد کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ گولڈمیں کے اور ہمارے گھرانوں میں جو سماجی فاصلہ ہے اسے ختم کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ نہ ہی اسے اپنے رشتےداروں کےگھر مدعو کرنے کی کوشش کروں گا۔

لیکن ایک دن میری کوشش یا مرضی کے بغیر ایسا خودبخود ہو گیا۔

اُن چند چیزوں میں جن سے میں اپنے سرکش دوست کو مرعوب کرنے کی توقع رکھتا تھا چچا ہیوبی کی ڈیملر کار بھی تھی جو کسی بھی لڑکے کے دل کی دھڑکن تیز کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے رنگ کا شفاف چمکیلاپن، اس کے زاویوں کی متناسب درستگی، پالتھی کی جلد سے مماثل بھاری ٹائروں پر اس کی جسامت کا قابلِ دید ٹھوس پن-- ہر چیز میں ایک واضح، جنسی قسم کی کشش موجود تھی، کوئی ایسی بات جو آج کی اسمبلی لائن پر کثیر تعداد میں تیار کی گئی کاڑیوں میں عنقا ہے۔ لیکن وولف گولڈمیں اس سے بظاہر ذرا بھی متاثر نہ ہوا، اور بولا، "کار میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ اگر میرے والد چاہیں تو وہ بھی خرید سکتے ہیں۔ مگر ہمارے قصبے کی سڑکوں کو دیکھتے ہوئے تو کار رکھنا پاگل پن ہے۔" اس کی بات اتنی غلط بھی نہ تھی؛ کار اکثر اصطبل کے ایک مقفّل حصے میں کھڑی رہتی تھی، اور عموماً ہم آمدورفت کے لیے بگھیاں ہی استعمال کرتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ چچا ہیوبی اور چچی سوفی اس میں سوار ہو کر چرنووچ تک جاتے؛ بخارِست جانے کا موقع تو اس سے بھی کم آتا تھا۔ اس کے باوجود وولف اس بات کو جھٹلا نہ سکا کہ اسے بھی کار میں ایک لذت آمیز کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہ امتیاز اور تموّل کی علامت تھی، اور پریوں کی کہانیوں کے جادوئی قالین کی طرح وقت اور فاصلے پر اختیار بخشتی تھی۔

باورچی گِب کو، جو شہر آنےجانے میں کار کے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا،

ہمارا ڈیملر سے چھیڑچھاڑ کرنا، اس کا اسٹیئرنگ گھمانا اور غبارے جیسا ہارن بجانا، جو ان دنوں کار کے باہر لگا ہوتا تھا، پسند نہ تھا، اور وہ ہمیں اصطبل کے مقفّل حصّے کی چابی دینے میں آناکانی کرتا تھا۔ وہ اور لوہار ہالر مستقل کار کے انجن اور بیرونی حصوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے، جو نئی کار کی طرح چمکتی رہتی تھی اور جب چلتی تو یوں لگتا تھا جیسے کل ہی کارخانے سے تیار ہو کر نکلی ہو۔ چچا ہیوبی اسے ہمیشہ اس بہترین حالت میں رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ لیکن میں نے اصطبل اور بھوسے کی کوٹھری کی درمیانی دیوار میں ایک روشن دان کا سراغ لگا لیا تھا جہاں سے کم از کم جھانکا تو ضرور جا سکتا تھا۔ اس طرح اگر ہمارا گب سے چابی مانگنے کو دل نہ چاہتا تو ہم بُھوسے کی کوٹھری کی طرف سے چڑھ کر روشن دان تک پہنچ جاتے اور اس میں سے آدھے باہر لٹک کر ڈیملر پر نظر ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے، اور اس کی تکنیکی خصوصیات اور خوبیوں پر دیر تک بحث کرتے رہتے۔ دروازے کے باہر لگا ہوا بھونپو کی شکل کا ہارن وولف کو بہت قدیم انداز کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے محض تفریح طبع کی خاطر جیب سے غلیل نکالی اور غبارے کا نشانہ لیا۔ سیسے کے چھرّے کے ٹکرانے سے ٹائر نے ایک مختصر مگر تیز آواز پیدا کی۔ گب، جو کہیں آس پاس ہی تھا، جلدی سے تالا کھول کر اندر آیا اور پوری گاڑی کا تفصیلی معائنہ کیا؛ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ ہارن بجانے والا کون تھا۔

رفتہ رفتہ اس نے ایک کھیل کی شکل بدل لی، جو ہمیں بسٹر کیٹن یا ہیرلڈ لائیڈ کی فلموں کے مزاحیہ مناظر کی طرح محظوظ کرتا تھا جو ان دنوں بیحد مقبول تھیں۔ جوں ہی ہمیں معلوم ہوتا کہ گب یا ہالر آس پاس موجود ہے، میں غلیل کا چھرّا زور سے غبارے پر مارتا، جس سے پیدا ہونے والی آواز ان میں سے کسی ایک کو تالا کھول کر اندر آنے اور کونےکھدروں کا جائزہ لے کر ہارن بجانے والی مخفی قوت کا پتا چلانے کی کوشش کرنے پر مجبور کر دیتی۔ دریں‌اثنا ہم روشن دان کے پیچھے چھپے اپنے قہقہوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب یہ ناکام تحقیقات اپنے انجام کو پہنچ جاتی تو میں ایک بار پھر جیب سے غلیل نکالتا، اور سارا قصہ پھر سے شروع ہو جاتا۔

ایک بار البتہ میرا ایک چھرّا ہالر کے ہاتھ آ گیا۔ وہ یقیناً اسے پہچان گیا ہو گا، کیونکہ یہ چھرّے اسی کی بھٹی کے ڈھلے ہوئے تھے۔ اس نے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا، اور ہم نے نتائج کے انتظار میں اپنا کھیل روک دیا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور ہم نے اپنی سرگرمی دوبارہ شروع کر دی۔ میں خصوصاً بوڑھے گب کے معاملے میں اتنا بےباک ہو گیا تھا کہ جوں ہی وہ اپنی ناکام تلاش ختم کر کے جانے کے لیے مڑتا تو میں ہارن پر دوسری بار نشانہ لگا دیتا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو کر پلٹتا جیسے کار خودبخود چل پڑی ہو اور ہارن بجا کر اسے راستے سے ہٹنے کو کہہ رہی ہو۔

بوڑھے گب کی سادہ لوحی ہمارے لیے لطف کا بےپناہ سامان تھی۔ غالباً ہالر اسے اپنی

Scanned with CamScanner

دریافت کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا، یا پھر وہ کمینگی سے انتظار کر رہا تھا کہ گب اس معاملے کا خود پتا لگائے۔ لیکن گب کو ہماری شرارت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا، اور وہ بدحواس ہو ہو کر ہمیں محظوظ کرتا رہا۔

ظاہر ہے یہ کھیل ہمیشہ تو جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک دن جب گب کار کا معائنہ کر کے واپس مڑ رہا تھا، میں نے اپنی پسلیوں میں وولف کے باربار کہنیاں مار کر اصرار کرنے کے باوجود نشانہ لگانے سے انکار کر دیا۔ ہاں یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جب وولف نے میرے ہاتھ سے غلیل لی تو میں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ اس نے سامنے رکھا ہوا ایک چھرّا اٹھا کر غلیل کے ربڑ والے حصے میں رکھا، اسے پوری قوت سے کھینچا، اور نشانہ باندھ کر چھوڑ دیا۔

اتنا تو مجھے اندازہ تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہو جائے گا۔ لیکن اس کا چھرّا نشانے سے اتنی دور تھا کہ ہاروں کے آس پاس لگنے کی بجائے کار کے سامنے والے شیشے کے عین درمیان میں لگا۔ چھرّے کے لگنے سے ربڑ ربڑ ہوجانے والے حصے کے اردگرد پورے شیشے پر مکڑی کا ایک باریک جال سا بن گیا۔

اب چھپنے کی کوشش بےسود تھی۔ "میں چچا ہیوبی سے کہوں گا کہ یہ میں نے کیا ہے،" میں نے وولف سے کہا۔ اس کی وجہ میری کشادہ دلی سے زیادہ یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ گاؤں کے ایک یہودی لڑکے کے مقابلے میں میرا جرم کم سنگین سمجھا جائے گا۔

لیکن وولف یہ سن کر بھڑک اٹھا۔ "کیا تم میرے سرپرست ہو؟" اس کا بھیڑ جیسا چہرہ یوں سرخ ہو رہا تھا جیسے وہ بہت تیز آگ کے روبرو ہو۔ "مجھے کسی جرمن سورما کی ضرورت نہیں۔ ایک شیشے کی اوقات ہی کیا ہے! میرا باپ اس کی قیمت ادا کر دے گا۔"

"یہ بات اندر جا کر کہنا،" گب نے کہا، اور وولف کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ، ورنہ میں اتنے زور سے چلاؤں گا کہ سارا گاؤں اکٹھا ہو جائے گا،" وولف نے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو میں ڈر کر بھاگ جاؤں گا؟" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرے رشتےداروں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

شہ نشین میں، جہاں گب ہمیں چچی سوفی کا انتظار کرنے کے لیے چھوڑ کر گیا تھا، دیواروں پر شکار کے فخریہ حاصلات آویزاں دیکھ کر وولف پر دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑا۔ "ارے یہ سینگ! اگر میں تم لوگوں کی جگہ ہوتا تو کم ازکم انہیں یوں سرِعام تو نہ لٹکاتا۔" پھر اس کی نظر پیانو پر جا پڑی۔ "اوہ! اصلی ہاؤسی ڈورفر پیانو! یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

اس نے پیانو کا سرپوش ہٹایا اور ایک دو سُر بجائے۔ پھر وہ پیر سے اسٹول گھسیٹ کر پیانو کے سامنے بیٹھ گیا اور ایسی مشاقی سے بجانے لگا کہ میں ششدر رہ گیا۔

چچی سوفی کمرے میں داخل ہوئیں تو ٹھٹک گئیں۔ جب تک وولف پیانو بجاتا رہا وہ کھڑی رہیں۔ جب وولف ختم کر چکا تو انہوں نے کہا،

"بہت خوب! کب سے بجا رہے ہو؟ کس سے سیکھا ہے؟"

وولف گولڈمین نے ان کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ دوسری سمت رخ کر کے کہنے لگا، "عام لوگ شوپاں سے ہمیشہ متاثر ہو جاتے ہیں۔ آج کل میں برائم پر کام کر رہا ہوں۔"

اس نے پھر ایک دو سُر بجائے۔ پھر چچی سوفی کی جانب مڑ کر بولا، "میں نے آپ کی کار کا شیشہ توڑ دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن پہلے مجھے سلام کرو اور پھر میری بات کا جواب دو،" چچی سوفی نے ہنس کر کہا۔ میں حیران رہ گیا۔

اور اس طرح پہلی بار جلی کے جذبے سے میرا تعارف ہوا۔ رشک سے پیدا ہونے والا حسد جو ایک بدصورت جذبہ ہوتا ہے، اور بدطینت خیالات اور خواہشات کو جنم دیتا ہے۔ مجھے اپنی روح میں ایک بار پھر وہی خالی پن محسوس ہونے لگا، اور اسکشنو نے دوبارہ مجھ پر حملہ کر دیا۔

چچی سوفی کمسن گولڈمین پر فدا ہو گئی تھیں۔ اب یہ روز کا معمول بن گیا کہ ناشتے کے فوراً بعد وولف ہمارے گھر آ جاتا اور پیانو پر مشق کرتا۔ موسیقی کی طوفانی لہروں پر پورا گھر جھولتا رہتا۔ وولف کے چہرے پر کامیاب عاشق کی سی روشنی رہتی۔ چچی سوفی مبہوت ہو کر اس کا پیانو سنتیں۔ کبھی کبھی وہ خود بھی بجاتیں۔ ان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو جاتا۔ "یہ تو بس یوں ہی۔۔۔" وہ کہتیں۔ "میرے بچپن میں اس ٹکڑے کو یوں بجاتے تھے۔"

مجھ جیسے تیرہ سالہ لڑکے تک کو صاف نظر آ رہا تھا کہ چچی سوفی کی ساری دبی ہوئی بھولی بسری خواہشیں، امنگیں اور امیدیں اس سرخ بالوں والے لڑکے میں مجسّم ہو گئی ہیں۔ جب کبھی میری اور چچا ہیوبرٹ کی نظریں ملتیں تو ان بےتکلفانہ اپنائیت بھرے قومی گیتوں کے قہقہے اور زمانے کو گنوانے کا پچھتاوا دونوں کی نظروں میں ابھر آتا۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں یہودی چھوکرے سے نفرت صاف پڑھ سکتے تھے جس نے، بقول استیاسنی، آریاؤں کے سوتی فن میں مہارت کے حیلے سے ایک ایسی عورت کے قدم ڈگمگا دیے تھے جو، بصورتِ دیگر، اتنی ثابت قدم، محتاط، مثالی خاتون تھی۔ استیاسنی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر مجھے جھرجھری آ جاتی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے احساسات اور خیالات سمجھ رہا ہے۔ یہ بات اتنی عیاں تھی کہ ہر شخص حتیٰ کہ باورچی گب تک خوب سمجھ رہا تھا۔ صرف چچی سوفی تھیں جو ہر بات سے بےخبر ہو چکی تھیں۔ گونج دار موسیقی میں پیوست ان شاموں کی کشیدگی سب محسوس کر سکتے تھے۔ لیکن اس پورے منظر کے دو مرکزی کردار وولف اور چچی سوفی ہنسوں کا جوڑا بنے گردوپیش سے بےنیاز رہتے۔ گب شور مچاتا رہتا، "کھانا آدھ گھنٹے سے میز پر پڑا ہے۔" لیکن یہ دونوں پیانو بجاتے رہتے۔ چچا

Scanned with CamScanner

بیوبرٹ کھانستے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ خجالت سے ہم نے ایک دوسرے سے نظریں ملانا چھوڑ دی تھیں۔

آخر چچی سوفی کہتیں، "آج کے لیے اتنا کافی ہے۔" پھر گب پر جھنجھلاتیں، "اب تک کھانا نہیں لگایا؟" اور جب وہ بتاتا کہ کھانا دوسری بار گرم کیا جا رہا ہے تو وہ بس اتنا کہتیں کہ ننھے گولڈمیں کے لیے بھی ایک پلیٹ لگا دینا۔

ایک شام چچا ہیوبی نے عام سے لہجے میں تجویز پیش کی کہ اگر وولف مستقل طور پر گھر میں منتقل ہو جائے تو زیادہ سہولت رہے گی۔ توقع کے مطابق چچی سوفی نے ان کی تائید کی، گو کہ اس بار ان کا انداز غائب دماغی کا اور کچھ کچھ میکانیکی تھا۔ "کیوں نہیں! ہیوبی ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ زیادہ اچھا رہے گا۔" اور ہم سب کھڑے چچی سوفی کو وولف گولڈمیں کے دبلے کندھوں کے گرد بازو رکھ کر اسے کھانے کے کمرے میں لے جاتے دیکھتے رہتے، اور اس منظر کی معنویت اور مضحکہ خیزی کے شدید احساس کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے میں داخل ہو جاتے۔

ان حالات سے استیاسنی خوب لطف لے رہا تھا۔ وہ اپنی کانچ کی سی آنکھوں سے گب کا تعاقب کرتا رہتا جو کھانے کے وقت پہلے سے بڑھ کر ہمارا خیال رکھتا، انہماک سے ہماری پلیٹ میں کھانا ڈالتا اور گوشت کے بہتر ٹکڑوں کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتا۔ اس کی کوشش رہتی کہ چچی سوفی وولف کی پلیٹ میں خود کھانا نہ نکالیں۔ یہودی چھوکرے کو وہ سب سے آخر میں قاب پیش کرتا۔ استیاسنی مردار مسکراہٹ کے ساتھ کہتا، "مبارک ہو! وفاداروں نے ابھی خاندان سے دغا نہیں کی ہے۔" وہ ہنستا۔ چچا بیوبرٹ اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے اور گڑبڑا کر کہتے، "استیاسنی! یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

انھی دنوں چچا ہیوبی کی اور میری پرانی قرابت داری کی اپنائیت دوستی میں ڈھلنے لگی۔ ایک نوعمر لڑکے اور ایک عمررسیدہ آدمی کے درمیان یہ ایسا سادہ، بارآور اور فراواں تعلق تھا جو ہم عمروں کے رشتوں کی شدتِ جذبات اور پیچیدگیوں سے مبرّا ہوتا ہے۔ اس میں یک جانب صرف شفقت ہوتی ہے اور دوسری جانب صرف بھروسا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ شہ سواری کرنا بہت پسند تھا۔ اس کا باعث صرف یہ نہ تھا کہ مجھے کاؤنٹ سیبی ڈور کا جانشین بننا تھا۔ ان کی نصیحتیں اور حکایتیں میں پوری توجہ سے سنتا تھا۔ ان کی تمام زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزری تھی۔ گھڑسواری ان کے لیے ایک نظریہ بن گئی تھی۔ وہ تھے بھی ماہر شہ سوار، حالاں کہ ان کے اعضا میں نزاکت تھی۔ یہ خیال بھی میرے لیے دل خوش کن تھا کہ میرا مذاق اڑانے والے گلی کے چھوکرے مجھے چچا ہیوبی کے ساتھ گھڑسواری کرتے ہوئے دیکھیں گے اور ان پر واضح ہو جائے گا کہ میرے پیچھے کتنی بڑی طاقت ہے۔

رفتہ رفتہ میں نے وولف اور چچی سوفی کے نئے پُرخروش رشتے کی جانب بےنیازانہ رویّہ

اختیار کر لیا۔ میں وولف کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتا، جو میرے خیال میں اشرافیہ کے لیے مناسب تھا۔ ہاں، بس ایک بار میں نے وولف کو پیڑ میں چھپے الّو کے دو بچوں کو دیکھنے کی دعوت دی، اور وہ جھنجھلا کر بدتمیزی کرنے لگا، "تم جرمن جانوروں کے کتنے شوقین ہو۔ انسانوں سے زیادہ جانوروں کے بارے میں جانتے ہو گے۔" غصّے سے میرا خون کھول گیا۔ ہمارے گھر آ کر، ہماری مدارات سے فیض یاب ہو کر وہ ہمارے ہی بارے میں کیسے اتنی حقارت سے بات کر سکتا تھا؟ جواب میں وولف بےشرمی سے ہنسا، اور کہنے لگا، "میں تم لوگوں جیسا ہی جاؤں تو تمھاری چچی تو بہت خوش ہوں گی۔ انھوں نے مجھے رِلکے کی کتابیں پڑھنے کے لیے دی ہیں، میں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار چلا جا رہا ہوں، سارا سارا دن، ساری ساری رات... مگر آج کل میں کرافٹ اِبینگ کو پڑھ رہا ہوں۔ اس کے پڑھنے سے تو تمھارا بھی بھلا ہو گا۔ شاید تمھاری سمجھ میں آ جائے کہ تمھارے چچا جو تمھیں گھوڑے پر بٹھا کر جنگل کے اندر، اور اندر لے جاتے ہیں، وہ اصل میں تم سے چاہتے کیا ہیں۔"

آخر وولف نے خود ہی مجھے سمجھایا۔ چچا بیوبرٹ پر سب کو لوطی ہونے کا شک تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے شکاری دوست جو ٹاور میں ٹھہرائے جاتے ہیں، دراصل اسی مقصد سے آتے ہیں۔ اور میرے یہ سیب جیسے سرخ گالوں والے رشتےدار قصبے والوں کے لیے مذاق کا سامان بنے ہوئے ہیں، جو ان کے گول مٹول سرینوں کو جنسی کج روی کا رواں دواں اشتہار سمجھتے ہیں۔

لیکن چچی سوفی سے ان کی اتنی مثالی، کامیاب شادی؟ "کیا تم سچ مچ اتنے احمق ہو؟" وولف زچ ہو کر چلایا۔ "...اور یہ استیاسنی کون ہے؟ برسوں سے کیوں کر اس گھر میں رہ رہا ہے؟ چچی سوفی ڈاکٹر گولڈمیں سے کیوں اتنی متنفّر رہتی ہیں؟ صرف اس لیے کہ کسی زمانے میں ان کی بیوی کے استیاسنی سے تعلقات تھے۔ تم جرمن! تم ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہو جیسے تمھاری عورتوں اور مردوں کی ٹانگوں کے بیچ میں کچھ ہے ہی نہیں!"

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اگلے چند ہفتوں تک مجھے صرف وولف ہی نہیں، ہر شخص سے کس قدر کراہت محسوس ہوتی رہی۔ میری گھی میں گاؤں کا لوہار ہالر بھی شامل تھا۔ وولف نے مجھے بتایا تھا کہ ایک بار ڈاکٹر گولڈمیں نے اس کے لِنگ پر ایک زخم میں ٹانکے لگائے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ انسانی دانتوں کے کاٹے کا زخم ہے، کسی اناڑی عورت کے دانتوں کا نہیں، بلکہ جرمن مردانگی کی اس مورت کے بدن پر کسی مرد نے شہوت میں آ کر طبع آزمائی کی تھی۔ جب میں اگلی بار اس کی بھٹی میں سیسا پگھلا کر غلیل کے چھرّے بنانے گیا، اور اس نے آنکھ دبا کر مجھ سے کہا، "اس دن میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ مجھے کیا انعام ملے گا؟" تو مجھے ابکائی آ گئی۔ وولف نے مجھے بتایا تھا کہ لوطی ہماری عمر کے لڑکوں پر رال ٹپکاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

مجھے گھر یاد آنے لگا۔ اپنی ماں یاد آنے لگیں۔ ان کی شدّت اور جذباتیت تو مجھے مضطرب کر دیتی تھی، لیکن غالباً ان کے احساسات اپنی بڑی چچیری بہن سے زیادہ مستحکم ہوں گے۔ اور اب تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بھی ڈگمگا سکتی ہیں، اپنے سے باہر ہو سکتی ہیں۔ اور گو اس خیال سے مجھے نفرت محسوس ہوئی، پھر بھی میں دل ہی دل میں یہ مقابلہ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر میری ماں استیاسنی سے عشق کرتیں تو اس رشتے میں زیادہ شدّت اور شعریت ہوتی۔ ویسے میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میری ماں استیاسنی سے ہم آغوش ہوں اور میں، وولف کی طرح، بےشرمی سے اس بارے میں باتیں کروں۔ اب مجھے اپنے سندی باپ کا شکار کا خبط بھی ایک باوقار انسان کا فرار کا طریقہ نظر آنے لگا تھا، جو میدانوں کی غلاظت پر تنہائی اور کوہستانی زندگی کو ترجیح دیتا تھا۔ میں خود اس سارے ہنگامے سے اکتا گیا تھا اور زیادہ وقت ٹاور میں امتحان کی تیاری میں گزارنے لگا تھا۔

پرانی دوستی کے ناتے، جو یوں بھی ہمارے علیحدہ اسکولوں کے آغاز پر ختم ہونے والی تھی، مَیں وولف کو چھوڑنے اس کے گھر تک گیا۔ ڈاکٹر گولڈمیں اس دن بھی مریض دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ہم ان کے آفس کا جی بھر کر معائنہ کر سکتے تھے۔ اس دن مجھے اس مشہور ڈھانچے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، جو مجھے بہت ڈراونا لگا۔ اس کی ہڈیاں اتنی چمک دار تھیں کہ یقین نہیں آتا تھا کہ کبھی یہ کسی انسان کے بدن میں پوشیدہ رہی ہوں گی۔ لیکن ڈھانچے سے بڑھ کر مجھے ان کی ایک الیکٹروسٹیٹک مشین نے مسحور کیا جو اعصابی مریضوں کے لیے تھی۔ وولف نے مجھے بتایا کہ مریض دھات کے دو سلاخچوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا تھا، ان سلاخچوں میں برقی رو دوڑائی جا سکتی تھی، جو معمولی سی سنسناہٹ سے بتدریج زوردار جھٹکے تک جا سکتی تھی۔

وولف چاہتا تھا کہ میں سلاخچوں کو پکڑ کر دیکھوں، لیکن مجھے ڈر لگا۔ "کیوں؟" وولف نے حقارت سے کہا، "جرمن سورما کو ذرا سی گدگدی سے ڈر لگ رہا ہے کیا؟" دھات کے سلاخچے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیے اور سر کے اشارے سے مجھے مشین کا بٹن دبانے کے لیے کہا۔ "چھوٹے والے بٹن کو دباؤ، مگر آہستہ آہستہ۔"

بعد میں مَیں کسی طرح نہ بتا پایا کہ کس جذبے کے زیرِاثر میں نے بٹن آہستہ آہستہ دبانے کے بدلے وحشیانہ طریقے سے پورے زور سے دبا دیا۔ اس وقت تو وولف کی حالت بہت مضحکہ خیز تھی۔ وہ پیچھے ہٹا، پھر بل کھا کر دوہرا ہو گیا۔ اس نے لاتیں چلانے کی کوشش کی مگر ٹانگوں میں جنبش نہ ہو سکی۔ اس کے سرخ بال اس کے سر پر سئی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ مسرت تو مجھے اس کی ملتجی نگاہوں سے ہوئی جب وہ ہاتھ پھیلا کر خود کو نجات دلانے کے لیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام خوداعتمادی کافور ہو چکی تھی، اور اس کا بھیڑ جیسا چہرہ اب کسی قربانی کی بھیڑ کا چہرہ نظر آ رہا تھا، قصّاب خانے لے جائے جانے والے مویشیوں کا چہرہ جن کے کاروبار سے

اس کے دادا نے دولت بٹوری تھی۔

بعد میں الزامات تو کچھ اور لگائے گئے، لیکن میرا خیال نہیں کہ بٹن واپس دبانے میں مَیں نے غیرضروری دیر لگائی کہ وہ سلاخچوں کو پھینک سکے۔ جب میں نے اسے نجات دلائی تو وہ گھٹنوں کے بل، سرنگوں، قابلِ رحم حالت میں چلا رہا تھا، "میرے ہاتھ! میرے ہاتھ!"

موسم گرما دھیرے دھیرے کھل رہا تھا، اور میں اپنے رشتےداروں کے گھر جیسے ہوا میں معلّق تھا۔ میں اس آگہی کے ساتھ رہ رہا تھا کہ میں نے ایک جرم کیا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ جنگجو انجمنوں کی اصطلاح میں مَیں "کالا" ہو گیا تھا، اور اب کتنی بار بھی ڈوئل لڑوں خود کو "چٹّا" نہیں کر سکتا تھا۔ چچا ہیوبی نے میری پُرزور طرفداری کی اور میری حرکت کو معمولی شرارت سے تعبیر کیا، جو کہ وہ بہرحال تھی، کیونکہ چند دنوں کے علاج کے بعد وولف گولڈمیں کے ہاتھ پہلے کی طرح چست اور پھرتیلے ہو گئے۔ لیکن چچا ہیوبی کے دوستانہ رویّے کے مقاصد میری نظر میں مشکوک ہو گئے تھے! لاکھ چاہنے پر بھی ان کے بارے میں سوچنے سے مَیں خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں آپ ہی آپ ان سے بھی دور ہوتا گیا۔ چچی سوفی نے اس صورتِ حال کو بہت ٹھنڈے مزاج کے ساتھ قبول کیا۔ وولف کے ساتھ اپنے وارفتہ تعلقات کے اختتام پر انھوں نے ماتم نہیں کیا۔ وہ ایک خواب تھا، اور چچی سوفی نے سب پر ظاہر ہو جانے دیا کہ اب وہ خواب سے بیدار ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے وولف گولڈمیں اس کے بعد ہمارے گھر کبھی نہیں آیا۔ اس کے باپ نے اس کے ہاتھوں کا پُراہتمام علاج کرنے کے بعد اسے معمول سے قبل ہی ویانا، اس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ وولف ہم میں کسی کو الوداع کہنے بھی نہیں آیا۔

گولڈمیں گھرانے کی خیرخبر مجھے استیاسنی سے مل سکتی تھی، لیکن یہ نازک موضوع میں نے کبھی چھیڑا ہی نہیں۔ اب مجھے اس سے خوف بھی نہیں آتا تھا۔ اس کی جانب میرا رویّہ سردمہری کا اور عمومی رہتا تھا۔ یہ سبق میں نے چچی سوفی سے حاصل کیا تھا۔ ظاہر ہے میں لوہار بالر سے بھی کترانے لگا تھا۔ میری غلیل ایک کھونٹی پر ٹنگی رہتی، اسے استعمال کرنا میں نے چھوڑ دیا تھا۔ مرغزاروں میں میری آوارہ گردی کا دوبارہ آغاز ہو گیا تھا۔ میکس میرا ساتھی تھا جو مجھ سے ہر بات پر متفق تھا۔ میں نے اس کی بےوفائی کو، جو اس نے وولف کا گرویدہ ہو کر کی تھی، معاف کر دیا تھا، کیونکہ بہرحال وولف میرا بھی دوست رہا تھا۔ وولف کے لیے میکس کی وارفتگی بہت طوفانی تھی، لیکن وہ تھا بھی تو چھوٹا۔

بہرحال مَیں میکس کو خونخوار، لڑیّا کتا بنانے کا عزم کر چکا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت کی تعمیر کرنی تھی! اسے سکھانا تھا کہ کیسے خطرناک صورتِ حال میں چھلانگ لگا دے۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ اندھادھند لڑیّا کتا مالک سے اندھی وفاداری کا وصف اپنانے

Scanned with CamScanner

پر بھی مجبور ہو گا۔

احاطے کے ایک گوشے میں، کیکروں کے نیچے، سبزے کے وہ خطّے تھے جو کسی کام کے لیے استعمال نہ ہوتے تھے۔ یہاں پرانے، ٹوٹے پھوٹے، زنگ خوردہ اوزار اور صندوقچے پڑے تھے۔ یہ جگہ آوارہ بلّیوں کے لیے پناہ گاہ بن گئی تھی۔ یہیں وہ اپنے بلونگڑے جنتیں۔ میں ہمیشہ میکس کو ان بلیوں کے پیچھے دوڑاتا، مگر وہ بھاگ نکلتیں۔ آخر میکس کو خونخواری کا سبق پڑھانے کے لیے میں نے ایک طریقہ ایجاد کیا۔ میں نے ایک تنگ صندوقچے کا ڈھکنا علیحدہ کر کے اسے زمین میں دفن کر دیا جیسے وہ کسی لومڑی کا بھٹ ہو۔ ایک بلی کو آسانی سے پکڑ کر میں نے صندوقچے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد یہی کام باقی رہتا تھا کہ میکس کو بھی بلی کے ساتھ قید کر دیا جائے۔

اس تجربے کا نتیجہ افسوسناک نکلا۔ ذرا سی دیر میں میکس ناک پر کھرونچا کھا کر چاؤں چاؤں کرتا ہوا صندوق سے گولی کی طرح برآمد ہوا۔ اس نے میرے احکامات کی ذرا پروا نہ کی۔ مارے غصے کے میں نے بلّی کو باہر کھینچ نکالنے کے لیے صندوقچے میں ہاتھ ڈالا تاکہ لڑائی باہر جاری رہ سکے۔ صندوقچے کے اندر میں نے ایک رویں‌دار، گرم متحرک شے کو پکڑ لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں شدید درد کی لہر دوڑ گئی۔ بلی نے میرے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دانت گاڑ دیے تھے۔ میں ہاتھ چھڑا نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنی گرفت اور بھی سخت کر کے بلّی کو باہر گھسیٹا۔ اس کے دانت میرے گوشت میں اتنے گہرے گڑے ہوئے تھے کہ میں جھٹک کر اسے پرے نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اور بھی شدّت سے اسے دبوچ لیا۔ بلی دیوانگی سے میرے بازو پر چاروں پیروں سے پنجے مارنے لگی۔ میری قمیص کے ساتھ ساتھ بازو کے گوشت کے بھی پرخچے اڑ گئے۔

بدقسمتی سے اسی وقت چچی سوفی کی ملازمہ فلورنس وہاں سے گزری۔ مجھے لہولہان دیکھ کر اس نے دیوانگی سے شور مچانا شروع کر دیا۔ احساسِ جرم سے میں بوکھلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے دوسرے لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں۔ باورچی گب احاطے کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ فلورنس کی چیخوں سے مجمع اکٹھا ہونے والا تھا۔ سب لوگ ہر سمت سے جائے وقوعہ کی جانب لپکے آ رہے تھے۔ بلّی کو ہاتھ میں لٹکائے، میں اندھادھند باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ گیٹ سے کچھ دور، پھولوں سے ڈھکے گڑھوں کے کنارے، میں نے بلی کی چھاتی پر گھٹنا رکھ کر دبا دیا۔ اب اسے گرفت ڈھیلی کرنی ہی پڑی۔ میرے گھٹنے کے نیچے اس کی پسلیاں چٹخ گئی تھیں۔ اس کے خوفناک دانت میرے گوشت سے باہر نکل آئے؛ میں نے اپنا ہاتھ اس خونیں، دندانے‌دار شکنجے سے آزاد کرا لیا۔ لیکن جب میں کھڑا ہوا تو چیختے چلاتے گلی کے چھوکروں میں گھرا ہوا تھا۔

پورے بازو کی حالت خستہ تھی۔ بلی کافی گندی تھی اور زخم کے سڑنے کا پورا امکان تھا۔ مجھے ٹیٹنس کا انجکشن لگانا لازمی تھا۔ کم از کم چچی سوفی نے تو تحکّمانہ لہجے

میں یہی کہا۔ یہودی چھوکرے اور قصبے کے دوسرے باسی میرے چاروں طرف کھڑے مجھے نفرت سے گھور رہے تھے۔

مجھے ڈاکٹر گولڈمیں کے یہاں گھسیٹ کر لے جایا گیا۔

ہو سکتا ہے گاؤں میں کسی بھی بات کے پھیلنے کے غیرمعمولی برق رفتار ذریعے سے ڈاکٹر گولڈمیں کو پہلے ہی معلوم ہو گیا ہو کہ میرے ہاتھ پر زخم کی حالات میں لگا ہے۔ انھوں نے میری مرہم پٹّی کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ چچی سوفی سے، جو پہلی بار ان کے روبرو ہوئی تھیں، وہ اتنی درشتی اور اہانت سے پیش آئے کہ دیکھنے والے تک بعد میں تسلیم کرتے تھے کہ ان کا سلوک قطعی ناروا تھا۔

افسوس کہ یہ واقعات بےنتیجہ ثابت نہ ہوئے، اگرچہ اس کے نتائج میرے لیے اتنے سنگین نہ تھے۔ پہلے مجھے دوافروش کے پاس لے جایا گیا، جہاں میرے زخم کی جیسےتیسے مرہم پٹّی کر دی گئی۔ اس کے بعد مجھے یہ منظر دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی کہ چچا ہیوبی کی مشہور ڈیملر گاڑی کو صرف میرے لیے باہر نکالا گیا، اور گلی کے حاسد چھوکروں نے، ایک بھاری دل والے جلوس کی صورت میں، مجھے اس میں سواری کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے چرنووچ، اپنے ماں باپ کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہاں میرا علاج بھی ہوا اور دُلار بھی۔ میں پھر چچا ہیوبی اور چچی سوفی کے گھر واپس نہیں آیا۔ امتحان کی بقیہ تیاریاں میں نے اپنے گھر ہی میں کیں، جس میں میں، برسبیلِ تذکرہ، بہت عمدہ طور پر کامیاب ہو گیا۔

البتہ چچا ہیوبی اور چچی سوفی کے لیے، اور یقیناً ڈاکٹر گولڈمیں اور شاید میرے دوست وولف کے لیے، اور حتیٰ کہ استیاسنی کے لیے بھی یہ واقعات بڑی دوررس تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ یہ لغو خیال استیاسنی کا بھی ہو سکتا تھا کہ چچی سوفی کے ساتھ ناروا سلوک کے جواب میں چچا ہیوبی ڈاکٹر گولڈمیں کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیں؛ درحقیقت آسٹروہنگیرین فوج کے سابق افسر اور ڈوئل کی انجمن کا رکن ہونے کی حیثیت سے چچا ہیوبی پر یہ ذمےداری عائد ہوتی تھی۔ لیکن استیاسنی نے یہ تجویز پیش کی یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چچا ہیوبی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا؛ اور ان کے اس انکار کو میرے والد کی تائید بھی حاصل ہوئی جن کا کہنا تھا کہ کسی معزز جرمن سے یہ توقع کرنا کہ وہ کسی یہودی کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج دے ایک نہایت بےہودہ بات ہے۔

بہرحال اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ چچا ہیوبی کے انکار کی وجہ شمشیرزنی میں ڈاکٹر گولڈمیں کی مہارت رہی ہو، کیونکہ تک اتنی سنگین تھی کہ اس کا فیصلہ پستولوں ہی سے ہو سکتا تھا جن کے استعمال پر چچا ہیوبی کو یقینی طور پر زیادہ مہارت حاصل تھی۔ اس کے باوجود ان کے مقابلے سے گریز کی افواہیں اتنی سخت جاں ثابت ہوئیں کہ چچا ہیوبی کی انجمن کی عدالت کو معاملے کا جائزہ لینا پڑا۔ عدالت نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا کہ یہودی ڈاکٹر گولڈمیں کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج نہیں دیا جا سکتا۔ وہ

Scanned with CamScanner

اگرچہ دانشور تھے لیکن بلاشبہ عالم بھی تھے، اس لیے ہتھیار کے ذریعے اپنی عزت کا دفاع کرنے کا انہیں بھی کچھ نہ کچھ حق حاصل تھا۔ چچا ببوبی کو، جنہیں اس وقت تک ایک انتہائی معزز رکن کی حیثیت حاصل رہی تھی، عدالت کی جانب سے بزدلی کا مجرم ٹھہرایا گیا، اور ازحد اہانت آمیز طریقے سے انجمن سے خارج کر دیا گیا۔ اس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ان کے بیشتر پرانے شکاری ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

چچی سوفی کا رویہ بھی بدل گیا۔ ان کی صاف گو اور گرم جوش حقیقت پسندی نے تندوتیز کاٹ اختیار کر لی، جو کبھی کبھی طعن و تشنیع کی شکل میں ظاہر ہونے لگی۔ چچا ببوبی کی ہر بات کی تائید کرنے کی بجائے، جیسا کہ وہ زندگی بھر کرتی چلی آئی تھیں، اب وہ اکثر ان کی تردید کرنے لگیں۔ "ببوبی ٹھیک کہتے ہیں" کا فقرہ رفتہ رفتہ "اس قسم کی باتیں کرنا تو ببوبی کی پرانی عادت ہے" میں ڈھل گیا۔

یہ سب خبریں مجھے لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوئیں، کیونکہ میں اس کے بعد ان سے کبھی نہیں ملا۔ میں پورا تعلیمی سال آسٹریا میں گزارتا اور تعطیلات میں سیروسفر میں مشغول رہتا، اور ہاں، میں پہلے سے بھی زیادہ ذوق و شوق سے اپنے والد کے ساتھ ان کی شکاری مہمّات میں شریک ہونے لگا۔ جب چچی سوفی کے انتقال کی خبر آئی تو میں اسکول کے آخری امتحان کی تیاری میں مصروف تھا؛ میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ کچھ مہینوں بعد چچا ببوبی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی جائیداد ان کے ایک دور کے عزیز کو وراثت میں مل گئی۔ میں اس کے بعد وہاں کبھی نہیں گیا۔

ایک بار ویانا میں مجھے وولف گولڈمین کا پتا لگانے کا خیال آیا۔ اس کی ماں کے ذریعے، جو مجھے معلوم تھا کہ وائنر کے ادارے میں ظروف سازی کے شعبے کی سربراہ ہیں، یا موسیقی کی اکیڈمی میں، جہاں وولف تعلیم پا رہا ہو گا، اس سے جا ملنا یقیناً ممکن تھا۔ لیکن کچھ تو کاہلی کے باعث اور کچھ اپنے ضمیر کے بھاری بوجھ کی وجہ سے، میں نے اسے تلاش نہیں کیا۔ اگرچہ ڈاکٹر گولڈمین نے اپنی عزت کے دفاع میں چچا ببوبی پر فتح پا لی تھی، لیکن میرا علاج کرنے سے انکار ان کے حق میں برا ثابت ہوا۔ میڈیکل کمیشن نے ان کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا۔ ڈاکٹر گولڈمین کو وہ گاؤں چھوڑنا پڑا جہاں ان کے باپ نے، گویا ایک ارضِ موعود میں، "اپنا مکاں کھڑا کیا تھا۔" ان کا ولا رفتہ رفتہ کھنڈر ہو گیا۔

استیاسنی کہیں اور رہنے لگا تھا، لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں گیا۔ صرف ایک بار کرسمس کے تہوار پر مجھے اس کا تحفہ ملا تھا۔ یہ روکوکو دور کے لکڑی اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دو نصف مجسمے تھے۔ استیاسنی کے نوادرات کے ذخیرے میں مَیں نے انہیں اس کے کمرے میں دیکھا تھا، اور ان سے مجھے بیک وقت نفرت اور کشش محسوس ہوئی تھی؛ یہ ایک مرد اور ایک عورت کے چہروں کی شبیہیں تھیں جنہیں دونیم کر دیا گیا تھا۔ ایک جانب سے بہت خوب صورت خدوخال نظر آتے تھے، جب کہ دوسری جانب سے

کھوپڑی کی اندرونی ساخت، ہڈیاں، عضلات، رگیں، یہاں تک کہ بھیجے کی گرہیں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ میرے والدین نے اس تحفے کو میری عمر کے بچے کے لیے نامناسب سمجھ کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ پھر وہ مجسمے کہیں غائب ہو گئے۔ میں نے دوبارہ انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ اب صرف ان کی یاد باقی ہے، جیسے اس دور دراز زمانے کی میرے پاس اب صرف یادیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی　ستیہ جیت رے　اسد محمد خاں　محمد خالد اختر
ڈونلڈ بارتھیم　ولیم سیرویاں　افضال احمد سید　ذی شان ساحل
نسرین انجم بھٹی　ثروت مسعود　فروغ فرخ زاد　بابامقدم

سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ　لیو تالستائی　کیم مونزو
مظفر علی سید　فہمیدہ ریاض　عذرا عباس
احمد فواد　محمد خالد اختر　اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰

اتالو کلوینو　امین مالوف　محمد عمر میمن　محمد سلیم الرحمٰن
جیک لنڈن　محمد انور خالد　زیبا الیاس　محمد خالد اختر
تادیوش روزےوچ　زبگنیو ہربرٹ　وسلاوا شمبورسکا　الیگزانڈر وات

گرما ۱۹۹۰

وجے دان دیتھا　انور خاں　حسن منظر　محمد سلیم الرحمٰن
شمس الرحمٰن　شمس الحق　فہمیدہ ریاض

خزاں ۱۹۹۰

منوچہر خسروشاہی　بابا مقدم　جمال میرصادقی　ثروت حسین
ذی شان ساحل　اوکتاویو پاز　یہودا امیحائی　جولین بارنز
فاروق خالد　محمد خالد اختر　علی امام نقوی　خورخے لوئس بورخیس

سرما ۱۹۹۱

افرہام یہوشوا　صلاح الدین محمود　فہمیدہ ریاض　ثروت مسعود
ہانس رتسوس　انطون شماس　اسما راجا　ولاس سارنگ

بہار ۱۹۹۱

خصوصی شمارہ : گابریئل گارسیا مارکیز

آج

سالانہ خریداری

اندرونِ ملک
چار شماروں کی قیمت ۱۰۰۰ روپے

آج کی کتابیں
بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی

بیرونِ ملک

امریکا اور کینیڈا کے لیے
چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۲۰۰ امریکی ڈالر

بھیجنے کا پتا :

Prof. Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street
Madison, Wisconsin 53705
U.S.A.

انگلینڈ اور باقی ممالک کے لیے
چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۱۵۰ پاؤنڈ

بھیجنے کا پتا :

Ms. Shabana Mahmud
52, Queen's Road
Wimbledon
London SW19 8LR
England.

Scanned with CamScanner

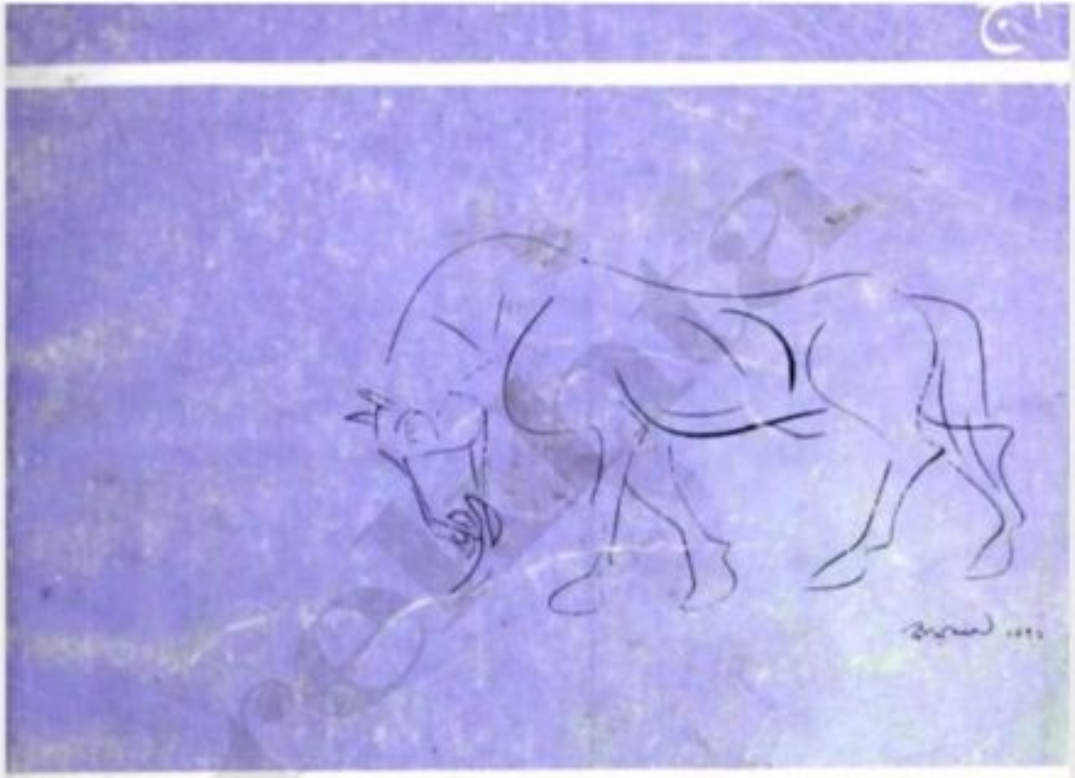

آج کی کتابیں
بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ناؤ شپ کراچی ۳۶

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

کلاسیک
شاہراہِ قائداعظم لاہور

ھدیہ تشکر

عزّت مآب وزیراعظم
اسلامک ریپبلک آف پاکستان

میاں محمد نواز شریف

کی خدمت میں ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں
کہ انھوں نے ملک میں مالیاتی جمہوریت کے اجرا کا
جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور

الائیڈ بینک آف پاکستان لمیٹڈ

کی ملکیت اور نظم و نسق اہل ترین افراد یعنی بینک ملازمین
کے حوالے کر دیا
ہم عہد کرتے ہیں کہ بینک کا کام کاج چلانے میں اپنی پوری محنت اور
اہلیت صرف کریں گے تاکہ وزیراعظم کا فیصلہ درست ثابت ہو

ملازمین و کارکنان الائیڈ بینک آف پاکستان لمیٹڈ

الائیڈ زمینجمنٹ گروپ

PID - Islamabad